# اسلام کی تہذیبی قدریں

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ


| | | |
|---|---|---|
| نام | : | **قيم الاسلام الحضارية ، نحو انسانيه جديدة** |
| | | اسلام کی تہذیبی قدریں۔نئی انسان پروری کے خدوخال |
| مصنف | : | ڈاکٹر محمد عبدالفتاح الخطیب |
| ترجمہ | : | ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی |
| ناشر | : | اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا |
| سنہ اشاعت | : | ۲۰۱۳ |

# فہرست مضامین


| عنوان | صفحہ نمبر |
|---|---|
| پیش لفظ از استاذ عمر عبید حسنہ | ۴ |
| مقدمہ از مصنف | ۱۱ |
| تعارف موضوع: اسلام میں تہذیبی قدریں: | ۱۷ |
| فصل اول: خلافتِ ارضی ومعیتِ الٰہیہ کا حصول | ۳۱ |
| فصل ثانی: تزکیہ اور انسانی شخصیت کی تعمیر | ۵۰ |
| فصل سوم: صحیح طرز عمل اور زمین کی ایمانی تعمیر | ۹۵ |
| اسلامی تصور میں تعمیر ارضی کے ابعاد | ۱۰۹ |
| اول: بُعد ایمانی اور کائنات میں تہذیبی کارنامے | // |
| دوم: مقصدی بُعد | ۱۱۳ |
| سوم: اخلاقی بعد | ۱۱۹ |
| چہارم: سنن الٰہیہ والا بعد | ۱۷۲ |
| خاتمہ | ۱۹۷ |


☆☆☆

# پیش لفظ

عمرعبید حسنہ

سب تعریفیں اس خدا کی ہیں جس نے وحی کی معرفت کو سلامتی کی راہ بنایا۔اسی کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالنے کا وسیلہ بنایا،جیسا کہ فرمایا: یہدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ'' جس سے خدا اپنی رضا پر چلنے والوں کونجات کے راستے دکھاتا ہے اور اپنے حکم سے اندھیرے میں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا اوران کو سیدھے رستہ پر چلاتا ہے(المائدہ:٦١)۔

اوردرودوسلام ہو اس ذات پر جو گمراہی سے بچانے والی ہے۔جس نے وحی کے ذریعہ ہمارے بوجھ کو اٹھادیا اور ہمارے اوپر پڑی بیڑیاں ختم کردیں۔حالانکہ ہم اس سے پہلے نہ کتاب الٰہی کو جانتے تھے نہ ایمان کو۔اورسلام ہو اس ذات پر جس نے مذہب کے متعلق نقطۂ نظر کو درست کیا۔وحی الٰہی کو کاہنوں اور مذہبی پروہتوں کے کھلواڑ سے بچایا۔جوذات گرامی وہ دین لے کرآئی جو سیدھا اورآسان ہے اورجس نے وسطیت واعتدال کے اصول دیے۔دین کو غلو،تشدد،تعصب اورتنگی سے بچایا اورامت وسط کی تشکیل کی۔اورہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ نے پیغام پہنچادیا۔امانت ادا کردی تاکہ شہادت حق کی حامل امت زمین میں وحی الٰہی کو پہنچائے اورلوگوں پراس کی گواہی دے۔ اوراللہ تعالی کے اس فرمان کو پورا کرے۔**وکذالک جعلناکم امة وسطا** :اوراسی طرح ہم نے تم کوامت معتدل بنایا ہے،تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنواور پیغمبرﷺ تم پر گواہ بنیں (البقرہ: 143) اور **لیکون الرسول شھیداعلیکم** تاکہ پیغمبرتمہارے بارے میں شاہد ہوں اورتم لوگوں کے مقابلہ

میں شاہد (الحج: ۷۸) اوراسی سے اس امت میں تہذیبی انقلاب آیا۔اوروہ کتاب ومیزان کی حامل بنی جس سے اس کا معیارقائم ہوااوراسے سیدھاراستہ ملااوراس کوانسانوں کی اصلاح کا ذمہ داربنادیا گیا۔

یہ کتاب ''الامۃ'' سیریز کی ۱۳۹ویں کڑی ہے۔جس کا نام'' اسلام کی تہذیبی قدریں ہے۔ یہ سیریز حکومت قطر کی وزارت اوقاف اور اسلامی امورکا ادارہ ،ادارۃ البحوث والدراسات الاسلامیۃ (ادارہ برائے اسلامی مطالعات ) شائع کرتا آرہا ہے۔ جو برابراس کے لیے کوشاں ہے کہ دین کی اصلاح وتجدید ہواوردینداری میں درآئی غلطیوں کی درستگی کرے،اس کی نشاندہی کرے کہ پانی کہاں مر رہاہے اورکوتاہی کہاں ہورہی ہے۔شعور بیدار کرے،حرکت وعمل کا احیاء کرے اوروحی کے اس علم کوانسانی زندگی میں جاری کرے جس سے انسان کووہ قطب نمااورگائیڈمل جائے جوانسانی زندگی کے ساتھ انسان کے سلوک کوٹھیک کردے۔اورجوعقل کومہمیز کرے کہ وہ وحی کی روشنی میں اورمیسر امکانات اورحالات کی روشنی میں اجتہادکرے اورتعمیری پروگراموں اوراسکیموں کے وضع کرنے کا فرض انجام دے۔

اورکتاب وسنت میں وحی نے جو بلندقدریں دی ہیں ان کوانسانوں کی زندگی میں اتارنے اوران سےان کی زندگیوں کو بنانے اورسنوارنے کا کام کرے اورعقل کوتجزیہ پرابھارے۔دین داری کی مروجہ شکلوں پرنظرثانی کرتارہے مذہبی قدروں کا تحفظ کرے،برائیوں کی جڑکاٹے،پس ماندگی دورکرنے کے لیےتجاویز دے،اوراس کے اسباب وعلل کا مطالعہ کرے۔جوتنزل کے غار سے نکلنے اوردوبارہ عروج پانے کےنشانات راہ متعین کرے۔تمام انسانی تجربوں سےاستفادہ کرنے اورعبرت پکڑنے اوراحیاء کےسوال کے جواب دینے کی کوشش کرے اوراس کی کوشش کرے کہ تہذیبی وتمدنی تعطل ختم ہو،اسلامی قدروں کا احیاء ہو،ان کو دوبارہ متحرک کیاجائے تاکہ یہ قدریں معاشرہ کی ترقی ، افرادکےتزکیہ اوراداروں کے بنانے میں اپنامطلوبہ کرداراداکرسکیں۔جس سے عالم اسلام انسانوں کو دینے اوران کے لیے رحمت بننے کے لیے نبوی کردارکودوبارہ اداکرنے کے لائق بن سکے۔ہم یہ کہ

سکتے ہیں کہ مسلم دنیا کے منتخب لوگوں کا متوقع تہذیبی تخلیق سے عاجز رہ جانا اور آلات ووسائل کو ترقی دینے سے درماندہ ہوجانا ایک ایسی چیز ہے جو ہماری زندگیوں میں مسلسل موجود ہے۔حالانکہ یہ مطلوبہ تخلیقیت ہی امت کو کتاب وسنت کی بیان کردہ قدروں سے جوڑ سکتی تھی ۔اسی سے تہذیبی احتیاج کا علاج ہوتا۔اجتہاد کے موقوف ہونے ،نئی سوچ اور ایجاد سے خوف اور ماضی میں دبکنے جیسی چیزوں سے نجات ملتی ۔کیونکہ اِن چیزوں کی وجہ سے ہی فطری نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ''دوسروں'' کی قدروں،ان کے فلسفہ اوران کے علمی طریقوں پر مسلمان مرمٹنے لگے ۔حالانکہ غیر اپنی چیزیں دینے اوران سے فائدہ اٹھانے دینے پر ہی اکتفاء نہیں کرتے بلکہ ساتھ ہی اپنے افکار،اقدار وکلچر کی اشاعت پر بھی پورا زور لگاتے ہیں۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی تیار شدہ مادی اشیاء سے ہمارے بازار اٹے پڑے ہیں جن کے ساتھ ان کا کلچر بھی ہمارے گھروں میں چلا آتا ہے۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ نااہل، بے صلاحیت اور شور مچانے والے لوگ ہمارے منبر ومحراب پر قابض اور سماج کے اندر مؤثر مقامات پر فائز ہیں۔حالانکہ یہ انہی کی ذمہ داری تھی کہ امت کا ہاتھ پکڑ کر اسے تنزل سے نکالتے اوراسے آگے بڑھانے کے پروگرام اور لائحہ عمل بناتے ۔چونکہ ایسا نہیں ہوا لہٰذا مسلم معاشرہ پس ماندہ بن کر رہ گیا۔ہم ان کی نیتوں پر شک نہیں کرتے مگر یہ تو حقیقت ہے کہ اکثر حالات میں وہ بے بسی اور پس ماندگی کا سبب بن رہے ہیں۔حالانکہ وہ ہر چیز کو جاننے کے وہم میں مبتلاء ہیں ۔اب ہمیں نہیں معلوم کہ ان کے نام نہاد تفقہ، بلند ہمتی اور عبقریت کے باوجود امت پس ماندہ کیوں ہے ۔اس کا تہذیبی پچھڑاپن رکتا کیوں نہیں؟ دوسری طرف وہ لوگ بھی ان سے کم خطرناک نہیں جنہوں نے اپنی تہذیبی قدریں چھوڑ دی ہیں، اپنے تاریخی تجربہ کو خیر باد کہہ دیا اوراپنی قدروں کے ذریعہ تخلیق اور تجدید سے عاجز رہ گئے ۔دوسروں کی تقلید شروع کردی ،ان کی ہر چیز کو مفید ومضر کی تمیز کیے بنا قبول کرلیا۔ یہ بھی نہیں دیکھا کہ ان کی اپنی علمی ،سائنسی وسماجی قدروں سے غیروں کی چیزیں ہم آہنگ بھی ہیں یا نہیں ۔اگر وہ مفید ومضر کے مابین تمیز کرتے ، یہ جانتے کہ کیا لینا ہے اور کیا نہیں

لینااور جاننے نہ جاننے کے درمیان فرق کو سمجھتے ہوتے تو دوسروں کی تہذیب کے شکار نہ بنتے۔ جس نے کہ ہماری چیزوں ، ہماری زندگی کے وسائل اور طریقوں میں زبردست تبدیلی پیدا کردی ۔ جس نے ہماری عقلوں کو کند، ہماری فکر کو اپاہج اور پستی سے اٹھنے کی کوششوں کو اکارت کردیا۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ محض سوچ بچار کرنے ،امید کرنے ،خواب دیکھنے ، کچھ نیا کرنے اور دوسروں سے عقل وحکمت کے ساتھ فائدہ اٹھانے سے بھی ہمارے ذہن کو ماؤف کرڈالا ہے۔

اسی لیے ہماری رائے یہ ہے کہ جو لوگ ماضی کا رخ کرتے اور اپنے آپ کو اسی کا اسیر بنائے رہتے ہیں مگر اس سے عبرت نہیں پکڑتے ،وہ اپنی سوسائٹی کے لیے کوئی تہذیبی تبدیلی نہیں لا سکتے ہیں۔ انہوں نے بیداری کا خواب تو دکھایا مگر اپنی تہذیبی قدروں کے ذریعہ کسی تجدید وتخلیق سے عاجز رہ گئے۔ حالانکہ انہیں قدروں کے التزام کا ان کو دعوی ہے، انہی کو آگے بڑھانے کا ادعا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ ہیں جنہوں نے ''غیر'' کی جانب رخ کیا اور غیر کے ان تہذیبی سانچوں میں اپنے آپ کو ڈھال دیا، جو غیر کی تاریخ اور اصول سے پھوٹتے ہیں۔ اور اس طرح انہوں نے اپنے ماضی وحال کو غیروں کے تہذیبی اصولوں پر تعمیر کرنے کی کوشش کی مگر یہ بھی پوری طرح ناکام رہے اور اپنی پس ماندگی کو ذرا بھی دور نہیں کر سکے۔

لہٰذا یہ مطلوب اب بھی باقی ہے کہ ایسے منتخب رجال کار پیدا ہوں جو اپنے تاریخی وتہذیبی تجربوں اور قدروں کا احیاء کرسکیں جو معیار و میزان کے مالک ہوں۔ اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کی چیزوں سے فائدہ اٹھانے اور علمی وثقافتی تبادلہ پر قادر ہوں۔ کیونکہ جو خود پس ماندہ ہووہ انسان دوسروں کو فائدہ دینے سے درماندہ رہ جاتا ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ تو بس ایجنٹ بن کر رہ جاتا ہے۔ جو دوسروں کے افکار کی مارکیٹنگ کرتا ہے۔ ایسا طالب علم نہیں بنتا جو اپنے سے زیادہ جاننے والے سے استفادہ کررہا ہو۔ ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم ''غیر'' کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں ،اس سے روابط کاٹ دینے ،اس سے دور رہنے اور فائدہ نہ اٹھانے کا داعی ہیں۔ نہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اپنی تہذیبی

قدروں کو مسخ کرکے غیر کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔نہیں،ہماری رائے تو یہ ہے کہ ''غیر''موجود ہے اور قیامت تک رہے گا۔اورایک دوسرے کے ساتھ معاملہ کرنے کے سوا چارہ نہیں کہ باہمی نشونما کا عمل جس طرح اپنے داخل میں یا خود سے گفتگو کے دائرہ میں حاصل ہوگا،اسی سے کہیں زیادہ اچھے اورمؤثر انداز میں'' دوسرے'' کے ساتھ حاصل ہوگا۔یہ' دوسرا' ایجابی معنی میں چیلنج پیدا کرسکتا ہے ساتھ ہی تہذیبی طور پر مہمیز بھی کرسکتا ہے۔،اس محرک سے شیرازہ بندی،توانائیوں کی یکجائی ،تاثیر کی تیزی اور خفتہ قوتوں کو حرکت میں لانے کے مقاصد حاصل ہوسکیں گے ۔وہ تہذیبی مقابلہ ومسابقت کا داعیہ پیدا کرے گا۔خاص طور پر اس وقت جب ہم یہ ادراک کرلیں کہ ہم میں سے کوئی بھی دوسرے کا متبادل نہیں ہے۔ ہر انسان کی اپنی ایک دنیا ہے اوراسے پسند وناپسند کی جو آزادی ملی ہے،یہی تو اسے غیر انسان سے افضل بناتی ہے۔جس کی بنیاد قرآن نے یہ کہ کر قائم کی ہے: لا اکراہ فی الدین: دین کے معاملہ میں کوئی زور وزیادتی نہیں (البقرۃ:٦٥٢)۔

مطلب یہ ہے کہ باہمی معاملات کو انسانی بنیادوں پر اور مشترکہ قدروں پر انجام دینا چاہیے، جس سے افہام وتفہیم کا دائرہ بڑھے ،تعارف باہمی ،اورمل جل کر رہنے پر زور دیا جائے ۔ اور یہ اعتقاد رکھنا چاہیے کہ یہی دین کا مقصد ہے یہی مذہب کا مقصود ہے۔اختلاف وتنوع اور تہذیبی مقابلہ بھی آفاق والنفس کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔اسی سے نمو پذیری حاصل ہوگی ،کمال وارتقاء ملے گا اوران طریقوں سے انسانوں میں باہم اختلاط،ہم آہنگی اور توالد وتوسع ہوتا ہے۔فرمایا: ولا یزالون مختلفین اِلامن رحم ربک ولذلک خلقھم: اوراگر تمہارا پروردگار چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی جماعت کردیتا لیکن وہ ہمیشہ اختلاف کرتے ہی رہیں گے،مگر جن پر تمہارا پروردگار رحم کرے (ہود:٨١١۔٩١١) جب ہم ان حیاتیاتی وکائناتی حقائق پر غور وفکر کریں گے تو ہم کو کاروان زندگی کی حقیقت معلوم ہوگی۔وہ قبلہ نما جس سے اِس سب میں سمت کا پتہ چلتا ہے وہ وحی کی معرفت ہے۔وہی زندگی کی دلیل اوراس کے ساتھ معاملہ کرنے کی کیفیت کو بتاتی ہے۔وحی کی معرفت جن قدروں کے مجموعہ کی تعلیم

دیتی ہے وہ تہذیبی عقل کے عوامل ومحرکات کی تشکیل کرتی ہیں۔جیسا کہ وہ انسانی عقل کے میزان اورمعیار کا تجزیہ واصلاح بھی کرتی ہیں۔یہ چیز اب بھی باقی ہے کہ وحی کی معرفت اوراس کے ابعاد کا ادراک کیا جائے اورزندگی کی حرکت اورزندگی کے قافلہ کومنضبط کرنے میں قدروں کے کردار کو جانا جائے ۔میرے نزدیک تجدیدوترقی عقیدہ توحید کے ابعاد کے ادراک سے شروع ہوگی ۔اوراس سے ہوگی کہ نفس میں اس کے معانی کی تجدید ہواوران کوموروثی سامان کے دائرہ سے نکال کرغوروفکر، تدبر، اختیار، اعتقاد اورقبول کا محل بنالیا جائے ۔موروثی سامان سے ہماری مراد تمام رواجات اورعادتیں ہیں۔یہیں سے یہ ضروری ہوا کہ نفسِ انسانی اورسماج میں تبدیلی کے تمام ابعاد کا ادراک کیاجائے اورآئندہ نسلوں کو یونہی موروثی مسلمان بنانے کی بجائے ان کے لیے ثقافتی، تعلیمی ،ابلاغی ،تعلیمی اورتربیتی پروگرام اورنصاب بنائے جائیں۔اِس سے یہ ہوگا کہ نفس اورسماج میں عقیدہ کے معانی کی تجدید ہواورقافلۂ حیات میں دین کی قدروں سے اس کی حرکیت کومنضبط کیا جاسکے۔

بلاشبہ اصلاح وتجدید کے علمبرداروں نے جومخلصانہ جدوجہدکی وہ زیادہ تر دین کو بدعات وخرافات سے پاک کرنے اورعقیدہ کوغلط آمیزش سے صاف کرنے پرمرکوزتھی ۔یقیناً تجدیدواصلاح کے کاموں میں اِس کا مقام بنیادی ہے ۔لیکن مشکل یہ ہوئی کہ یہ کوششیں اصلاح عقیدہ تک ہی محدودہوکررہ گئیں،اوراصلاح کا جو پوراپروگرام ہے وہ ادھورارہ گیا۔نفس میں عقیدہ کے معانی کی تجدیداورزندگی میں اس کوفعال بنانے کا اورایک بہتر زندگی کی تشکیل میں عقیدہ کے کردار کے احیاء کا پروگرام روبہ عمل نہیں آسکا۔یقیناً عقیدہ کی تطہیرکی ایک بڑی دینی ،ثقافتی ،تہذیبی ،سیاسی اوراجتماعی اہمیت ہے۔اس کے بغیرفریب، دھوکہ اوراوہام سے خالی اورصحیح دینداری حاصل نہیں ہوسکتی ،یعنی صفاءِ عقیدہ نئی تہذیبی تشکیل کی اساس ہے ۔لیکن اس کے بعدنفس انسانی اورسوسائٹی میں اس کے اثرات کیسے برپاکیے جائیں اورزندگی میں حقیقی تغیروتبدیلی کیسے آئے یہی حیات انسانی کا مشکل مرحلہ ہے۔اسی چیز کوابن خلدون حقیقتِ توحید پرروشنی ڈالتے ہوئے یوں بیان کرتے ہیں کہ’’ توحید میں

معتبر فقط ایمان نہیں کہ ایمان تو تصدیق حکمی کا نام ہے، جو دل کا معاملہ ہے۔کمال ایمان تو تب حاصل ہوگا جب نفس انسانی میں ایمانی قدریں فعال ہوں۔یعنی زندگی ایمان کے تقاضوں سے تحریک پائے۔ آدمی زمین کی خلافت کا مستحق بنے، نفس کا تزکیہ ہو، تہذیبی عمارت کی تعمیر ہو اور مخلوق پر شہادت کا فرض پورا کیا جائے۔

آپ کے ہاتھوں میں جو کتاب ہے وہ اسلام کی تہذیبی قدروں کو سامنے لانے اور مسلمانو ں کے طرز عمل کا ان کی روشنی میں جائزہ لینے کی کاوش ہے۔جس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اِن تہذیبی قدروں کو نئے سِرے سے پڑھنے اور معاشرہ میں ان کو دوبارہ رائج کرنے اور فعال بنانے کا کام کیا جائے۔اِس میں یہ بھی بیان کیا جائے گا کہ ہماری زوال پذیر صورت حال میں یہ قدریں کس طرح انقلاب وتبدیلی لاسکتی ہیں۔یہ بتایا جائے گا کہ غیروں سے مستعار قدریں امت کی صورتِ حال کو بدلنے میں اور اسے تنزل سے نکالنے میں ناکام رہی ہیں۔اگرچہ وہ دوسروں کی چیزوں کو استعمال کر کے بظاہر تہذیبی مظاہر کا دکھاوا کرے۔اور یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کہ تہذیبی کامیابی اور ثقافتی تبدیلی اُس وقت تک نہیں آسکتی جب تک امت اپنے عقیدہ پر مبنی تہذیبی قدروں سے کام لیکر ایجاد واختراع کا کارنامہ انجام نہیں دیتی اور یہ کہ یہ قدریں اگر ہم ان کی تاثیر کو سمجھ لیں تو ایجاد واختراع پر قادر ہیں، اتنا ہی نہیں بلکہ ایسا اسلامی طرز نو ایجاد کرسکتی ہیں جو صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر ایک انسانی تہذیب کا نیا نمونہ پیش کرسکتی ہے۔

اس طرح یہ کتاب ایک نظریہ اور اسکیم پیش کرتی ہے جس سے انسانوں کی زندگی میں تہذیبی قدروں کو فعال بنایا جائے۔وہ ہمیں تکلیف دہ حال سے نکالنے کا راستہ بتاتی ہے۔اسی طرح یہ وہ کھڑکی کھول سکتی ہے جس سے روشنی اندر آئے اور امت خود ایجادِ نو کرسکے، اپنے کلچر کی حفاظت کرے اور دنیا کے سامنے ایک معتبر انسانی تہذیبی ماڈل پیش کرے۔جس میں ڈائلاگ ہوگا اور تبادلہ ٔ فکر ہوگا اور وہ اپنا تہذیبی وجود منوا سکے گی۔

# مقدمہ

**الحمدلله رب العالمين وصلاة الله وسلامه على رسوله الامين وعلى صحابته وآله اجمعين، امابعد:**

یہ بات شک وشبہ سے بالا ہے کہ امت مسلمہ ایک لمبے عرصہ سے تہذیبی خلا میں جی رہی ہے۔جس کے سبب اس نے 'غیر' کی تہذیب ،ان کے تصورات ،ان کے علمی رجحانات اوران کے طورطریقے اختیارکرلیے ہیں۔ساتھ ہی وہ اسلام کی قدروں سے ،اس کے تصورات وافکار سے ناآشنائی ،ناواقفیت یاتجاہل عارفانہ برتتی آرہی ہے۔جوتصورات وافکارحال اور مستقبل میں اس کے عمل کو منضبط کرسکتے تھے۔نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری تہذیبی زندگی میں''قدامت''اور'جدت' کے مابین جوجدلیت قائم ہے،اس کے باعث امت سے یہ مطالبہ کیاجاتا ہے کہ وہ اپنی قدروں اوراپنے افکارو تصورات سے دست بردارہوجائے اوردوسروں کی قدروں اورافکارسے چمٹ جائے۔تبھی اس کوترقی وتجدیدحاصل ہوگی!!لیکن جیسے جیسے مختلف محاذوں پرامت کوناکامی ملی اس سے نفسیاتی مایوسی اور بڑھی۔ پھرامت مسلمہ کی بیداری ،اوراسلامی تحریکوں کے ظہورکا واقعہ ہوا۔مغرب کے چہرہ سے مکرو ریا کے پردے ہٹے اورمغربی نظریات ناکامی سے دوچارہوئے اور''جدیدیت''کوزوال ہوا،جوخالص مادی نظریہ تھا اور انسانی قدروں سے خالی تھا جس کا نیشنلزم ہرغیب کاانکاری تھا،جدیدیت نے انسان اورکائنات کے ساتھ تعامل میں جس انتہاپسندی کا مظاہرہ کیااس سے بہت سے بحران پیداہوگئے۔ اوران بحرانوں نے جدیدیت کے اندرسے ہی اس سوال کوجنم دیا کہ کیاکوئی دوسرااقدار پر مبنی نظام فکرممکن ہے۔جوموجودہ جدیدیت،اس کے بحرانوں اورانسانوں اوراشیاء کے ساتھ معاملہ کرنے میں

زندگی کوتحریک دے سکے۔جس کی ابتداء انسان کے اپنے ماحول سے ہوجس میں درخت ہیں اور پھل پھول ہیں اوراس سے آگے بڑھ کر کائنات اور فضائے بسیط جو سمندروں ،افلاک اور قدرتی اشیاء کی حامل ہے ،کومحیط ہوجائے۔اس وقت سے یہ سوال امت مسلمہ کی زندگی میں پیش آیا کہ یہ نیا نظام فکر ہماری قدروں اور ہماری سائنسی نظاموں کے مطابق زندگی میں حرارت کیسے پیدا کرے گا جس میں آغاز ہمارے تہذیبی افکار سے ہو؟ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ ہم زندگی کو اللہ سبحانہ وتعالی اوراس کے احکامات کے مطابق کس طرح چلا سکتے ہیں؟

اس سوال نے بہت سے مفکرین اور محققین وعلماء کو اپنی طرف متوجہ کیا چنانچہ گزشتہ چند دہائیوں کے دوران مختلف انداز واسلوب میں متعدد تحقیقات منظر عام پر آئیں جن میں ''اسلام کی اقدار'' اوراس کے 'علمی نظریات' کے بارے میں متضاد رایوں کا اظہار کیا گیا، وہ نظریات جن سے 'زندگی کو تحریک' دی جاسکے۔ یہ رائیں امت مسلمہ کے حال، اس کی ضرورتوں اور وہ جو' تہذیبی بے مائگی ' کی زندگی جی رہی ہے اوراُس سے جو تنقیدیں اور سوال پیدا ہوتے ہیں ان کے بارے میں ہیں۔سوال اس بارے میں بھی پیدا ہوئے کہ یہ'' قدریں'' کون سے' معیارات' اور' فریم ورک' پیش کرسکتی ہیں جن سے ہماری امت کی مشکلات اوراس کے ساتھ پوری انسانیت کے مسائل اور حاضر وموجود نیز مستقبل کی تبدیلیوں سے نبرد آزمائی ممکن ہو سکے۔تاہم ان ساری تحقیقات میں ابھی نظر ثانی اور مزید پختگی اور اضافہ کی ضرورت ہے۔تاکہ امت مسلمہ کے پاس اچھا خاصا نظریاتی ذخیرہ ہوجائے جو تصورات وافکار اور قدروں'' کے احیاء جدید میں مددگار ہو اور وہ ان کے ذریعہ اسلامی زندگی کو تحریک دے سکے اور زندگی کے علمی میدانوں میں ان'' آلات ووسائل کو فعال بنا سکے۔

اسی سیاق میں یہ مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔لیکن اِس کا مقصد صرف یہ بتانا نہیں کہ اسلام اپنے علمی نظام میں مبنی براقدار نمونہ پیش کرسکتا ہے ،جس کا ایک مخصوص مزاج ہے ،وہ زندگی کو حرکت دیتا ہے۔اس کا ہدف'' وجود کو ترقی'' دینا ہے۔اس کی غایت انسان کو خدا تعالی تک پہنچانا ہے۔جس کی

وہ عبادت کرے گا، جس کو سمجھے گا اور اس کے اخلاق اختیار کرے گا۔ جیسا کہ اسلام کو کمال تب حاصل ہوتا ہے جب وہ انسان کو دوسرے انسانوں سے جوڑتا ہے جو باہمی تعارف کے علاوہ ایک دوسرے کے ساتھ رحم اور احسان کریں۔ جیسا کہ کائنات کی اشیاء کے ساتھ معاملہ کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ انسان ان سے نفع اٹھائے، نفع پہنچائے اور اِن کا امین بنے۔ اور یہ کہ امت کو جو ''تہذیبی بے مایگی'' اور بے چارگی درپیش ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ امت اس نمونہ سے دست بردار ہوگئی اور اُس کو فعال بنانے سے عاجز رہ گئی۔ وہ ایسے وسائل کو ترقی نہیں دے سکی جن سے اپنے حال کو بدل سکتی۔ تو یہ تحقیق بس اِسی کو ثابت نہیں کرے گی بلکہ تجزیہ، تقابل، اور تہذیبی افکار و نظریات کی تشکیل کے ذریعہ یہ تحقیق یہ بھی ثابت کرے گی کہ ہم ''زندگی کو حرکت میں لانے والے'' ایسے نمونہ کے مالک ہیں جو اقدار پر مبنی ہے اور ایک نئے ڈسکورس کی ترجمانی کرتا ہے جس کی تمام انسانیت کو ضرورت ہے۔ جب ہم اس نمونہ کو زندگی میں فعال کرلیں گے اور پھر اس کو اچھے انداز میں پیش کریں گے اور اس کا بہتر تعارف کرائیں گے تو یقیناً اسلام کے پاس وہ اقداری نظام ہوگا جو کہ نہ صرف اسی لیے ضروری ہے کہ دنیا کے اسٹیج پر ہماری تہذیبی موجودگی کو ثابت کرے بلکہ اس لیے بھی کہ وہ نئے انسانی طرز عمل کی ضرورت بھی ہے گرچہ وہ طرز عمل غیر مغربی تہذیبی جڑیں رکھتا ہو (اس کا مقصد الٹی مرکزیت کی از سر نو تخلیق کے لیے اسلامی مرکزیت کو مغربی مرکزیت کی جگہ اتارنا نہیں جس کا مطالبہ نئی جدیدیت کرتی ہے، جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں، کیونکہ اسلام کی جدیدیت میں عدل و احسان، تعارف، آپسی رحم، اور مجاہدہ جیسی قدریں ہیں جو اس کو ایسی مرکزیت سے روکتی ہیں جیسا کہ فصل: التزکیہ اور انسانی شخصیت کو پائدار بنانا' میں آئے گا)۔

اس تحقیق کا آغاز اس مفروضہ سے ہوتا ہے کہ: جب ہم یہ فرض کرلیں کہ جدیدیت وہ ''پروگرام'' ہے جس میں کائنات اور انسان کے نظریہ اور عالم اشیاء کے ساتھ اس کے تعامل کے ذریعہ سے زندگی کو تحریک ملتی ہے، اور یہ کہ اگر دنیا میں غیر اسلامی ''جدیدیت'' ہے تو اسلامی جدیدیت کا ہونا بھی ضروری ہے کہ زندگی کو تحریک دینے کے اس کے اپنے نظریات و افکار ہیں جو اسلام کے انسان، کائنات اور زندگی کے مخصوص نقطۂ نظر سے پیدا ہوگی۔ بلکہ ہمارا نقطہ نظر تو یہ ہے کہ ''زندگی

کومتحرک کرنے میں' اس ''اسلامی جدیدیت'' کا وجود اور اس کا پوری انسانیت کے لیے ہونا ایک ایسی چیز ہے جو اسلام کی رو سے لازمی اور اس کے آخری دین ہونے کی وجہ سے اُس سے مربوط ہے۔ چنانچہ وہ محض اسلامی وجود کو ترقی دینے کا پروگرام نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے اور تمام زمانوں کے لیے ہے (اسلامی عقیدہ میں یہ طے شدہ ہے کہ دین اسلام کے زمانے کی طرح کوئی دوسرا زمانہ نہیں کیونکہ وہ آخری دین ہے۔ لہٰذا وہ بعثت نبوی یا اسلام کے عروج کے زمانے تک محدود نہیں، بلکہ اس کے بعد قیامت تک آنے والے زمانوں کو بھی محیط ہے۔ اس حقیقت کی تقریر اور اِس کے فلسفیانہ ابعاد کی تشریح کے لیے دیکھیے: طٰہٰ عبدالرحمٰن، الحق الاسلامی، الاختلاف الفکری، طبع اول، بیروت المرکز الاسلامی الثقافی العربی ۲۰۰۰ء ص۱۵ ومابعد)۔

یہ پروگرام مادہ وروح، عادت وساخت اور حال وماضی ہر لحاظ سے امت کے وجود کو ترقی دینے اور ''مدارج کمال'' کو پہنچانے کے لیے کام کرے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالی کے قول وکذلک جعلنا کم امۃ وسطا: اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا ہے، تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر ﷺ تم پر گواہ بنیں (البقرہ:143) کا مقتضا ہے۔ تو شہادت ایک ایسا تصور ہے جو امت کے امت مسلمہ ہونے اور اس کی قدروں اور ''زندگی کو حرکت دینے'' والے اس کے علمی نظام فکر کا تقاضا ہے کہ امت ہی وہ مرجع اور میزان بنے کہ جب جب بھی انسانیت اپنے ''معنی'' و''مقصد'' کو کھو دے اور اپنی ''منزل'' سے بھٹک جائے تو اس کی طرف وہ دیکھ سکے۔

اس مطالعہ میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ بعض ایسے تصورات کو استعمال کیا جائے جو میرے نزدیک زندگی کو متحرک کرنے میں ایک واضح اسلامی نقطۂ نگاہ کو تعبیر کرتے ہیں۔ جہاں ان تصورات کو پہلی بار استعمال کیا گیا ہے اور ان سے استدلال کیا گیا ہے۔ وہاں ان کی تعریف کر دی گئی ہے۔

یہ اصطلاحات درج ذیل ہیں، اعلی نمونہ ''استخلاف'' (خلیفہ بنانا) الخلافۃ الاقتدائیۃ، (تابع خلافت) زندہ کوشش ''تزکیہ'' زمین کی ایمانی تعمیر''، معیت الٰہی کا حصول، انسانی ذات کو مضبوط بنانا، تہذیبی جدوجہد، تہذیبی استقامت، تہذیبی بے مائیگی، کائناتی پسماندگی، ''حیات طیبہ'' کائناتی امانت'' کائناتی قیام'' سنت الٰہی کا عنصر اور مستقبل کی ضمانت''۔ اس مطالعہ کے عناصر منطقی ترتیب کے

ساتھ مربوط ہیں بایں طور کہ جن فرائض پر یہ مطالعہ مبنی ہے۔ان کی جانچ پڑتال کے رخ پر ہی وہ چلتی گئی ہے۔ پوری بحث میں میں نے ایک تسلسل قائم رکھا ہے،مقدمہ میں اس تحقیق کا تعارف کرایا ہے ۔تمہید میں مطالعہ کا عنوان بیان کیا گیا ہے۔ جو یوں ہے:

اسلام میں تہذیبی قدریں معنی ومفہوم : پھر پہلی فصل میں خلافت اورمعیت الٰہی کے حصول'' کا بیان ہے ۔جس کا محور خلافت اوراسلامی نقطہ نظر سے اس اصول کے نتائج یعنی زمین کی تعمیر،عبادتِ رب،لوگوں میں حق ،عدل،احسان اور بھلائی کا قیام' بیان کیا گیا ہے۔

دوسری فصل تزکیہ اورانسانی شخصیت کو پائدار بنانا ہے اِس کا مقصد یہ ہے کہ تزکیہ کے اصول کے ذریعہ اسلام انسان کوجواوپر اٹھاتا ہےاوراسے زمین کی خلافت دیتاہے اس میں اسلام کے طریقہ کارکو بیان کیا جائے ۔تزکیہ کی بنیاددوچیزوں پر ہے ایک ''نفس انسانی '' کی رعایت اور دوسری ''غیر کے حق کی رعایت'' اِن کے ذریعہ تزکیہ ایک اصل ومنفرداسلامی طریقہ بن جاتا ہے، جوانسانی شخصیت کا اثبات کرتااوراللہ کےاحکامات کے مطابق ہی زندگی میں اس کی حرکت کو منضبط کرتا ہے۔

جہاں تک تیسری فصل ''استقامت اورزمین کی ایمانی آبادکاری'' کی بات ہےتواس میں یہ بیان ہواہے کہ زمین کی آبادکاری ،مومن کا شیوہ ہے ۔کیونکہ اسلامی شریعت کا عمومی مقصدزمین کی اصلاح وتعمیر ہے۔اس کے اندرلوگوں کی معیشت کا سامان کرنااوراس پراقتدار بخشناہے۔جس کے لیے چارابعاد(Dimentions) کا استعمال کیاجاتا ہے۔'بعدایمانی '،' غایت والابُعد'،اخلاقی بُعد''اورالٰھی قوانین والابُعد ،ان چاروں ابعاد سےمتعددقدریں نکلتی ہیں جوانسان کوزندگی اورانسانوں کےساتھ معاملہ کرنا سکھاتی ہیں۔تہذیبی قیام'' کاحصول ہوتا ہے جوکہ اسلام کی نظر میں حرکتِ حیات کا مقصداساسی ہے۔اس کے بعدخاتمہ آتا ہے،جس کا عنوان ہے''اسلام میں تہذیبی قدریں'' اِس میں ان کے مطالعہ اورپھران کے نفاذکے مسئلہ سے بحث ہوتی ہے۔اس خاتمہ میں اسلام کی قدروں اورموجودہ صورت حال جس میں ان کوغلط پڑھا گیااورغلط طور پر برتا جارہاہے اس کا محاکمہ

ہے ۔اورمسلمان کی زندگی میں ان قدروں کوفعال بنانے کی اہمیت ،ان کی تطبیق ،تحفظ اورترقی کے ذریعہ ان کواعتبار دینے اوران قدروں کے نفاذ کے لیے ’’وسائل‘‘ کی ترقی ،جیسے مسائل زیر بحث آئیں گے ۔اِس کے علاوہ ہمارے عقیدہ ،فقہ اورقدروں کی بحث کی تجدید کی ضرورت ہے،اُس سے بھی بحث کی گئی ہے۔تو خلاصہ یہ ہے کہ یہ کتاب اسلام کی تہذیبی قدروں کے مطالعہ کا ایک پروگرام ہے۔میں نے اِس میں کوشش کی ہے کہ ان قدروں کی نظریہ سازی کروں،اوران کے ذریعہ سے تہذیبی تصورات کی تشکیل کروں،دوسرے اسکالروں اورتحقیق کاروں کوصلائے عام ہے کہ وہ اِس کارواں کو آگے بڑھائیں ۔زندگی کوحرکت دینے کے اسلامی نقطۂ نظر کو راسخ کریں ۔اس کو فعال بنانے کے وسائل ایجاد کریں اور یہ ایمان رکھیں کہ اجتہادِعلمی کی کوکھ سے ہی علم نافع پیدا ہوتا ہے اورعلم نافع ایک سنت ہے۔

☆☆☆

**تمہید:**

# اسلام میں تہذیبی قدریں اوران کامعنی ومفہوم

**اولا: قدروں کا مفہوم:** قِیم (قدریں) لغویوں کے مطابق قیمۃ کی جمع ہے۔جس کا مادہ قَوَمَ ہے۔تاج العروس میں آیا ہے: زیر کے ساتھ قیمۃ القِیم کا واحد ہے،جس کا مطلب ہے شئ کی قیمت ،تقویم (قیمت لگانا)،اسی سے ہے۔اصل میں واوٴ ہے جس کو''ی'' سے بدل دیا جاتا ہے۔کہا جاتا ہے مالہ قیمۃ یعنی وہ ثابت ودائم نہیں۔اوراستقام الامر :استوار ہوا،القَوام (سحاب کے وزن پر) کا معنی ہے عدل ،القِوام (زیر کے ساتھ) کا معنی ہے کسی معاملہ کی جڑ بنیاداوراصل ۔جو چیز بھی کسی پر قائم ہواوراس سے چمٹی ہوئی ہواُسے کہیں گے قائم علیہ۔عِنَب کے وزن پر قِیَم کا مطلب ہے استواری، **تقاوموہ فیمابینھم** کا معنی ہوگا لوگوں نے اس چیز کی قیمت لگائی۔جب کسی چیز کا طریقہ معتدل ہوتو کہیں گے استقام لوجھہ، اَمر قِیم کا مطلب ہے مستقیم ،خلق قِیم خلق حسن کے معنی میں ہے،دین قِیم ایسا دین جس میں کوئی کجی نہ ہو کتب قیمۃ صحیح کتابیں جو حق وباطل میں تمیز کرتی ہوں۔القیم سرداراورذمہ دار (ان معانی اوراِن جیسی دوسری چیزوں کے لیے دیکھیے: الامام الزبیدی،تاج العروس من جواھر القاموس متعدد اسکالروں کی تحقیق ۳۳/ ۶۰۳) اس طرح قیمت کا مادہ کئی معنوں میں آتا ہے۔جن میں غالب حصہ کسی چیز کی قدرو قیمت ،مقدار، درستگی ،اعتدال ،استواری ،کجی نہ ہونااورثبات تحکم وغیرہ ہے۔جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا: فاقم وجھک للدین حنیفا: توتم ایک طرف کے ہوکر دین (سیدھے رستہ) پر سیدھا منہ کیے چلے جاوٴاورخدا کی فطرت کوجس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اختیار کیے رکھوخدا کی بنائی ہوئی فطرت میں تغیروتبدل نہیں ہوسکتا یہی سیدھا دین ہےلیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (الروم:30)۔

تواِس آیت میں ذلک الدین القیم کا مفہوم ہے،ثابت جس میں تغیر نہ ہو،سیدھا جس میں کجی

نہ آئے ،اور جو زندگی کے امور کا مالک ہو، جیسا کہ حقیقتِ حال پر بھی اس کا کنٹرول ہو۔ کیونکہ وہ کسی زائل ہونے والی ہنگامی حالت میں کام نہیں کرتا جو حالات کے تابع ہو بلکہ ایسی حالت میں کام کرتا ہے جو انسانیت کی مصلحت میں ہے۔اور رہتی دنیا تک اس کے کام آئے۔اسی لیے اس سے انسانوں کی زندگی کا قیام ہوتا ہے اور ان کے احوال میں توازن قائم رہتا ہے (الراغب الاصفہانی، المفردات فی غریب القرآن تحقیق: محمد سعید الکیلانی (بیروت: دارالمعرفۃ ص ۴۱۷)۔

اسی لحاظ سے ''قیم'' ایک جامع تصور ہے جس میں بہت سے معانی ومفاہیم مضمر ہیں، جن سے یہ جواز حاصل ہوتا ہے کہ اُس کا اطلاق کسی بھی ''معیاری'' چیز پر کر دیا جائے جو ''ایک میزان'' ہو۔ جس کے تحت انسان سرگرم کار رہتا ہو اور تصرف کرتا ہو بایں طور کہ اُس کی یہ حرکت ثابت اور استوار ہو اور اس حرکت کا ایک وزن واعتبار ہو۔

**ثانیا: تہذیب کا مفہوم :** رہا حضارۃ (تہذیب ) کا مفہوم تو وہ عربی لغوی اساس میں ''حضر'' کے مادہ سے ماخوذ ہے۔اس مادہ کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کا تعلق کئی معنوں سے ہے۔ابن فارس نے ان سب کی ایک ہی اصل بتائی ہے جس کا مطلب ہے ''کسی شئی کا موجود ہونا 'اس کو لانا اور اس کا مشاہدہ (ابن فارس ،معجم مقاییس اللغۃ تحقیق عبدالسلام ہارون طبع دوم ،(بیروت،: دالجیل ۱۴۲۰ھ (۱۹۹۹) ۲،ص ۷۵ومابعد نیز دیکھیں تاج العروس ۱۱/ ۴۰) قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی اساسی لفظ حضر آیا ہے،اس کا مفہوم یہی ہے یعنی مشاہدہ ومکشوف کے معنی میں : مثال کے طور پر کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت: تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آجائے تو اگر وہ کچھ مال چھوڑ جانے والا ہو تو ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کر جائے۔خدا سے ڈرنے والوں پر یہ ایک حق ہے (البقرۃ: 180) اور اللہ کا قول : و اذا حضر القسمۃ اولی القربیٰ والیتٰمیٰ والمساکین: اور جب میراث کی تقسیم کے وقت (غیر وارث ) رشتہ دار اور یتیم اور محتاج آجائیں تو ان کو بھی اس میں سے کچھ دے دیا کرو۔اور شیریں کلامی سے پیش آیا کرو (النساء:۸) اور اللہ کا فرمان: جس دن ہر شخص اپنے اعمال کی نیکی کو موجود پالے گا اور ان کی برائی کو بھی (دیکھ لے گا ) تو آرزو کرے گا کہ

اے کاش اس میں اوراس برائی میں دور کی مسافت ہوجاتی اور خداتم کو اپنے (غضب) سے ڈراتا ہے اور خدااپنے بندوں پرنہایت مہربان ہے (آل عمران: ۳)۔

یہی اس فعل کے اصلی معنی ہیں چنانچہ کہتے ہیں حضر یحضر حضوراً وحضارۃ، حضور یہاں مشاہدہ کے معنی دیتا ہے جوغائب اورغیبت کا الٹا ہے، حاضر کا معنی ہے موجود جو بادی (بدویت، یعنی دیہات میں رہنے والا) اور غائب کا عکس ہے۔ حضارۃ کا مطلب ہوا حضر میں رہنااوراس میں اقامت پذیری، حضارۃ بداوۃ کے خلاف ہے کیونکہ حضارۃ والے لوگ شہروں میں آ گئے اور مکانوں میں آباد ہو گئے، جہاں ان کو قرار واطمنان ملا۔ اس اعتبار سے حضارۃ کا اطلاق زندگی میں اپنے وجود کو منوانے اور تمام ابعاد ومعانی کے ساتھ زندگی کو تحریک دینے کے معنی میں ہوتا ہے۔ جس میں شعور اور کوشش سب کا دخل ہے۔ اس میں حضارۃ کی تمام اصطلاحیں اور تصورات آجاتے ہیں جو انسان کے تہذیبی تصور اوراس کے کائنات اوراپنے گرد کی زندگی کے تصور سے پیدا ہوتے ہیں (باب کی اصل ''شھد' ہے جس میں حضوری کا معنی موجود ہے، ابن فارس کہتے ہیں: شین، ھا اور دال حضوری کے معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ اِس کا معنی عِلم واِعلام بھی ہوتا ہے، سب اسی اصل کے اندر آجاتے ہیں''۔ مقائیس اللغۃ ۳ / ۱۲۲) اس میں یہ بھی داخل ہے کہ نظریہ کے بعد انسان تہذیب کے تمام نظاموں وقیدوں کے ساتھ اپنے وجود کو ثابت

کرنے کی کوشش کرے اور پوری انسانیت کے لیے اُسے ماڈل اورنمونہ قراردے۔ دوسرے لفظوں میں تہذیب ہر اس حرکت وعمل کو کہیں گے جو زندگی کو اپنے سارے نظام وحدود کے ساتھ معیار کی طرف لے جائے۔ اسی طرح وہ معیار کو بھی حرکت میں لائے اور زندگی کے لیے اس کا التزام یقینی بنائے (اسی سیاق میں اسلامی مفکر مالک بن نبی کی اِس رائے کو سمجھا جاسکتا ہے کہ'' وجود'' اور'' حضور'' میں فرق کرنا چاہیے۔ ان کی رایے میں یہ ممکن ہے کہ قومیں وجود رکھتی ہوں، لیکن وہ اپنی ذات کی اسیر ہوں، دوسروں پر انہوں نے اپنے دروازے بند کرر کھے ہوں، وہ خود متاثر ہوجاتی ہوں دوسروں پر اثر نہ ڈالیں۔ لیکن اسی صورت میں ان کو'' حاضر'' (یعنی اپنے آپ کو منوانے والا) نہیں کہا جائے گا۔ حاضر جب ہی کہیں گے جب وہ 'وجود' کے دائرہ سے 'حضور' کے دائرہ میں آئیں۔ جس میں شعور ذات دوسروں پر اثر، اپنی ذات سے آگے بڑھ کر دنیا کے لیے ایک نظریہ پیش کرنا اور زندگی کو حرکت دینے میں فعالیت کے ساتھ حصہ لینا سب آتا ہے۔ اِس لحاظ سے حضور میں مشارکہ، تاثیر وفعالیت ہے۔ اثر پذیری، دوسروں کی بات اخذ کرنا، اس کی

تکرار، دوسروں کی جگالی، اپنے اوپر بندر ہنا اور اپنے خول میں سمٹنا نہیں ہے۔ ملاحظہ کریں: مالک بن نبی، مشکلۃ الثقافۃ، ترجمہ عبدالصبور شاہین، طبع چہارم، دمشق: دارالفکر ۱۹۸۴) صفحہ ۱۲ اور مابعد) اور اِس سے حضارۃ کی اصطلاح ایک غیرجانب دارانہ مفہوم کی حامل ہوجاتی ہے (مطلب یہ ہے کہ وہ فی نفسہ کسی قدر پر دلالت نہیں کرے گا نہ ترقی وغیرترقی پر، اور تہذیبی حرکت کو مثبت و منفی معنوں میں صرف اسی وقت سمجھا جاسکتا ہے جب اس کے مقصود و مآل پر نظر رکھی جائے گی۔ اس اصطلاح اور اس کے استعمالات کے تتبع کے لیے ملاحظہ ہو: نصر محمد عارف، الحضارۃ، الثقافۃ، المدینۃ، دراسۃ لمسیرۃ المصطلح ودلالۃ المفہوم، مشمولہ بناء المفاہیم دراسۃ معرفیۃ ونماذج تطبیقیۃ نگرانی: ڈاکٹر علی جمعۃ اور ڈاکٹر سیف الدین عبدالفتاح، طبع اول، (القاہرہ: دارالسلام ۱۴۲۹ھ (۲۰۰۸ء) جلد ا صفحہ 301-260) یعنی زندگی میں جو بھی ایسی سرگرمی ہوگی جس کی مذکورہ صفات ہوں، اُس پر ''حضارۃ'' کا اطلاق درست ہوگا۔ لہٰذا ہر ''حضارۃ'' کی اپنی خاص تعریف ہوگی جو اُس کے سائنسی نمونہ پر مبنی ہوگی جو کہ اُس کے اندر چھپا ہوا ہے اور ان اقدار پر ہوگی جن کو وہ ''حضارۃ'' پیدا کرے گی اور اس کا اپنا خاص مذاق ہوگا جو اُسے دوسروں سے ممتاز کرے گا۔ اِسی سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ کسی تہذیب کو ممتاز کرنے والی چیز وہ علوم اور صنعتیں نہیں ہوتیں جو اس نے پیدا کیں بلکہ ان علوم وفنون کو رخ دینے والی اوران کو محیط اقدار ہوتی ہیں جو متعدد معیاروں و میزانوں پر مشتمل ہوا کرتی ہیں۔ قدروں کے اسی امتیاز سے وہ 'تدافع حضاری' (ایک تہذیب کا دوسری کی جگہ لینا) حاصل ہوجاتا ہے جس سے زندگی کی گاڑی آگے چلتی ہے اور فعال رہتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا: **ولولادفع الله الناس بعضهم**: اور خدا لوگوں کو ایک دوسرے (پر چڑھائی اور حملہ کرنے سے (ہٹاتا نہ رہتا تو ملک تباہ ہوجاتا لیکن خدا اہل عالم پر بڑا مہربان ہے (البقرۃ: ۲۵۱)۔

اسی بنیاد پر ہم اسلامی تہذیب کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ وہ ''ہر وہ سرگرمی وعمل ہے جو زندگی کو اسلام کے لحاظ سے اور انسان، کائنات اور زندگی اور اس کے مقاصد کے نظریہ کے مطابق حرکت دے۔ جو اپنا خاص سائنسی وعلمی نظام رکھتا ہو، جو کہ انسان کو انسان کے رب سے اور دوسرے انسانوں سے جوڑتا ہو۔ اس کے بعد کائنات اور اس کی اشیاء سے اس کی نسبت تعمیر، امانت اور ثمرخیزی کی ہو (واضح رہے کہ ہمارا یہ مطالعہ اِسی تعریف کے گرد ہوگا۔ ہم اسلامی تہذیب کی اُس روایتی تعریف سے اختلاف رکھتے ہیں جس کا مآل یہ ہے کہ: مسلمانوں کے تجربے اور ان کے کارنامے ہی اسلامی تہذیب ہیں۔ اور یہ اس تعریف کے بھی خلاف

ہے جس میں تاریخی ورثہ، مادی وفنی کارناموں اورافکاراورنظامہائے زندگی کی تاریخ کو بنیاد بنالیا جاتا ہے )۔

**ثالثًا: اسلام کے تہذیبی اقدار کی نظریاتی اساس:** مذکورہ بالا بحث کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''اسلام کے تہذیبی اقدار کا تصوراپنی نظریاتی اساس میں واضح ہے۔اُس کا اطلاق اِس مطالعہ میں ان معیارات ومیزانوں پر ہوتا ہے جوانسان کے عمل کی توجیہ کرتے ہیں اور جوتہذیبی اثرات پر حاکم ہیں اوران کو منضبط کرتے ہیں۔تمام تنوع ووسعت کے ساتھ اور اسلام کے نظریات اورمقاصد کے مطابق۔اِس سے وہ زندگی کوتحریک دیتے ہیں اور معیت الٰھیہ کوحاصل کرتے ہیں۔اورانسانی ذات کو مضبوط کرتے ہیں۔کائنات اوراُس کی نعمتوں اوراس کی اشیاء کے ساتھ معاملہ کرنے میں استواری کا ثبوت دیتے ہیں۔اور یہ چیزیں اُس فہم کے ذریعہ انجام پاتی ہیں جن میں توازن ہو، بےغرضی ہو، اداء حقوق ہو،حرمتوں کی اور بلند ذوق کی رعایت ہو، بذل وایثار کے اعلی مظاہر ہوں،سب کی بھلائی چاہی جائے،تہذیبی سرکشی اورتمدنی استحصال سے جنگ ہو،تہذیبی گمراہی وبغاوت اور برے اخلاقیات کے تمام رنگوں سے الگ ہوکرکام کیا جاتا ہو۔اس طرح وہ ایک مجموعی نظریہ (مجموعی نظریہ ایک اصطلاح ہے جواس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تصوراکیلانہیں مجموعی ہے۔اوراپنے اندرتصورات ودلالتوں کا ایک مکمل نظام رکھتا ہے۔اسی طرح اس فہم یاعلم کی بنیاداس کی قیمت کا سمجھنااس چیز کے ذریعہ ہی ممکن ہے،جواس تصور سے مربوط ہے چاہےاقوال ہوں یاان سے متعلقہ تصورات ،ملاحظہ کریں: سیف الدین عبدالفتاح ،العلاقات الدولیۃ فی الاسلام ......مدخل القیم طبع اول ورجینیاالمعہد العالمی للفکر الاسلامی ۱۴۱۹ھ 1999صفحہ 611) ہے، جو اپنے فریم ورک میں چندمرکزی دلالتیں رکھتا ہے،جن میں اہم یہ ہیں:

**ا۔اسلام میں تہذیبی قدریں:** اس ''داخلی منطق'' کی ترجمانی کرتی ہیں جوامت مسلمہ کی تشکیل کرتی ہے۔اُنہیں پراُس کی تہذیب قائم ہوتی اور پروان چڑھتی ہے۔جیسا کہ یہی قدریں تہذیبی تحفظ بھی اسے فراہم کرتی ہیں یعنی وہ قوت جومسلمان کو دوسروں میں تحلیل ہونے سے روکے۔مطلب یہ ہے کہ یہ قدریں اٹھنے اورآگے بڑھانے کی قوت تشکیل کرتی ہیں اس کی فعالیت بڑھاتی ہیں جب وہ مضبوط ہو،جیسا کہ وہ کمزوری کے دنوں میں بھی وہ قوت اورتہذیبی بچاؤ دیتی ہیں جو

اسے دوسروں میں تحلیل ہونے سے بچائے۔ اِس منطق سے اسلامی تہذیب کوتوڑنے کی کوشش ایک طرح کا خیال عبث، بلکہ انہزام نفسی، تہذیبی شکست اور غیروں کی تبعیت مانی جائے گی جیسا کہ اس منطق سے اپنے آپ واضح ہے کہ 'تحریک زندگی' سے ہرفرارفکرمیں ہو یا حرکت میں، اِس ''تحریک'' سے اسلام کی صفت چھین لے گا۔ اوراسی وجہ سے ''امت کی کوئی بھی تحریک'' جس سے اس کو فعالیت واپس ملے ضروری ہے کہ وہ اسی 'منطق' کی طرف رجوع کرے اوراس کو زندگی پر نافذ کرے، ورنہ اِس 'تحریک' کی کوششیں عمل میں ناکام ہوجائیں گی جیسا کہ محسوس ومشاہد ہے۔

**۲۔''اسلام کی تہذیبی قدریں'':** اس معیاراور مرکزی فریم کی نمائندگی کرتی ہیں جوزندگی میں ایک مسلمان کے اعمال وحرکات کو منضبط اور کنٹرول کرتا ہے۔ یعنی وہ بس نظریاتی وخیالی چیزنہیں بلکہ ایسا نظریہ ہے جوحقیقت واقعہ سے جڑا ہوا ہے۔ اور یہ حقیقت واقعہ اسلام کی صفت سے اسی وقت متصف ہوگی اورتبھی اسلامی رنگ اسے ملے گا جب وہ 'معیار' اور' مرکزی فریم ورک' کا التزام کرے گی۔ اسی معیار کے ذریعہ ہی زندگی اپنا سفر طے کرتی ہے اورمتحرک ہوتی ہے۔ اِس سلسلہ میں اسلام تین تصورات پیش کرتا ہے جوتحریک حیات میں اسلام کی بہترین قدروں کی نمائندگی کرتے ہیں، یعنی 'استخلاف' جس سے زندگی کا سفر احکام الٰہی اورخدا کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے، ''التزکیۃ'' کہ زندگی کے اِس سفر میں جووسائل اختیار کیے جائیں وہ تزکیہ کے تابع ہوں گے، یعنی ان میں 'حق نفس' حق غیر' سب کی رعایت کی جاتی ہے۔ اورتیسری چیز ہے استقامت' یعنی دنیا کی اس زندگی میں مسلمانوں کے تمام کام اللہ کی شریعت اورمنہج ربانی کے مطابق چلیں۔ علم وعمل کے میدان میں وہ جوکچھ بھی کرے وحی کے علوم سے روشنی لے ،اس کے مقاصد سے منضبط ہو، اسی سے مدد حاصل کرے۔ اِس طرح مسلمان کے تمام اقوال وافعال اوراحوال سب اللہ کے لیے اللہ کے ساتھ اوراس کے حکم سے ہوں۔ یہ تین تصورات استخلاف، تزکیہ، اور استقامت مل کرایک پورا نظام فکر وعمل تشکیل دیتے ہیں (ملاحظہ کریں سیف الدین عبدالفتاح، العلاقات الدولیۃ فی الاسلام، مدخل القیم صفحہ 178) اوروہ ''اہم قدروں'' کی ترجمانی ہی کرتے ہیں۔ جومسلمان کے لیے تہذیبی

جدوجہد کی نظریہ سازی کرتی ہیں (اسلام کی تہذیبی قدریں سب اسلام کی اس اہم قدر کے تحت آتی ہیں جو قدر حاکم ہے ۔اور وہ توحید ہے، جس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے شرک کی نفی کی جاتی ہے کہ اس کی ذات، صفات اور افعال میں کوئی بھی اُس کا شریک نہیں۔توحید ہی اس کا آغاز اور بنیاد ہے اور اُسی سے مقصد وغایت پوری ہوتی ہے ۔یعنی زندگی میں جو بھی تگ ودو ہے ،چاہے اقتداء ہو یا استمداد وہ سب توحید سے پھوٹتی ہے اُسی کی طرف لوٹتی ہے، اگر یہ صورت حال نہ ہو تو اُس کو اسلام سے نسبت نہیں دی جاسکتی ۔تو مقاصد ومصالح اِس مفہوم میں اسلامی قدروں کی تجسیم ہی ہیں اور جو یہ طے کرتے ہیں کہ انسان کو کون کون سے کام کرنے ہیں) جیسا کہ وہ تہذیب کی برقراری کے وہ ''اساسی ضوابط'' بھی دیتے ہیں جن کی دَین منقطع نہیں ہوتی اور جن کی فعالیت مرتی نہیں۔

**۳۔یہ کہ اسلام کی تہذیبی قدریں:** ''اسلام کے تحریکی مقاصد''اور حرکت حیات میں اس کے مصالح کی تشکیل کرتے ہیں اسی لیے فقہ اسلامی کے اصول میں اِن تہذیبی قدروں کو کبھی مقاصد سے تعبیر کیا جاتا ہے اور کبھی مصالح سے۔مقاصد شرع یہ ہیں: دین کی حفاظت جو امت کی بنیاد اور اہم فریم ورک ہے، فرد و جماعت کا تحفظ، انسانی تعمیر اور ہیومن رسورسز کی ترقی کے لیے امت کے وجود کا تحفظ اور اس کی بقاء وتسلسل ۔ مال اور تمدن اور ترقی کی دوسری بنیادیں، عقل، ذہانت اور ثقافت وکلچر بنانے والے عناصر۔رہے شرعی مصالح تو وہ ایسے منافع ہیں جو شارع کا مقصود ہیں اور ان سے فوری طور پر انسان کی صلاح وفلاح مقصود ہے اور دارین میں انسانیت کی سعادت مطلوب ہے۔

**۴۔اسلام کی تہذیبی قدریں:** اپنی تینوں سابقہ دلالتوں کے ساتھ استخلاف، تزکیہ، استقامت ،اور مقاصد ومصالح کے دائرہ میں کل ملا کر اسلامی شریعت کی روح اور اس کے منہاج کی تشکیل کرتی ہیں۔اثبات ونفی دونوں اعتبار سے قدریں اس منہاج سے مربوط ہیں کیونکہ یہ قدریں ہی ہیں جن کے ذریعہ اسلامی شریعت کا امتیاز دوسروں سے ظاہر ہوتا ہے۔اسی طرح شرع کے اوامر ونواہی کا اتباع بھی ان قدروں کی ہی تجسیم ہے اور ان کو فعال بنانا ہے۔اللہ تعالیٰ کے فرمان ''**لكل جعلنامنكم شِرعة ومنهاجا**'' ہم نے تم میں ہر ایک کے لیے ایک ہی طریقہ اور منہاج متعین کر دیا ہے (المائدہ:48) سے یہی مستفاد ہوتا ہے۔

۵۔ یہ قدریں اسلام کی تہذیبی تعمیر میں اہم مقام رکھتی ہیں، کیونکہ اسلام کے تہذیبی وتعمیری اصول میں سے یہ ہے کہ مسلمان یہ ادراک رکھے کہ وہ یونہی آزاد نہیں ہے اور وہ اپنا طریقہ محض عقل سے اخذ نہیں کرسکتا ہے۔ بلکہ وہ اِس معاملہ میں قرآن وسنت کا پابند ہے۔ صحیح حدیث نبوی کا اتباع لازمی ہے ورنہ تو گمراہی ضروری ہوگی۔ جیسا کہ امام مالک بن انسؒ فرماتے ہیں: جس قوم میں بھی حدیثیں کم ہوں اُس میں گمراہیاں زیادہ پھیلتی ہیں (الخطیب البغدادی، الفقیہ والمتفقہ طبع ثانی سعودی عرب، دار ابن الجوزی، 1421ھ 1/383) اور رسول اللہ ﷺ کی حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی حدیث میں اس کو یوں آشکارا کیا گیا ہے: لا یومن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لماجئت بہ: تم میں کوئی بھی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی خواہشات میرے لائے ہوئے دین کے تابع نہ ہوجائیں (ابن حجر فتح الباری 289/13 میں لکھتے ہیں کہ: اس حدیث کی تخریج الحسن بن سفیان وغیرہ نے کی ہے۔ اس کے رجال ثقات ہیں الاربعین کے آخر میں نووی نے اِس کی تصحیح کی ہے۔ یہ حدیث اِس پر دلالت کرتی ہے کہ اسلامی شریعت کے مقاصد میں سے یہ بھی ہے کہ مکلّف کو اپنی خواہشات کے داعیہ سے نکال دے کیونکہ خواہشات کی اتباع آدمی کو حرام کی طرف لے جاتی ہے کہ خواہشات کے پیچھے بھاگنے سے آدمی اپنے نفس کا بندہ بن جاتا ہے اور اُس کے لیے احکام شرع کا اتباع اور مشکل ہوجاتا ہے)۔

شاطبیؒ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ: آدمی مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنی خواہشات کو چھوڑ کر اللہ کا اختیاری بندہ نہ بن جائے جیسا کہ وہ اُس کا اضطراری بندہ ہے (الشاطبی: الموافقات، تحریر وتحقیق الشیخ عبداللہ دراز (بیروت: دارالمعارف 2/168) اللہ تعالی کے قول: قل ان صلاتی: یہ بھی کہ دو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا مرنا اور میرا جینا سب اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے (الانعام: 162) میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

جس چیز کو بھی انسان اللہ کا حکم سمجھ کر کرتا ہے، اُس میں وہ اس کی عبادت کرتا اور ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعدؓ سے فرمایا تھا: **انک لتوجر فی کل شیئی حتی اللقمة تضعھافی فیی امرائتک** (یہ حدیث مختلف روایات میں آئی ہے۔ دیکھیے فتح الباری: کتاب الایمان باب ماجاء ان الاعمال بالنیة والحسبة 1/30 حدیث نمبر 456 صحیح مسلم کتاب الوصیة، باب: الوصیة بالثلث

250/3 حدیث نمبر 1428 (۳) بخاری میں یہ حدیث مختلف روایات کے تحت دوجگہ آئی ہے: کتاب الزراعۃ ، باب فضل الزرع والغرس ، اذا اکل منہ ،817/2 حدیث نمبر 2195 اور کتاب الادب باب رحمۃ الناس بالبھائم 22/28/5 حدیث نمبر 5666 اسی کے مثل امام مسلم نے بھی تخریج کی ہے: کتاب المساقات میں) تم کو ہر چیز میں اجر دیا جائے گا یہاں تک اس لقمہ میں بھی جو تم اپنی بیوی کے منہ میں رکھو گے۔

آپ ﷺ نے سعدؓ سے یہ بات اُس وقت کہی تھی جب آپؐ نے دیکھا کہ اپنے کاموں میں احکام الٰہی کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں اور اِسی جہت سے وہ حدیث ہے جس میں آپ نے فرمایا: مامن مسلم غرس غرساثم یوکل منہ شئی الا کان لہ صدقۃ: جو مسلمان بھی کوئی پودہ لگائے اور پھر اس کے درخت سے پھل کھائے جائیں تو اس کو صدقہ کا ثواب ملے گا۔(۲)(۳) تو مسلمان کے کام میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جس کا حکم دین میں نہ ہو یا تو وہ منصوص علیہ ہو یا منصوص علیہ میں استنباط کے قابل ہو، یعنی اللہ نے کوئی حکم بیان کیے بغیر نہیں چھوڑا ہے کیونکہ ’’ اللہ تعالی کے لیے ہر فعل جسے انسان کرے عبادت ہے چاہے وہ فعل واجب ہو یا نفل ہو یا مستحب ہو (الراغب الاصفہانی، تفصیل النشائتین وتحصیل السعادتین، تقدیم وتحقیق، ڈاکٹر عبدالحمید النجار، طبع اول (بیروت: دارالغرب الاسلامی) 1408ھ/1988 صفحہ 155) جس سے یہ اور مؤکد ہوجاتا ہے کہ جب سے اسلامی تہذیب کی قرآن وحدیث پر بنیاد پڑی وہ اقدار وتصورات کی تہذیب ہے، صورت وشکل کی نہیں۔اس کی غایت انسان کی ترقی ہے اس کی تہذیبی کوشش میں اور اس کو ’’معیت الٰہی‘‘ کے حصول کی دعوت کے ذریعہ عقلی وخلقی کمال کی طرف لے جانا مقصود ہے۔جس کو دین کے معیار سے منضبط کیا جائے گا اور شرع الٰہی کے مطابق عمل سے جانچا جائے گا۔اِس طرح ہر چیز میں مسلم ومومن خدا کا جلوہ دیکھے گا۔اور یہ جانے گا کہ حق تعالی اسے ہر چیز میں مخاطب کرتا ہے اور یہ تخاطب زندگی بھر چلتا رہتا ہے، اور وہ جہاں بھی جاتا ہے رب تعالی کو پاتا ہے۔اُس کے امر ونھی کا لحاظ رکھتا ہے، اور جانتا ہے کہ اللہ تعالی اُسے ہمیشہ دیکھ رہا ہے۔اسی لیے اُس سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں میں اپنے نفس کا جائزہ لے اور رب تعالی کا خوف کرے، یعنی معیت الٰھی کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالی اُس کی زندگی کے ہر معاملہ میں رہنمائی کر رہا ہے اور اُس کے تمام اعمال وتصرفات کو دیکھ رہا ہے۔

اِس معیت الٰہی کے باعث ہی ارادہ کومغلوب کرنے والے'' اوامرونواہی'' جمالیاتی معانی میں بدل جاتے ہیں۔ان کے درمیان سے انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اخلاق عالیہ پرمہارت اورالہامی ربانی سے عمل کررہاہے اوران اسلامی قدروں کے زیرسایہ آدمی انسانی آفاق سے بھی بلند ہوجاتا ہے۔کیونکہ ''نفس کوحقوق کے تحت'' رکھنااصول شریعت پرثابت قدم رہنا،عقیدہ کے سبھی کلیات وجزئیات پرعمل سے ہوگا کہ اسلامی تصورمیں ان'' قدروں'' کا مرجع ذاتی پسند اورخواہشات نفس نہیں،نہ بغیرقاعدہ اورضابطہ کے انسانی عقل ہے اورنہ ایسی مصلحت ہے جیسا کہ بعض سمجھتے ہیں کہ اللہ کے دین میں وہ کسی اصل کے تابع نہیں اورنہ کسی چیزکا اعتبار ہے سوائے وحی معصوم کے اعتبار کے، کہ وحی ربانی ہی وہ ضوابط وموازین بناتی ہے جوانسانی زندگی کے ہرمعاملہ میں حاکم ہیں۔

لہٰذامسلمان کوصرف مقاصدشریعت ہی حاصل نہیں ہوتے بلکہ ان مقاصدکوحاصل کرنے کے وسائل بھی اُسے بتائے گئے ہیں۔یہی چیز ہے جس سے مقاصدشرع کوثبات ورسوخ ملتاہے۔اوروہ اس قابل ہوجاتے ہیں کہ ہرزمان ومکان میں تخلیقیت پرقادرہوں۔کیونکہ یہ قدریں وہ ہیں جن کو شارع حکیم سبحانہ وتعالی نے خودمقررکیاہے۔اورجس نے یہ ضمانت دی ہے کہ'' مقاصدصحیح'' اوروسائل ہمیشہ بامرادہوں گے۔

اللہ ہی ان قدروں کوقبول کرتااوران کولازمی قراردیتاہے اور یہ لازمی قراردیتاہے کہ اُن کے مطابق مسلسل وپابندی سے عمل کیاجائے۔تواِن قدروں کی بنیاد پرعمل درامداوران کواستعمال کرنے میں اورتمام ظاہری وباطنی جہتوں میں ان کی پابندی کرنااوراخلاص وتقرب اپنے ہرکام میں چاہنایہ مسلمان کے لیےشرعی بنیاد ہے۔اسلامی قدروں میں امرونہی ،فرضیت وتحریم اورمنع واباحت وغیرہ کی قیدیں ہیں۔جن کے باعث ہی فقہ اسلامی میں اِن کوآداب شریعت کہاجاتا ہے۔یہیں سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ فردواجتماع ہویاحکومت کانظام سیاسی جب ان قدروں کوعمل کی بنیادبناتے ہیں توان سب کوحقیقی جواز حاصل ہوجاتا ہے(مرجع سابق)اوراسی سے ان کی فرضیت واضح ہوتی اوران

کے التزام کا گہرا شعور حاصل ہوتا ہے۔

اسی طرح اسلام کی تہذیبی بناء میں قدروں کی مرکزیت اِس سے واضح ہوتی ہے کہ وہ: ذاتِ انسانی کو مضبوط بنانے اور نفس انسانی کے حقوق کے پاس ولحاظ کی دعوت دیتی ہیں، جو اصل ،مقصد اور وسیلہ کے لحاظ سے اس کا تزکیہ کرتی ہیں اور اس کے عمل کو درست کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ وہ اُس کو یہ بھی تعلیم دیتی ہیں کہ دوسروں کے حقوق بھی پہچانے اور اِس ''غیر'' میں انسان، حیوان، نباتات و جمادات سبھی آجاتے ہیں۔ اِس لیے کہ اسلامی تہذیب کے منہج میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ ہم سب کے حقوق ادا کریں ان کو ضائع نہ کریں اور یہ 'غیر' راضی ہو ناراض نہ رہے (حامد عبدالماجد قویسی، الوظیفۃ العقیدیۃ فی الدولۃ الاسلامیۃ طبع اول، القاھرۃ، دار الطباعۃ والنشر الاسلامیۃ 1413ھ، 1993 صفحہ 217)۔

اسی لیے فرزندانِ اسلام کو سب کے ساتھ مذکورہ بالا طریقہ پر ہی معاملہ کرنا ہے۔ اسی لیے اسلام زندگی کے ایسے کسی بھی طریقہ سے راضی نہیں ہوسکتا اور ایسی کسی بھی قدر کا قائل نہیں ہوسکتا جو انسان سے اس کی انسانیت چھین لے اور اسے غلام بنالے اور ذلیل کرے یا جو انسانیت کی نمائندہ نہ ہو بلکہ جو کمالِ انسانیت کی تجسیم نہ کرتی ہو۔ کیونکہ اسلامی تہذیب کا مقصدِ اساسی کمال اخلاق کا حصول ہے۔ نفس انسانی کا تزکیہ، اس کے مقاصد اور اس کے اعمال کا تزکیہ ہے۔ جیسا کہ اسلام ایسے کسی بھی کام کا انکار کرتا ہے جس میں ''انسانیت کے کلی مقاصد نہ پائے جائیں'' جن کی اساس اسلام میں عبادت الٰہی پر ہے۔ اور عبادت الٰہی فرد کو اعتدال وتوازن، ہم آہنگی والفت، فطرت کی پاس داری اور حقائقِ نفسی کی رعایت سکھاتی ہے۔ غیر کے حقائق، عقلی قدرت، جسمانی قوت، نفسانی خواہشات پر کنٹرول وغیرہ کی تعلیم دیتی ہے۔ چنانچہ زندگی کو تحریک دینے کے لیے اسلام مسلمانوں اور ان کے اداروں کو ان آداب شرعی کا پابند بناتا ہے جو اخلاقی مجموعہ (لہٰذا یہ اخلاقی مجموعہ ربانی اخلاق ہیں جو وحی الٰہی اور اسوۂ رسول سے ماخوذ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کی اخلاقیات کو ''ربانی اخلاق'' کے مطابق ہونا چاہیے اپنے معاشرہ کے اخلاق یا نفسانی اخلاق، جس کو اختیار کرنے کو انسان کا دل کہے، کے مطابق نہیں) کے نمائندہ ہیں کہ انسانیت کی تاریخ میں ان کی نظیر موجود نہیں۔ یہ مجموعۂ اخلاقیات معروف کی تعریف یوں کرتا ہے کہ یہ وہ فوائد ہیں

جوفطری طور پر انسان کی انسانیت کو اونچا اٹھاتے ہیں یا کم ازکم اس کا تحفظ کرتے ہیں۔اور منکر کی تعریف یوں کہ وہ ایسے نقصانات ہیں جو اس کی انسانیت کو گرائیں، یہاں تک کہ وہ احکامِ شرع بھی جو عبادات کے باب میں آتے ہیں وہ بھی اخلاقی قدروں سے الگ نہیں ہیں۔ان میں بھی اخلاقی پہلو فقہی پہلو کی تشکیل کرتا ہے جیسا کہ فقہی پہلو کی رہنمائی اخلاقی پہلو کرتا ہے (قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ: شریعت کے احکام وہ اوامر و نواہی ہیں جو نیکیوں ومحاسن کے حصول پر ابھارتے ہیں اور منکرات وبرائیوں سے روکتے ہیں۔اور اس دنیا کی اچھائی اور بنی آدم کی بھلائی جن چیزوں سے ہو ان کو مباح کرتے ہیں۔فقہ کے ابواب اور اس کی تمام کتاب کے ابواب اِنہیں کی شرح ہیں، ملاحظہ کریں: ترتیب المدارک وتقریب المسالک صفحہ ۲۹)۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں حکم شرعی کی دو بنیادیں ہیں جو ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں ایک فقہی اور دوسری اخلاقی قدر، جو انسان کے عمل کے باطنی پہلو کو منضبط کرتی ہیں جو انسان کو نیک و بد بناتی ہیں اور دوسروں پر بھی اس کے اثرات مرتب کرتی ہیں۔یہی چیز مسلمان کو بہترین اخلاق دیتی ہے (ملاحظہ فرمائیں: طٰہٰ عبدالرحمٰن، تجدید المنہج فی تقویم التراث طبع ثالث (بیروت: المرکز الثقافی العربی 2007) صفحہ 106)۔

اسی کو امام شاطبی یوں کہتے ہیں: شریعت ساری کی ساری مکارم اخلاق اختیار کرنے کا نام ہے۔اسی لیے نبیؐ نے فرمایا: **انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق** (صالح کی روایت میں جس کو احمد نے روایت کیا ہے اور بیہقی نے شعب الایمان میں نیز حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے اور کہا کہ مسلم کی شرط پر ہے مگر دونوں نے اُس کی تخریج نہیں کی ہے۔ذہبی نے اس سے اتفاق کیا اور بخاری نے اس کی روایت ادب المفرد میں بروایت ابوھریرہؓ کی ہے جس کی تصحیح البانی نے کی ہے: ملاحظہ ہو: سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ (الریاض: مکتبہ المعارف للنشر والتوزیع 1415ھ 1995 رقم 112/1,45) میری بعثت اس لیے ہوئی ہے کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کردوں (الموافقات للشاطبی 77/2) اور فرماتے ہیں کہ: **ان اللہ کریم یحب الکرم ومعالی الاخلاق ویبغض سفسافھا** (سفساس سے مراد حقیر اور برے امور، حدیث کی روایت حاکم نے دوسندوں سے مستدرک میں کی ہے، جو دونوں سہل بن الساعدی کے طریقہ سے ہیں۔پھر کہا ہے کہ حدیث صحیح الاسنادین ولم یخرجاہ، المستدرک 112/1) اللہ

تعالی کریم ہے اور کرم اور اونچے اخلاق کو پسند کرتا ہے اور گرے ہوئے اخلاق کو ناپسند فرماتا ہے۔

امام حرالی نے کہا ہے: مکارم اخلاق ہی دین و دنیا سب کی بھلائی ہیں۔جس کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے اِس قول میں جمع کر دیا ہے: **اللھم اصلح لی دینی الذی ھو عصمة امری واصلح لی دنیای التی فیھامعاشی ، واصلح لی آخرتی التی فیھامعادی ،واجعل الحیاة زیادة لی فی کل خیرواجعل الموت راحة لی من کل شر** (ابوالحسن الحرالی المراکشی ،مفتاح الباب المقفل لفھم القرآن المنز ل،تقدیم وتحقیق : محمادی بن عبدالسلام الخیاطی ،طبع اول ،(الدارالبیضاء ،المغر ب ،مطبعة النجاح 1418ھ 1998 صفحہ ۴۵ ،مکارم الاخلاق اس جامع مفہوم میں وہی چیز ہے جسے امام راغب الاصفہانی مکارم الشریعة کہتے ہیں اوراسی پر انہوں نے اپنی کتاب کا نام الذریعة الی مکارم الشریعة رکھا ہے۔دونوں کے درمیان انہوں نے یہ فرق بیان کیا ہے کہ احکام شریعت وہ ہیں جن کا مبدأ احکام تکلیفیہ ہیں جو کہ امرونہی سے متعلق ہیں۔اور مکارم شریعت وہ ہیں جن کا مبدأ طہارت نفس ،عفت ،صبر وعدالت ہیں اوران کا نتیجہ حکمت ، جود، حلم اورانسان ہیں ) اے اللہ میرے لیے میرے دین کی اصلاح کر دے، جومیرے معاملات کی اصل ہے اور میری دنیا کو درست کر دے جو میری معاش ہے، اور میری آخرت کو درست کر دے جس میں میرا آخری ٹھکانہ ہے اور ہر خیر میں میری زندگی کو زیادہ کر دے اور موت کو میرے لیے ہر شر سے راحت کا سامان بنادے ( صحیح مسلم کتاب الذکر والدعاء باب التعوذ 208/4 حدیث نمبر:2720 )۔

الغرض دین کا مقصد شرعی ،اخلاقی مقصود ہے اورحدیث رسول میں لاتمم کے لفظ سے یہ خوبصورت اشارہ ہے کہ اسلام کا پیغام گزشتہ رسالتوں کی تکمیل وتسلسل ہے وہ ان سے الگ اوران سے کٹا ہوانہیں ہے۔ ہرزمانہ کے انسان نے جوبھی بلند قدریں اور بلند اخلاق ایجاد کیے ہیں اسلام ان کو اپنے نظام فکر میں شامل کر لیتا اوران کو جاری رکھتا ہے اوران کے ذریعہ اس وسیع کائنات میں بلند انسانی مقاصد کوحاصل کرتا ہے۔

ان بلند تہذیبی قدروں کوفروغ دیتا ہے جن سے انسان کی انسانیت اوراس کے شرف کی حفاظت ہو ( جاہلیت کے زمانہ میں عبداللہ بن جدعان کے گھر میں ظلم سے لڑنے ،مظلوم کی حمایت اور ظالم کوروکنے کے لیے

حلف الفضول کا معاہدہ ہوا جس کو حلف المطیبین بھی کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ بھی اِس میں شریک ہوئے اور بعد میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اسلام میں بھی مجھے اس جیسے کام کے لیے بلایا جاتا تو میں ضرور اس دعوت کو قبول کرتا۔ اِس قول سے یہ دلیل ملتی ہے کہ دوسری تہذیبوں وثقافتوں سے وہ چیزیں اخذ کی جاسکتی ہیں جو حقائق ایمان، احکام شرع اور مقاصد شریعت کے مخالف نہ ہوں۔ دیکھیں حاشیہ ابن قیم علی سنن ابی داؤد جلد 101/8 مسند احمد میں بھی یہ حدیث بروایت عبدالرحمٰن بن عوف آئی ہے۔ (93/1 حدیث نمبر:1655) انہوں نے فرمایا کہ حضورؐ نے فرمایا: کم سنی میں میں اپنے چچاؤں کے ساتھ حلف المطیبین میں شامل ہوا۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ میں اس عہد کو سرخ اونٹوں کے بدلہ میں بھی توڑ دوں، حاکم نے مستدرک میں اس حدیث کی اسناد کو صحیح قرار دیا ہے۔ 239 حدیث نمبر 2870) ان تمام قدروں کے ذریعہ سے ہی معیت الٰہی کا حصول اور انسانی شخصیت کا ارتقاء ہوگا۔ اور اسلامی تہذیبی عمارت میں یہ قدریں مرکزی مقام رکھتی ہیں۔ اور ان کے ذریعہ ہی مسلمان علم وعمل میں استقامت کا ثبوت دیتا ہے۔ چنانچہ اُس کے تمام احوال، اقوال، افعال اور نیتیں سب اللہ کے لیے، اللہ کے ذریعہ اور اللہ کے حکم سے ہوتی ہیں (ابن القیم، مدارج السالکین بین منازل ایاک نعبد و ایاک نستعین، محمد حامد الفقی، طبع دوم (بیروت دارالکتاب العربی، 1393ھ/1973/2/105) اسی کو ہم زمین کی ایمانی تعمیر کہتے ہیں۔ اور اس طرح یہ قدریں ہی حقیقت میں کائناتی قدریں ہوں گی نہ کہ دوسری قدریں، کیونکہ یہی قدریں انسان کو منتہائے کمال کو پہنچاتی ہیں یعنی اللہ تک اسے پہنچاتی ہیں اور اسی طرح انسان کو انسان سے ملاتی ہیں۔ اور علم وعمل میں تہذیبی عمارت کی تکمیل کرتی ہیں یہ قدریں اپنی تہذیبی فقہ میں تین رسیوں سے مربوط ہیں۔ ایک رسی وہ جو اللہ سے جوڑتی ہے، یعنی استخلاف اور معیت الٰہی، دوسری رسی وہ جو انسان کو انسان سے جوڑتی ہے، یعنی تزکیہ اور انسانی ذات کا ارتقاء، اور ایک رسی وہ ہے جس سے انسان کا تعلق کائنات سے ہوتا ہے یعنی استقامت اور زمین کی ایمانی تعمیر وآبادکاری۔ اگلی فصلوں میں ہم تفصیل سے ان تینوں چیزوں کو بیان کریں گے۔

☆☆☆

**فصل اول**

# خلافت اور معیت الٰہی کا حصول

حرکت حیات کی اصل : اسلام کی تہذیبی اساس وہ اساس ہے جس میں زمین وآسمان دونوں مل جاتے ہیں ( کائناتی اقدار کے نظام یا جدیدیت کی اقدار میں انسان کے برخلاف، کہ ان میں وہ ہمیشہ زمین کی طرف دیکھتا ہے آسمان کی طرف نہیں۔ یہی نہیں بلکہ مسیحیت میں بھی جس پر مغربی انسان صدیوں سے ایمان رکھتا آیا ہے۔ انسان کے اِس زمینی رجحان پر غلبہ نہیں پایا جاسکا بلکہ بجائے اس کے کہ وہ آسمان کی طرف نظر اٹھائے، اُس نے خود مسیحیت کے خدا کو ہی زمین پر اتار کر اسے مخلوقِ ارضی کی مانند بنا ڈالا ) اُس میں انسان نہ تو ایسا الٰہ بنتا ہے جو دوسرے'' آلہۃ'' سے بھڑا ہوا ہو یا یہ آلہہ خود اس سے ٹکرا رہے ہوں۔ اسی طرح نہ وہ ایسا جانور ہے جس کی سرداری زمین پر یونہی قائم ہوگئی ہو کہ اُس کی جگہ کل کوئی بلی یا چوہا بھی اس کے قائم مقام ہوسکتا ہو۔ نہ ہی وہ کوئی'' آلہ'' ہے کہ جس کی قیمت'' گھوڑوں'' کے برابر ہو جو دنیا کو چلانے اور زندگی کو حرکت دینے میں اس کے برابر ہو، نہ ہی وہ مادہ کا غلام ہے، یا ایسی لوح ہے جس پر مادہ کو یا' فطرت' وغیرہ کو چھاپ دیا جائے۔ نہ وہی مشین کا غلام ہے جس کی زندگی، افکار اور احوال مشینی انداز میں الٹتے پلٹتے رہیں۔ اور نہ ہی وہ کوئی جانور یا جانوروں کا مجموعہ ہے جو اپنے گلہ ہی میں حرکت کرتے ہیں۔ گلہ سے الگ ان کی اپنی کوئی زندگی اور اپنا شخصی وجود نہیں ہوتا ( سید قطب، الاسلام ومشکلات الحضارۃ طبع اول، ( بیروت۔ القاہرہ: دار الشروق 8819 صفحہ 174 ) بلکہ انسان تو ایک الٰہی عطیہ ہے جس کو اللہ نے احسن تقویم پر پیدا کیا ہے اور زمین میں اُس کا ایک فریضہ مقرر کر دیا ہے کہ اُس کو' زمین میں خلیفہ' اور' اس کا امین بنایا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

**واذ قال ربک للملائکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ** (البقرۃ:30) اور ( وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے ) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں ( اپنا ) نائب بنانے والا ہوں۔ اور ہو الذی جعلکم خلائف الارض: اور وہی ہے جو تم کو زمین کا خلیفہ بناتا ہے (الانعام:165) اِن

آیات کی تفسیر رسول اللہ ﷺ نے یوں کی ہے: **ان اللہ جعل الارض حلوة خضرة وان اللہ مستخلفکم فیھا فینظر کیف تعملون**: اللہ تعالی نے زمین کو میٹھا و سرسبز و شاداب پیدا کیا ہے وہ اس میں تم کو بااقتدار بنا کر یہ دیکھے گا کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو (مسلم نے ابوسعید خدریؓ کی احادیث میں بیان کیا ہے ،کتاب الذکر والدعاء والتوبہ والاستغفار، باب اکثر اہل الجنۃ الفقراء: حدیث نمبر:2742 جلد ۴ صفحہ 2098)۔

تو زندگی میں انسان کی حرکت کی اصلیت یہی ہے۔ اِس حرکت انسانی کو راغب اصفہانی نے مجملا یوں بیان کیا ہے کہ دنیا میں انسان کے تین کام ہیں: زمین کو آباد کرنا جیسا کہ فرمایا: **ہوانشاکم من الارض واستعمرکم فیھا**: اسی نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور اس میں آباد کیا تو اس سے مغفرت مانگو (ھود:61)۔

یعنی اپنے اور غیروں کے لیے معاش تلاش کرنا اور اللہ کی عبادت کرنا جس کو یوں بیان کیا ہے: **وماخلقت الجن والانس الالیعبدون**: اور میں نے جن و انس کو محض اپنی عبادت کے لیے ہی پیدا کیا ہے (الزاریات:56) اس کا مفہوم ہے کہ خدا کی پرستش اور اُس کے امر و نہی کی بجا آوری اور اس کی خلافت کا فرض انجام دینا جس کو اِس آیت میں بیان کیا ہے: **ویستخلفکم فی الارض فینظر کیف تعملون** (اعراف:129) وہ زمین میں کو تم کو بااقتدار کر کے یہ دیکھے گا کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو۔ یعنی سیاست میں انسانی طاقت کے بقدر اللہ کی اطاعت سے، مکارم شریعت کے استعمال سے۔ اور مکارم شریعت میں یہ چیزیں آتی ہیں: حکمت، لوگوں میں عدل و انصاف کا اور احسان و عتدال اور فضل کا قیام، جس کا مقصد حصول جنت اور اللہ کا قرب ہے (ملاحظہ ہو الذریعة الی مکارم الشریعة، تحقیق ابوالیزید، ابوزید العجمی، طبع ا۔ (القاہرة، دار السلام للطباعة والشریعة والترجمة 2007) صفحہ 83-82 راغب نے گرچہ ان کو تین افعال بنا دیا ہے، مگر ہم اِن کو ایک ہی کام سمجھتے ہیں، جس کو تابع خلافت کا نام دیا جا سکتا ہے)۔

## استخلاف کا مفہوم:

استخلاف (خلیفہ بنانا) اسلام کی تہذیبی تشکیلی قدروں میں محوری و اساسی قدر ہے (اکثر علماء

اسلام کی رائے یہ ہے کہ ’’خلافت‘‘ کا معنی یہ ہے کہ انسان کائنات کے نظم وتعمیر حیات میں اللہ تعالیٰ کی منشاء کے مطابق اُس کی نیابت کررہا ہے۔اِس میں وہ اُسی سے مدد لیتا ہے۔اوراسی کی اقتداء کرتا ہے۔اور یہ خلافت خلافت ربانی ہے۔یعنی اللہ نے انسان کی تکریم واعزاز کے لیے اُسے خلافت دی ہے،ورنہ اللہ کو اِس کی ضرورت تھی نہ احتیاج،دیکھیں،راغب اصفہانی المفردات،صفحہ:156اس بارے میں بحث کے لیے دیکھیے،مفتاح دارالسعادۃ،ابن القیم 1/151اوراس کے مابعد دیکھیں) یہ **ایسا اسلامی تصور ہے جوایک طرف کوانسان کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کواور دوسری طرف کائنات اور عالم اشیاء سے انسان کے تعلق کواور تیسری طرف انسان کے دوسرے انسانوں سے تعلق کومربوط ومتعین** کردیتا ہے (چنانچہ اسلامی تہذیب میں اساس اللہ سے شروع ہوتی اوراسی پرختم ہوتی ہے۔اوراسی سے اسلام کی تہذیبی اساس مغربی تہذیبی اساسات سے الگ ہوجاتی ہے کہ اسلام کی تہذیب استخلاف کے’’مسلمہ‘‘پر قائم ہے یعنی انسان کا تعلق انسان سے،کائنات سے اوراللہ سے صحیح طور پر قائم ہو۔اورمغربی تہذیبی اساس تین مسلمات پر قائم ہے پہلا مسلمہ دیکارٹ کا ہے۔جس کی بنیاد پر انسان کائنات کا مالک ہے۔اور ہابس کا نظریہ جس کے مطابق انسان دوسرے انسان کے لیے بھیڑیا ہے۔اور مارلو کا نظریہ جس کے مطابق جو انسان اپنی عقلی صلاحیتوں کو بڑھا لیتا ہے وہی تمام عناصر پر غالب آجاتا اور حکومت کرتا ہے۔جو اِن تین عناصر کے ذریعہ انسان کی اعلی اقدار کا خاتمہ کردیا گیااور مطلق قدروں کا انکار کردیا گیا۔تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں۔راجر گارودی الاسلام والحداثۃ،ترجمہ،دالعربی کشاط یہ مقالہ الدور الحضاری لامۃ المسلمۃ فی عالم الغد طبع اول (قطر:وزارۃ الاوقاف والشؤون الاسلامیۃ کے مضامین میں شامل ہے۔1421ھ 2000 صفحہ 168) **یعنی وہ حقیقت ِوجود،کائنات،انسان اورزندگی سب کے بارے میں ایک جامع تصور ہے۔تو خلافت دینے والا اللہ تعالیٰ ہے،جس کوخلافت دی گئی وہ انسان ہے اورجس چیز کی خلافت دی گئی وہ کائنات اوراشیاء کائنات ہیں۔اس معنی میں استخلاف ایسا تصور ہوا جوزندگی میں انسان (خلیفہ) کے عمل کی نظریہ سازی کرتا ہے اوراس کا اطلاق دومعنوں پرہوتا ہے:**

**ا۔پہلے یہ:** کہ انسان آزاد خلیفہ ہے ایک انسان کی دوسرے پرکوئی حکمرانی سِرے جائز ہی نہیں۔لہٰذا تحکم،استحصال اورغلبہ کی تمام صورتیں غلط ہیں۔نہ کوئی مالک ہے نہ آقا اورخدا تعالی کے سِوا اس کائنات میں الٰہ اورفرماں رواہے اورساری قدریں ہر حال میں اُسی کی طرف راجع

ہیں اور انسانی سرگرمیوں میں ایک دائمی اور فعال حرکت کارفرما ہے۔فرمایا: وہ اللہ ہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے قابو میں کردیا تا کہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تا کہ تم اس کے فضل سے (معاش تلاش کرو اور تا کہ شکر کرو اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنے (حکم) سے تمہارے کام میں لگادیا۔جو لوگ غور کرتے ہیں ان کے لیے اس میں (قدرتِ خدا کی) نشانیاں ہیں (الجاثیۃ:13-12)۔

**دوسری بنیاد:** یہ ہے کہ اس حرکت میں انسان کا کردار خلیفہ اور امین ہونے، اس کے ساتھ معاملہ کرنے اور اللہ کے احکام کو بجالانے والے منہاج کے مطابق ''اداء واجب'' کا ہے۔انسان اور کائنات کے مابین جو رشتہ بھی پیدا ہوتا ہے وہ جوہری طور پر وہ رشتہ نہیں جیسا کہ رشتہ مالک کا مملوک کے ساتھ ہوتا ہے۔بلکہ وہ وہ رشتہ ہے جو امین کا اپنی امانت سے ہوتا ہے۔اور انسان و انسان کے مابین جو بھی رشتہ پیدا ہوتا ہے اُس کا اجتماعی طور پر جو بھی مرکز ہو تو وہ استخلاف اور تعامل باہمی کا رشتہ ہے کہ جتنا بھی کوئی انسان اپنے فرض کو ادا کرے گا اس خلافت و باہمی معاملہ کا زیادہ حقدار ہوگا۔تو یہ رشتہ آقائی، الوہیت یا مالکیت کا رشتہ نہیں ہے (المدرسۃ القرآنیہ صفحہ 129)۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ استخلاف کے مفہوم میں انسان عبادت گزار و جواب دہ ہے اور اُسے ہمیشہ اللہ کے ارادہ وقدرت کا استحضار رہنا چاہیے۔کائنات اُس کے تصرف میں تعمیر کے لیے دی گئی ہے۔اُسے اس پر مسلط، قاہر، حاکم اور اس پر حملہ آور نہیں بنایا گیا۔لہٰذا ہر مادی چیز یا مادی آسائش کے بدلہ میں اس کو غلام اور ذلیل نہیں بننا چاہیے۔انسان کا کردار زمین میں قیادت کا کردار ہے۔وہی زمین میں تبدیلیاں لاتا ہے۔پیداوار کے وسائل اور پیداوار کی تقسیم انسان کے اپنے پیچھے ذلیل ومحتاج کی طرح نہیں چلا سکتے جیسا کہ مادی مذاہب اس کو پیش کرتے ہیں۔

جو کہ انسان کے رول اور اس کی قدر و قیمت کو گھٹا کر مشینوں اور آلات کی قیمت کو بڑھاتے ہیں (فی ظلال القرآن 1/60) زندگی میں ہر وہ سرگرمی جو اس مقصد ''خلافت'' کے منافی ہو وہ ناکام ہوگی

،فساد،ظلم اورانسان کے ضیاع کا سبب ہوگی۔وہ انسان کو دنیا کے یا آخرت کے یا دونوں ہی کے عذاب میں مبتلا کرے گی۔

میرے تجزیہ وتحقیق کے مطابق خلافت کا تصور چند بڑے زمروں میں تقسیم ہے: ہرزمرہ ایک 'قدر' ایمانی بُعد اور عمل کی منطق کی ترجمانی کرتا ہے۔جن کو اگر مسلمان شعوری جدوجہد میں بدل لے تو وہ اُس کی تفکیر،اس کی تحریک اور اس کی کوشش میں اثر انداز ہوں اور وہ اس تصور'خلافت' کو زندگی کو آگے بڑھانے والے کسی بھی نظریہ سے مختلف وممتاز کردیں۔یہ زمرے درج ذیل ہیں:

### اولا: تابع خلافت:

زمین میں انسان کی خلافت،خلافت مطلقہ نہیں بلکہ تابع خلافت ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ''زمین میں عبادت الٰہی'' کی تکمیل زندگی کے چھوٹے بڑے امور میں اللہ تعالیٰ کی منشاء ومراد کے مطابق ہو۔یہیں سے اللہ تعالیٰ کی صفات یعنی عدل،علم،قدرت مظلوموں پر رحمت،ظالموں سے انتقام اور اسی طرح زندگی کے مقاصد کا فہم؛ اوراس کی حرکت ومحرکات کا فہم اور حق وعدل کی اقامت اور زمین میں کمزوروں پر رحم کرنا اور توحید ربانی کو پھیلانا اور پوری زندگی کو توحید کے تابع کردینے کا الوہی حکم،یہ سب کی سب وہ قدریں ہیں جو خلافت والی سوسائٹی میں غالب ہوں گی۔اور یہ قدریں خلیفہ یعنی انسان کے اہداف قرار پائیں گی جن کو وہ پورا کرے گا۔اور یہ ضروری ہوگا کہ انسان اپنے معاملات میں ان اہداف کے تابع ہو اور خدا کا مطیع وفرمانبردار ہو۔اسی طرح خلق خدا کے ساتھ معاملہ کرنے میں بھی اس کا یہی رویہ ہو۔

اسی معنی میں امام شاطبیؒ کا کہنا ہے کہ: انسان یعنی خلیفہ سے مطلوب یہ ہے کہ وہ اُس ذاتِ حق کی نیابت کرے جس نے اس کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔اور اس کے احکام ومقاصد کی تکمیل کرے (ملاحظہ ہو الموافقات 2/332) اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کائنات کی آبادکاری اور قیادت کی اپنی جدوجہد میں اجتماعی وطبیعی سطح پر خلافت کی قدروں کی رہنمائی میں کام کرے۔جو کہ انسان کو اس فلسفہ کا

فریم دیتی ہیں جو جامع وکلی فلسفہ ہے اور انسان کو اعزاز دیتا ہے۔اور جو انسانیت کی خیر وفلاح کے لیے کائنات وطبیعت کی تسخیر اور آباد کاری کی تعلیم دیتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان زمین پر اپنی سرگرمیوں میں اپنی خواہش پر چلنے کے لیے آزاد نہیں ہے کہ خواہش تو زیادہ تر فساد کی طرف لے جائے گی اسی طرح نہ اُس کو یہ آزادی ہے کہ وہ اللہ کی رہنمائی سے الگ ہو کر اجتہاد کرلے جس نے اُسے پالا پوسا اور خلیفہ بنایا۔بلکہ وہ اپنی ہر مادی ومعنوی جدوجہد میں خدارخی ہوگا۔اس کے لیے ضروری ہوگا کہ اللہ کی منشاومراد کو پہچانے ،اُسی کی مرضی کو چاہے اور اس کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرے۔اسی معنی میں انسان انفرادی ،اجتماعی اور مادی ومعنوی تمام تر سرگرمیوں میں جو کچھ بھی کرے گا وہ سب اللہ کی عبادت شمار ہوگا۔اور اِسی معنی میں اسلامی تمدن کو ایک خاص بُعد ملتا ہے جو اُسے تمدن کے دوسرے تمام طریقوں سے ممتاز کرتا ہے۔کہ یہ بُعد ان سب چیزوں کو اللہ کی عبودیت کے ذیل میں لے آتا ہے۔لہٰذا اسلامی تمدن اپنے تمام عناصر ومظاہر میں اللہ کی طرف جاتا ہے ،اور جتنا زیادہ وہ اللہ سے قریب ہوگا اتنا ہی وہ ارتقاء کرے گا اور جتنا اُس سے دور ہوگا اتنا ہی وہ تنزل کا شکار ہوگا۔

ہم نہیں جانتے کہ اِس مخصوص معنی میں کوئی دوسری تہذیب اسلامی تہذیب کی ہم سری کرتی ہے (عبدالمجید النجار، الشہود الحضاری للامۃ الاسلامیۃ فقہ التحضر الاسلامی، طبع ا (بیروت: دار العرب الاسلامی 1999ھ 1/52)

اس کا معنی یہ ہے کہ تمدن اور تہذیبی وجود کی اساس اپنی ایمانی واخلاقی بنیادیں اور ثقافتی وعرفانی اور جمالی وفنی اور تکنیکی ومادی اساسات اِسی کلی اور ثابت شدہ نظریہ سے اخذ کرتی ہیں۔تو اسلامی تہذیبی بناء میں اللہ عزوجل ہی تمام انسانیت کا ہدف اور زمین پر اس کے تہذیبی تحرک کی غایت ہے۔جو محنت اور جدوجہد سے اُسی کی طرف رواں دواں ہے۔اور کوشش کرتی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء وصفات (بعض صوفیاء اُس کو 'اللہ کے اخلاق اختیار کرنے کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں اور اس بارے میں ایک 'اثر' تخلقو ابا خلاق اللہ' سے استدلال کرتے ہیں۔لیکن یہ اثر باطل ہے جیسا کہ ابن القیم نے مدارج السالکین 3/241 میں بیان کیا ہے۔اُس سے قریب قریب یہ روایت ہے'' ان للہ تعالی مئۃ خلق من اتی بو احد منہا دخل الجنۃ ملاحظہ ہو: عمدۃ القاری

1/125 کنز العمال 1/33 فیض القدیر 2/482 یہ حدیث کمزور ہے دیکھیں الکامل فی ضعفاء الرجال 5/297 علل الدارقطنی میں ہے کہ وہ غیر ثابت ہے۔/383) سے آراستہ ہو اور بقدر امکان اس کے کمالات سے فیضیاب ہو (ملاحظہ ہو: الامام ابوحامد الغزالی (المقصد الاسنی صفحہ 46-45 جہاں انہوں نے اسماء الٰہی کے معنوں سے مقربین کے فیوض پر گفتگو کی ہے) کیونکہ خلافت والی سوسائٹی میں یہی مضبوط قدریں انسان (خلیفہ) کے اہداف شمار ہوں گی۔ جب بھی انسان اس ہدف کی طرف قدم بڑھاتا ہے، اور اس میں کچھ کامیابی حاصل کرتا ہے تو اس کے سامنے نئے اور وسیع آفاق کھل جاتے ہیں، اور اِس راستہ میں چلنے کے لیے اس کی عزیمت و ہمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ انسان اپنی حدیں رکھتا ہے اور اللہ تعالی لامحدود ہے، جس کا پانا اس کے لیے مشکل ہے۔ لیکن جتنا جتنا وہ اس راستہ میں آگے بڑھے گا اسے نئے نئے راستے ملیں گے، اور وہ مزید کوشش کرے گا۔ اور اسے یہ احساس رہے گا کہ وہ ہمیشہ اللہ کا محتاج ہے۔

یعنی وہ جو چیز بھی دیکھے گا اس میں حق کو دیکھے گا، کسی چیز کو نہیں بھی جانے گا تو بھی اس میں اللہ کا جلوہ دیکھے گا۔ اس میں حق کو دیکھے گا، جس کسی بھی چیز کو جانے گا اس میں اس کو خدا کی شان نظر آئے گی۔ اس سے انسانوں کی تہذیبی حرکت میں نہ ختم ہونے والا ایندھن ملے گا۔ وہ جس راستہ پر چلے گا اُس کا آغاز اللہ سبحانہ وتعالی ہے جو زندگی دیتا ہے اور اس کا انجام بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے جو موت دینے والا ہے۔

**ثانیا: زندہ جدوجہد:** (زندہ جدوجہد نتیجہ ہوتی ہے قرآن وسنت کے احکامات پر فعال انداز میں عمل کرنے کا۔ یہ مفہوم مستفاد ہے ارشاد الٰہی: اے ایمان والو اللہ ورسول تم کو جس زندگی بخش بات کی طرف بلا رہے ہیں اس کو قبول کرو (الانفال: 27) سے جو جدوجہد بھی اللہ ورسول سے ملتی ہے، جس میں زندگی کو دین سے جوڑا گیا ہے جس میں شریعت کی بالادستی ہو اس کے احکام کا نفاذ ہو وہ یقیناً انسان کے لیے زندگی بخش چیز ہے) زندہ جدوجہد سے مراد ہر وہ جدوجہد ہے جو کائنات میں کی جائے اور جس کا مقصد اللہ کے کاموں اور اس کی صفات کو جاننا ہو، جس میں توفیق الٰہی اور الٰہی مدد چاہی جائے۔ جس میں ایمانی اقداری نظام کو وسیلہ بنایا جائے اور علم کو اخلاق سے، عقل کو غیب سے، دنیا کو آخرت سے حقیقی طور پر جوڑا جائے تو وہی اللہ تعالی کی حقیقی عبودیت ہوگی۔ ایک بار صحابہؓ نے ایک

شخص کی بہادری وپھرتی کو دیکھ کر رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ اس شخص کی بہادری اللہ کے راستہ میں ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''اگر یہ شخص اپنے چھوٹے بچوں کے لیے روزی کمانے نکلا ہے تو بھی اللہ کے راستہ میں ہے، اگر یہ اپنے بوڑھے ماں باپ کے لیے کمانے نکلا ہے تو بھی اللہ کے راستہ میں ہے، اوراگر یہ اپنے لیے کمانے نکلا ہے تا کہ عفت کی زندگی گزارے تو بھی اللہ کے راستہ میں ہے۔

لیکن اگر وہ ریا وفخر کے لیے نکلا ہے وہ شیطان کے راستہ میں ہے (حدیث کو کعب بن عجرہ نے روایت کیا ہے، ہیثمی نے مجمع الزوائد 4/325 میں کہا ہے کہ اس کو طبرانی نے اپنی تینوں کتابوں میں روایت کیا ہے، اوراوسط وکبیر میں جوراوی ہیں وہ صحیح کے راوی ہیں، اسی کے مثل البیہقی نے سنن الکبری میں روایت کیا ہے) یہی اللہ کے قول ومن اراد الآخرۃ: اور جو شخص آخرت کا خواہستگار رہوا اوراس میں اتنی کوشش کی جتنی اسے لائق ہے اوروہ مومن بھی ہوتو ایسے ہی لوگوں کی کوشش ٹھکانے لگتی ہے (الاسراء: 19) کا مفہوم ہے اوراس کا تقاضا بھی ہے۔ یہ زندہ جدوجہد تہذیب کے کاموں میں ایک اساسی قاعدہ ہے، کیونکہ اس میں تسلسل ہے، اور ہمیشہ دینا ہے اور ایسی فعالیت ہے جس کو موت نہیں آئے گی، یعنی وہ حرکت کو کنٹرول کرنا ہے اوراس کے دوام وتسلسل کو برقرار رکھنا ہے۔

اس سے انسان کی حرکت کو ایک غایت ومقصد ملتا ہے کہ انسان زندگی کے اپنے نظریہ کو وسیع کرتا ہے، اس کو محض دنیا اوراُس کی مادی لذتوں پر ہی منحصر نہیں سمجھتا بلکہ اس کے پیچھے ایک وسیع اور باقی رہنے والی زندگی کو مطمح نظر بناتا ہے، جس میں کوئی تکان اور مشقت نہیں۔ وہ زندگی کو آخرت کی کھیتی سمجھتا ہے جسے تبھی حاصل کیا جاسکتا ہے جب اللہ کی مرضی کو ترجیح دی جائے۔ اس سے انسان کا نقطۂ نظر وسیع اور گہرا ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے مصالح اور مفادات پر گہری نظر رکھتا ہے، اس کے حساب میں سارے مصالح اور مفادات برابر ہوجاتے ہیں اوراس کے تصور میں انفرادی واجتماعی قدریں یکساں ہوجاتی ہیں۔ جن کو اپنا مقام ملتا ہے اور نفع ونقصان کا پیمانہ اللہ کی مرضی ٹھیرتی ہے۔ تو اگر اس کے بعض حقوق اور آزادیوں میں کوئی کمی آئے تب بھی فائدہ ہی محسوس کرتا ہے اور یوں جلدی کے بعض فائدوں کو بھی انجام کے لحاظ سے حقیقی نقصان ہی سمجھتا ہے۔ کہ اس کو دنیوی زندگی کی ہر حرکت وعمل کا

آخرت میں اجرِعظیم ملے گا۔

جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا: من کان : جو شخص دنیا (کی آسودگی) کا خواہشمند ہو تو ہم اس میں سے جسے چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں جلد دے دیتے ہیں پھر اس کے لیے جہنم کو (ٹھکانا) مقرر کر رکھا ہے، جس میں وہ نفریں سن کر اور (درگاہ خدا سے) راندہ ہو کر داخل ہوگا۔ اور جو شخص آخرت کا خواہستگار رہوا اور اس میں اتنی کوشش کرے جتنی اسے لائق ہے اور وہ مومن بھی ہو تو ایسے ہی لوگوں کی کوشش ٹھکانے لگتی ہے (الاسراء :19-18)۔

یعنی بندہ اللہ تعالیٰ کو جو کچھ بھی پیش کرے گا اس سے بہت بہتر بدلہ میں پائے گا۔ جس کی بنیاد یہ ہے کہ ''جو اللہ کے لیے کچھ چھوڑے گا اللہ اُس کو اس سے بہتر بدلہ دے گا''۔ اِس کی اصل وہ حدیث ہے جو مسند امام احمد میں حضرت ابوقتادہؓ اور ابوالدہماءؒ سے مروی ہے کہ دونوں نے فرمایا: ہم دونوں اہل بادیہ میں سے ایک آدمی کے پاس آئے اور اس سے ہم نے کہا: کیا تم نے رسول اللہ ﷺ سے کچھ سنا؟ اس کہا: ہاں میں نے اللہ کے رسول کو فرماتے سنا کہ: ''تم اللہ عزوجل کے لیے کوئی چیز بھی چھوڑو گے تو اللہ تمہیں اس کے بدلہ میں اُس سے بہتر چیز دے گا (مسند امام احمد 5/363 حدیث نمبر:23124)

زندگی کی قدروں کے مادی فہم کی صورت میں تو یہ ہو نہیں سکتا، بلکہ اسلام کے ہی سایہ میں ہوسکتا ہے جو مسلمان کے اندر تقوی وورع، ایثار، تصحیح نیت، نفس سے انصاف کرنے اور ایمانی شعور کی بیداری جیسی قدروں کی آبیاری کرتا ہے۔ اسلامی تہذیب کی تعمیر کی یہ زندہ جدوجہد مغربی طرز کی جدوجہد سے بالکل مختلف ہے۔ جس کی جڑ مادی ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے بالکل کٹی ہوئی ہے کہ اس کو اپنی غایت نہیں بناتی اور نہ اس کے عطا کردہ منہاج کو وسیلہ بناتی۔ اس کے آفاق مادی جڑوں سے گھرے ہیں، کہ وہ ''ظواہر کو ماننے''، معانی کو بدلنے، خواہشات ورغبات کی تکمیل پر استوار ہے۔

اور مادیت میں بھٹکنے، اپنے خالق سے انقطاع اور ظلم وعدوان اور لوگوں کے مال چھیننے اور زمین سے چمٹنے جیسی چیزوں پر قائم ہے۔ یہ ایسے امور ہیں جن میں روحانی ارتقاء ممکن ہی نہیں،

یہاں تک کہ ان کی جدوجہد کو "مردہ جدوجہد" بھی کہا جاسکتا ہے (جیسا کہ اللہ تعالی کے قول او من کان میتا فاحییناہ و جعلنا لہ نورا یمشی: کیا بھلا وہ جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور اس کے لیے روشنی کر دی جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے کہیں اس شخص جیسا ہوسکتا ہے جو اندھیرے میں پڑا ہوا ہو اور اس سے نکل ہی نہ سکے اسی طرح کافر جو عمل کر رہے ہیں وہ انہیں اچھے معلوم ہوتے ہیں (الانعام: 122) سے مستفاد ہوتا ہے) کہ اس کی کوشش کرنے والا ہلاکت کی طرف جاتا ہے، یا جمود کی طرف۔ اور اُس کی مثال مردار اور قبر میں مدفون کی طرح ہوتی ہے۔ اس جدوجہد میں لگے لوگ جلد ہی یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا عمل انتہا کو پہنچ گیا اور اس کے مقاصد پورے ہوگئے۔ اب امیدیں ختم ہوجاتی ہیں اور زندگی کو حرکت دینے والا ایندھن بھی ختم ہوجاتا ہے۔

اور قلق، رنج اور زندگی سے مایوسی پیدا ہوتی اور ہر چیز سے معنی کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اسی قسم کی جدوجہد کو اسلامی نقطہ نظر سے "دنیوی زندگی کی ٹیپ ٹاپ کہہ دیتے ہیں"۔ کیونکہ وہ اپنے لوگوں کے لیے وبال جان بن جاتی ہے (اس بارے میں گارودی کہتے ہیں: سائنس اور ٹیکنالوجی انسانی مقاصد کی خدمت کے زبردست وسائل ہیں لیکن حکمت سے الگ کر کے اور مقاصد میں غور نہ کر کے کوئی بھی سائنس اور وسائل کی تنظیم انسان کے لیے تباہ کن آلات بن کر رہ جاتی ہے۔ وعود الاسلام صفحہ: 111) جیسا کہ فرمایا: المال والبنون زینۃ الحیاۃ الدنیا: مال اور بیٹے تو دنیا کی زندگی کی (رونق) و زینت ہیں۔ اور نیکیاں جو باقی رہنے والی ہیں وہ ثواب کے لحاظ سے تمہارے پروردگار کے ہاں بہت اچھی اور امید کے لحاظ سے بہت بہتر ہیں (الکہف: 46) اور فرمایا: انما مثل الحیاۃ الدنیا۔ دنیا کی زندگی کی مثال مینہ کی سی ہے کہ ہم نے اس کو آسمان سے برسایا، پھر اس کے ساتھ سبزہ جسے آدمی اور جانور کھاتے ہیں مل کر نکلا یہاں تک کہ زمین سبزے سے خوشنما اور آراستہ ہوگئی اور زمین کے سبزے والوں نے خیال کیا کہ وہ اس پر پوری دسترس رکھتے ہیں ناگہاں رات کو یا دن کو ہمارا حکم (عذاب) آ پہنچا تو ہم نے اس کو کاٹ (کر ایسا کر) ڈالا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ جو لوگ غور کرنے والے ہیں۔ ان کے لیے ہم (اپنی قدرت کی) نشانیاں اسی طرح کھول کھول کر بیان کرتے ہیں (یونس: 24) اسی طرح اس کو تنگ حالی کی زندگی بھی کہا جاتا ہے،

فرمایا:: ومن اعرض: اور جو میری نصیحت سے منہ پھیرے گا اس کی زندگی تنگ ہوجائے گی اور قیامت کو ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے (طہٰ :124)۔

تو انسان جو محض دنیوی زندگی کے پیچھے بھاگتا ہے جو قرآن کی زبان میں تنگ زندگی ہے تو اس رنگ میں اس کی جدوجہد فی الحقیقت رائگاں جدوجہد ہے، اس میں بلند اقدار کا گزر نہیں۔ اس کے مقاصد محدود، امیدیں قلیل اور نظر قاصر و محدود ہے ،لہٰذا وہ ضائع ہے اور سرگردانی کا شکار ہے (قرآن کا قاری ادراک رکھتا ہے کہ وہ امت جو محدود نقطہ نظر اور مستقبل کی قاصر نظر رکھتی ہے وہ چار مرحلوں سے گزرتی ہے۔ پہلہ مرحلہ میں وہ فعال رہتی ہے مگر دوسرے میں وہ اپنی اقدار کو بجائے اچھے کارناموں کا ذریعہ بنانے کے ان کو بت بناڈالتی ہے ،اور ان کے علمبردار قائد نہیں بلکہ ایسے متکبر بڑوں میں بدل جاتے ہیں جو سب کو اپنا غلام بنانا اور اپنے پیچھے چلانا چاہتے ہیں، جدت واختراع میں وہ کسی کو اپنے ساتھ چلنے کی اجازت نہیں دیتے، تیسرا مرحلہ اِن لوگوں کے تاریخی امتداد کا ہوتا ہے اور چوتھے مرحلہ میں آتے آتے وہ امت اپنی قدروں کو بھول جاتی ہے، اس پر مجرم مسلط ہوجاتے ہیں، وہ گمراہی میں بھٹکتی ہے اور اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں پاتی۔ دیکھیے محمد باقر الصدر، المدرسۃ القرآنیۃ صفحہ 143 اور مابعد)۔

جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اِن دونوں قسموں میں تقابل کرتے ہوئے فرمایا: **من كانت الآخـــرة** : ایسا شخص کہ جس کی ساری فکر آخرت ہو اللہ اس کے دل کو غنی کردیتا ہے (اس کی تخریج ترمذی نے بروایت انس بن مالک ؓ سنن ترمذی میں کی ہے 4/642 حدیث نمبر:2465) یہ دراصل فرمان الٰہی **من كان يريد**۔ جو شخص آخرت کی کھیتی کا خواستگار ہو اس کو ہم اس میں سے دیں گے، اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا (الشوریٰ: 20) اور اللہ کے **قـــــول الـذين آمنوا** (یعنی) جو لوگ ایمان لائے اور جن کے دل یاد خدا سے آرام پاتے ہیں (ان کو) اور سن رکھو کہ خدا کی یاد سے دل آرام پاتے ہیں (الرعد:28) کی تفسیر ہے، جس تک تبھی پہنچا جاسکتا ہے جب عقل شریعت کے نور سے جگمگائے اور اللہ تعالیٰ پر مکمل اعتماد ہو (تفصیل النشأتین صفحہ 139)۔

## ثالثا: ذمہ دارانہ سرگرمی

تو اگر خلافت کا متوازن اور جامع مفہوم یہ معنی رکھتا ہے کہ دنیا کی تعمیر اللہ کی سنتوں اور اُس

کے منہج کے مطابق ہواور انسان کو زمین کی تمام نعمتوں سے فیضیاب ہونے کا موقع ملے جیسا کہ اُس کا یہ بھی معنی ہے کہ انسان خود اپنے لیے راستہ اختیار کرے تو اِس مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ انسان ذمہ دار ہے اور جواب دہ ہے۔ بلکہ خلافت مبنی ہی مسئولیت پر ہے۔ جیسا کہ فرمایا: بل الانسان: بلکہ انسان آپ اپنا اپنا گواہ ہے۔ اگرچہ عذر معذرت کرتا ہے (القیامۃ:15-14) تو استخلاف جو زندگی کو حرکت دینے کا ایک منہج ربانی ہے، وہ اسی وقت کارفرما ہوگا جب انسان کائنات، انسانوں، ذی روحوں اور زندگی کے تئیں اپنی ذمہ داری محسوس کرے گا اور جب اُسے یہ شعور ہوگا کہ وہ زندگی میں جو بھی چھوٹا بڑا کام کرے گا اس کا ثواب یا سزا ملے گی۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک عورت ایک بلی کی وجہ سے جہنم میں داخل ہوئی جس کو اُس نے باندھ لیا تھا، نہ تو اس کو خود کھلایا اور نہ اُسے چھوڑا کہ وہ خود زمین کی گھاس پھوس کھا کر زندہ رہتی (متفق علیہ، بخاری نے اس کی تخریج کتاب بدء الخلق میں کی ہے حدیث نمبر: 3140 اور مسلم نے باب فی سعۃ رحمۃ اللہ تعالی وانھا سبقت غضبہ میں کی ہے حدیث نمبر 2619) مزید فرمایا: اگر قیامت آجائے اور تم میں سے ایک کے ہاتھ میں پودہ ہو تو جتنا جلد ممکن ہو اُسے لگا دے (امام احمد نے اس کی تخریج مسند میں کی ہے بروایت انس بن مالک 33/197 حدیث نمبر 13004 امام بخاری نے ادب المفرد میں کی ہے 1/186 حدیث نمبر: 479) امام مناویؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: اِس میں یہ تنبیہ ہے کہ مومن کو ہمیشہ یہ احساس وشعور رہے کہ وہ اللہ کی مسلسل نگرانی میں ہے۔ اللہ نے اُس کی مدت متعین کر دی ہے۔ اس لیے وہ خلوت کے اوقات میں بھی رب تعالیٰ سے زیادہ ڈرنے والا اور زیادہ خشیت رکھنے والا ہوتا ہے جتنا کہ وہ جب رکھتا ہے جب جماعت کے ساتھ ہوتا ہے (فیض القدیر 2/12) اس کے بغیر شریعت اور منہاج کا التزام بغیر کسی ضابطہ اور مقصد اور غایت سے خالی ہوگا۔

آدمی دنیا میں جو کچھ کرتا ہے اس میں اُس کی ذمہ داری کو رسول اللہ ﷺ نے اِس طرح بیان کیا ہے: عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور اپنی ذمہ داری کے بارے میں اُس سے سوال ہوگا، چنانچہ امام المسلمین رعایا کے بارے میں

جواب دہ ہوگا، آدمی اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے۔

اوراس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا، خادم اپنے مالک کے مال کا ذمہ دار ہے اوراس سے اس کے بارے میں سوال ہوگا، عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: آدمی اپنے باپ کے مال میں ذمہ دار ہے اس سے اس کے بارے میں سوال ہوگا اورتم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی حیثیت میں ذمہ دار ہے اوراپنی ذمہ داری کے بارے میں اس سے پوچھ گچھ ہوگی (متفق علیہ الفاظ بخاری کے ہیں) یہ حدیث بیان کرتی ہے کہ جیسا کہ ابن حجر کہتے ہیں کہ ہرمومن ایک اعتبار سے ذمہ دار ہے اورایک اعتبار سے رعیت ہے یہاں تک کہ اگراس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہوتو وہ اپنے اعضاء وجوارح کا ذمہ دار ہوگا اوران کے ذریعہ اللہ کے اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی کا ذمہ دار ہوگا()۔

حضرت ابوبرزہ اسلمیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: قیامت کے دن بندہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے گا جب تک اُس سے یہ نہ پوچھ لیا جائے گا کہ عمر کس چیز میں لگائی، علم کا کیا استعمال کیا، مال کہاں سے کمایا اور کس چیز میں خرچ کیا اورجسم کو کس چیز میں لگایا؟ (اس کی تخریج امام ترمذی نے کی ہے اورکہا کہ یہ حدیث جسن صحیح ہے سنن الترمذی، 4/612 حدیث نمبر 2417) اس حدیث سے بھی مسئولیت اورواجب کے احساس کو یاددلایا گیا ہے جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں بھی آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ذمہ دار سے اُس کی رعیت کے بارے میں پوچھے گا کہ اُس کی حفاظت کی یا اسے ضائع کردیا یہاں تک کہ آدمی سے اس کے گھر والوں کے بارے میں بھی پوچھا جائے گا (صحیح ابن حبان 10/245 حدیث نمبر 4493 سنن نسائی الکبری 5/347 حدیث نمبر 9173 امام مناوی نے فیض القدیر میں 2/238 لکھا ہے کہ ایک روایت میں مزید یہ اضافہ ہے: تو اس سوال کا جواب دینے کی تیاری کرلو، لوگوں نے پوچھا اوراس کا جواب کیا ہے؟ فرمایا نیکی اور بھلائی کے کام۔ اس کی تخریج ابن عدی اورالطبرانی نے کی ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے، انہوں نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ مکلّف اپنی ذمہ داری میں کسی شخص کے معاملہ میں کوتاہی کرے گا تو اس سے مواخذہ ہوگا)۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں ذمہ داری کا یہ گہرا احساس تقاضا کرتا ہے کہ

**اولا:** ایجابی طور پر خلافت کی قدروں کا لحاظ کیا جائے ۔یعنی: انسان اپنے رویہ،اعمال اور فکرسب چیزوں کا جائزہ لیتا رہے،اس کے قول وفعل میں تضاد پیدا نہ ہو،اشیاء کا اس کا علم اُسے اللہ کی معرفت سے دور نہ کردے،اوراُس کی معلومات کی کثرت دنیا کی اصلاح سے اسے غافل نہ کردے ،اِس طرح کہ وہ ہر چیز میں عبادت کی روح کومحسوس کرے اوروہ ان تمام اقدار بلنداخلاقیات اوراعلی قدروں کا التزام کرے جن کے احترام کی دین نے تعلیم دی ہے۔اوراس طرح اپنے حقوق ورغبتوں اوراپنے رویوں کومنضبط کرے حتی کہ مخالفین کے تئیں بھی ۔اِسی سے دنیا میں صلاح اورآخرت میں فلاح ملے گی اورسماج میں امن وسلامتی حاصل ہوگی ۔

**ثانیا:** منفی بنیاد پر بھی بندہ کوخلافت کی قدروں کا لحاظ رکھنا چاہیےاوروہ یوں کہ: ہروہ کام کیا جائے جس سے وقوع پذیراورمتوقع کمی کا سدباب ہواوربقدرطاقت وامکان صورتِ حال کومعیاری بنانے کی کوشش کی جائے۔حدیث رسول من رأ منکم منکر ا فلیغیرہ بیدہ تم میں سے جوبھی کسی منکرکو دیکھےاُسے اپنے ہاتھ سے مٹادے اگر یہ نہ کرسکتا ہوتوزبان سے منع کرےاوراگر یہ بھی نہ کرسکتا ہوتودِل سے اسے برا سمجھےاوریہ ایمان کا سب سے کم تر درجہ ہے(مسلم کتاب الایمان) کا مفاد یہی ہے۔

اس شعور سے نفس ہمیشہ بے چین رہے گا اورکوشش کرنے والوں کے ساتھ جوش کے ساتھ شریک ہوگا۔ اورحرکت حیات کا دفاع کرنے والوں کے لیے ہر دم مستعد اور استغفار کرتا رہے گا۔فساد کو مٹائے گا،شخصی مصالح کی اندھی جانب داری نہ کرے گا اوراس رستہ کی پریشانیوں کا بہادری سے مقابلہ کرے گا اوراس سلسلہ میں مقام خلافت کے منافی چیزوں کودورکرے گا۔اوراس بارے میں اس کشتی کے مسافروں کی مثال سے رہنمائی لے گا جو ذمہ اٹھانے کے بارے میں نبی ﷺ نے دی تھی۔جیسا کہ نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ کے حدود کی نگرانی کرنے والوں اوران حدود میں رہنے والوں کی مثال اُس کشتی کے مسافروں کی سی ہے جنہوں نے قرعہ اندازی کی ،بعض اوپر والے حصہ میں بیٹھ گئے اوربعض نیچے والے میں ۔نیچے والوں کو جب پانی کی ضرورت

ہوئی تو وہ اوپر والوں کے پاس گئے اوران سے کہنے لگے کہ ہم نیچے والے حصہ میں سوراخ کر لیں ہمیں پانی مل جائے گا اور آپ کو کوئی زحمت نہ ہوگی؟ اب اگر اوپر والے اِن لوگوں کو ایسا کرنے دیتے ہیں تو سب برباد ہو جائیں گے، اور اگر ان کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں تو سب بچ جائیں گے (بخاری کتاب الشرکۃ)۔

سوم: انسان کو دنیا اور اس کی زیب وزینت کی طرف مائل ہونے سے روکنا۔ کیونکہ خلافت کی قدروں کا لحاظ اور اس پر مبنی ایمانی تصورات اور حق وعدل کی اقامت اور صالح تعمیر نو کے راستہ میں مصائب برداشت کرنے کی دعوت کا عمل تبھی ہوسکتا ہے جب آدمی کو اپنے فرض کا شعور اور ذمہ داری کا احساس ہو۔

ان محرکات کو ہمیشہ ایک رکاوٹ پیش آتی ہے جو ان محرکات کو پیدا ہونے یا پروان چڑھنے سے روکتی ہے۔ یہ رکاوٹ دنیا اور اس کے زیب وزینت کی طرف میلان اور دنیوی زندگی سے چمٹ جانا ہے، جو بھی اس کی شکل ہو۔ کیونکہ دنیا کی فریفتگی اور میلان آدمی کو اکثر جمود میں مبتلا کر دیتا ہے اور تعمیر نو میں حصہ لینے کو روکتا ہے کہ کسی بھی تعمیر نو میں حصہ لینے کا تقاضا ہے کہ ہر قسم کی جدوجہد کی جائے اور قربانی دی جائے اور انسانی معاشرہ کی بھلائی کے لیے خود محرومیوں کو جھیلے۔ اور جو آدمی دنیا اور زخارف دنیا سے چمٹ جائے وہ آسانی سے اُن سے دست بردار نہیں ہوا کرتا اور روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہی الجھا رہتا ہے تعمیر دنیا جیسے بڑے کام کی اسے فکر نہیں ہوتی۔ اسی لیے ایسے عقائدی واخلاقی نظام کی ضرورت ہوتی ہے جو آدمی کی قوتوں کو تعمیر دنیا کے کام میں لگائیں۔ اس کی ایسی تربیت کریں کہ وہ دنیا کا بندہ نہ بنے اس کا مالک بنے۔ آسائشوں کی غلامی نہ کرے ان پر حکم چلائے۔ دنیا کی چھوٹی زندگی سے کہیں زیادہ وسیع آفاق کو ڈھونڈے، اور اس بات پر ایمان رکھے کہ زمین پر دی گئی کسی بھی قربانی کی کوئی قیمت اُس ہمیشہ کی زندگی کے مقابلہ میں نہیں جو اللہ نے اپنے متقی بندوں کے لیے تیار کر رکھی ہے (منابع القوۃ فی الدولۃ الاسلامیۃ صفحہ 6)۔

اور یہیں سے اسلام اس بات کا حریص ہے کہ انسان کو خدا کے نظام اور اس کے حکم کے علاوہ

کسی کے بھی حکم سے آزاد کر دیا جائے ،تو اسلام کے نقطہ نظر سے انسان بالکل آزاد ہے جس کو ابن خلدون نے یوں تعبیر کیا ہے : '' وہ اُس استخلاف کے تقاضے سے جس کے لیے پیدا کیا گیا ہے ، اپنی مرضی کا مالک ہے ، اگر کسی سردار کی ریاست چھن جائے اور اعزاز واحترام سے وہ محروم ہوجائے تو وہ سست پڑ جائے گا یہاں تک کہ اپنا پیٹ بھرنے اور اپنی پیاس بجھانے سے بھی عاجز رہ جائے گا (مقدمہ ابن خلدون، 1/148)۔

جیسا کہ اسلام بھی یہی چاہتا ہے کہ دنیاوآخرت کا صحیح مقام بیان کر دے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کے حالات کا اعتبار آخرت کی مصلحتوں سے ہوتا ہے۔ اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ مسلمان کے شعور میں ان چیزوں کو گہرائی سے ڈال دیا جائے۔ تاکہ وہ یہ جانے کہ دنیا کی جولذتیں چھوٹ جاتی ہیں آخرت کی لذتوں سے ان کو کوئی نسبت نہیں کہ آخرت کی زندگی تو حقیقی زندگی ہے، وہاں جو بدلہ ملے گا وہی حقیقی بدلہ ہوگا۔ اور دقیق لفظوں میں یوں کہیے کہ آخرت ودنیا کے مابین ایک مسلسل جدوجہد ہے ، اور جو جدوجہد ایسی ہوگی کہ جس میں مومن کے دل اور وجدان پر دنیا چھا جائے کہ بس اس کے علاوہ کسی اور چیز کا اس کو ہوش نہ ہو تو اُس کی یہ جدوجہد رایگاں ہے اس کی کوئی قیمت اللہ تعالیٰ کے پاس نہیں ہے ۔جیسا کہ فرمایا: قل ان کان آبائکم کہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور خاندان کے آدمی اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے بند ہونے سے ڈرتے ہو اور مکانات جن کو پسند کرتے ہو، خدا اور اس کے رسول سے اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے تمہیں زیادہ عزیز ہوں تو ٹھیرے رہو یہاں تک کہ خدا اپنا حکم (یعنی عذاب ) بھیجے اور خدا نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا (التوبۃ:24)۔

سید قطبؒ کہتے ہیں : اس طرح اِس ایک آیت میں تمام لذائذ تمام امنگوں ،تمام رغبتوں اور انسان کے نفس میں تمام کمزوریوں کو جمع کر کر لیا گیا ہے تا کہ ان سب کو ایک پلڑے میں رکھد یا جائے اور دوسرے میں اللہ ورسول کی محبت اور اس کے راستہ میں جہاد کی محبت کو رکھ دیا جائے

،تا کہ قربانی مکمل ہوجائے اورشہوتوں کے جال سے نجات مل جائے۔تو ان چیزوں سے آزادنفس وہ ہے جس کا مطالبہ اسلام کرتا ہے۔جس کی تشکیل کی وہ دعوت دیتا ہے تا کہ وہ نفس ذلت کی چیزوں پر غالب رہے اوراُس کی زمام اپنے ہاتھ میں رکھے اوروقتی اورچھوٹی چھوٹی رغبتوں سے زیادہ بڑی اورزیادہ وسیع جو چیز ہے اس کا مشتاق ہو(العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام صفحہ 42)۔

رسول اللہ ﷺ اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:’’جس نے اس حال میں صبح کی کہ اس کا سب بڑا مقصد دنیا ہوتو اُس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں، جو اللہ سے نہیں ڈرتا اُس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں اور جو عام مسلمانوں کے معاملات سے دلچسپی نہ لے تو اس کا تعلق ان سے نہیں ہے (اس کی تخریج حاکم نے مستدرک میں کی ہے، راوی حضرت حذیفہؓ ہیں، کتاب الرقائق 4/352 حدیث نمبر:7889 طبرانی نے اوسط میں اسی کے مثل نقل کیا ہے، حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے فرمایا: نبی ﷺ نے فرمایا: جس اس حال میں صبح کی کہ دنیا ہی اُس کا سب سے بڑا فکر تھی تو اُس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں اور جو مسلمانوں کے معاملات سے دل چسپی نہیں رکھتا وہ ان میں سے نہیں ہے۔اور جو بغیر کسی مجبوری کے اور اپنی خوشی سے ذلت اختیار کرلے تو وہ ہم میں سے نہیں۔طبرانی نے کہا کہ اس حدیث کا یہی ایک طریق ہے یزید بن ربیعہ اس کی روایت میں متفرد ہے معجم الاوسط 1/51) جیسا کہ ایک اور حدیث میں وضاحت کی گئی ہے کہ حب ِدنیا ہی کمزوری اور’’وہن‘‘ ہے جو امت کی فعالیت کو روکتی اور تہذیبی سرگرمی میں رکاوٹ ڈالتی ہے اوراُسے دوسروں کے پیچھے چلنے پر راضی کرڈالتی ہے۔چنانچہ فرماتے ہیں:’’قریب ہے کہ قومیں تم پر ٹوٹ پڑیں جیسا کہ کھانے والے کھانے کے برتن پرٹوٹ پڑتے ہیں، ایک کہنے والے نے کہا: کیا ہم اس وقت کم ہوں گے اے اللہ کے رسول؟ نہیں، تم اس وقت بہت ہوگے، لیکن تمہاری حالت اُس جھاگ کی مانند ہوگی جو سیلاب میں ہوتا ہے۔اللہ تمہارے دشمن کے دل سے تمہارا خوف نکال دے گا، تمہارے دلوں میں وھن(بزدلی) ڈال دے گا، ایک نے پوچھا یارسول اللہ!

وھن کیا ہے، فرمایا:’’دنیا کی محبت اور موت کا خوف‘‘(ابوداؤد نے اپنی سنن میں بروایت ثوبان مولیٰ رسول اللہ ﷺ سے اس کی تخریج کتاب الملاحم، باب فی تداعی الامم علی الاسلام میں کی ہے 4/111 حدیث نمبر:4297 اسی کے مثل احمد نے مسند میں روایت کی ہے 5/278 اور طبرانی نے معجم کبیر میں 2/102) اس لیے ضروری ہے کہ مسلمان اللہ

کے بھروسہ پر حوصلہ بلند رکھے اور آخرت میں اللہ کی عطا کی امید رکھے۔ ایمانی آداب کو اپنی زندگی میں برتے اور اس کے ساتھ جو مصیبت لاحق ہوتی ہے ،اُس پر صبر کرے تا کہ زمین کی جاذب نظر چیزوں سے آزاد ہو سکے اور ''زندگی'' کو اسلام کے حق میں اور خلافت کے منہج کے مطابق چلائے۔ اور ہر مرحلہ میں یوں لگے کہ وہ خلافت ارضی اور تعمیر کائنات کا فرض انجام دے رہا ہے۔ اور اللہ کے اس قول کی عملی تفسیر ہے کہ: وہ لوگ جن کو ہم اگر زمین میں اقتدار دے دیں تو وہ نماز قائم کریں، زکوۃ ادا کریں، معروف کا حکم دیں اور منکر سے روکیں اور سب معاملات کا انجام اللہ کے ہی ہاتھ میں ہے ۔(الحج: 41) تو یہ تصورات: تابع خلافت ،زندگی کو آگے بڑھانے کی زندہ جدوجہد، ذمہ دارانہ کام اور خلافت کے تصور کو ایک الگ تشخص اور الگ معنی دے رہے ہیں۔ جیسا کہ وہ خلافت والی حالت اور غیر خلافت والی حالتوں کے مابین حد فاصل بھی قائم کرتے ہیں۔ غیر استخلاف والی حالت کو جاہلیت قرار دیا جا سکتا ہے (نصر محمد عارف، نظریات التنمیۃ السیاسیۃ المعاصرۃ دراسۃ نقدیۃ مقارنۃ فی ضوء المنظور الحضاری الاسلامی طبع اول ورجینیا، المعہد العالمی للفکر الاسلامی، 1412ھ 1992) صفحہ 255) ساتھ ہی وہ اسلامی تہذیب کی قدروں اور مغربی تہذیب کی قدروں کے مابین فرق وامتیاز کو بھی بتاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مغربی تہذیب کی قدروں میں غلبہ وتسلط، مادی بنیاد پرستی کو اصل حیثیت حاصل ہے جو وحی وغیب جیسی چیزوں سے خالی ہے۔ اور جس کو موجودہ زمانہ میں اینگلو امیرکن ثقافت کہا جا سکتا ہے۔

اسلامی تہذیب کی قدروں میں سب سے اہم بنیاد وحی کی رہنمائی ہے، جہاں انسان ہر چیز میں زمین کی طرف دیکھنے سے پہلے آسمان کی طرف دیکھتا ہے اور جہاں مادی وحسی عالم کی دریافت کے لیے عالم غیب سے مدد لی جاتی ہے۔ ان تینوں نظریات کے دائرہ میں 'استخلاف' کو ایسی محوری قدر سمجھا جائے گا جو مسلمان کی تہذیبی جدوجہد میں حاکم ہوتی ہے۔ اور انسانی کام اور تخلیق کائنات سے مقصود الٰہی کو ہم آہنگ کرتی ہے۔ اِس طرح کہ کائنات کی تمام سرگرمیاں اللہ کی طرف متوجہ اور دین کے معیار پر ہوں اور شرع الٰہی کے تقاضوں کو پورا کرتی ہوں اور اللہ کے امر ونہی کے مطابق ہوں۔ اِن

تمام سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ مسلمان اپنی تہذیبی جدوجہد میں معیتِ الٰہی اورتوفیق الٰہی کو حاصل کرتا ہے ،مقاصد کی صحت اور وسائل کی کامیابی میں خدائی نصرت اصل ہے۔جس کی مدد سے زمین میں اللہ کے احکام نافذ ہوتے اوراس کے امرونہی جاری ہوتے ہیں۔اوراُسی وقت انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہونے کے لائق ہوگا۔جیسا کہ بروایت ثوبان رسول اللہ سے مروی ہے کہ فرمایا: جس نے معروف کا حکم دیا،منکر سے روکا،تو وہ زمین میں اللہ کا اس کی کتاب کا اوراس کے رسول کا خلیفہ ہے (اس حدیث کو صاحب کنزالعمال نے روایت کیا ہے۔3/35 حدیث نمبر:5564 اورابن عدی نے اپنی الکامل فی ضعفاء الرجال 6/84 میں روایت کیا ہے۔جس کے راوی کادح بن رحمۃ القرشی ہیں۔پھر کہا کہ وہ عام طور پر کمزور چیزیں روایت کرتے ہیں جن کی اسناد ومتن میں متابعت نہیں ہوتی ان کی حدیثیں صالحین وزہاد کی حدیثوں سے مشابہ ہوتی ہیں۔کیونکہ ان کی احادیث میں ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن کے متابع نہیں ملتے)۔

☆☆☆

فصل دوم:

# تزکیہ اور انسانی شخصیت کو مضبوط بنانا

## تزکیہ کا مفہوم اور خلافت والے معاشرہ میں اس کی اہمیت

'تزکیہ' اسلام میں ان تہذیبی اصولوں میں سے ہے جن کا شعور ہونا نہایت اہم ہے۔ کیونکہ 'تزکیہ' ان اساسی اور کلی اصولوں میں سے ہے جو انسان کے تہذیبی عمل کو زمین میں استکبار و سرکشی سے بچاتے ہیں۔ جیسا کہ وہ تہذیبوں کو تیز زوال سے اور شکست و ریخت سے بھی بچاتے ہیں۔ تغییر و بناء اور خلافت والے معاشرہ کی تعمیر میں تزکیہ کو علی الاطلاق سب سے پہلا اور اہم مقام حاصل ہے (دوسرا ذریعہ استقامت اور زمین کی ایمانی تعمیر ہے جس کا بیان تیسری فصل میں آئے گا۔ یہاں ہم زور دیکر یہ کہنا چاہیں گے کہ ''اسلامی تصورات'' کا مجموعہ ایک وحدت ہے جس کا ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے۔ اس مجموعہ تصورات کا پورا مفہوم تبھی سمجھ میں آئے گا جب اس کی تمام کڑیاں ملا کر دیکھا جائے) کیونکہ تزکیہ انسانی شخصیت کو پائیدار بنانے اور ترقی دینے کے اسلامی منہاج کی ترجمانی کرتا ہے جس کا وسیلہ انسان کی نیت ہے جس کو زمین میں خلافت کا فرض انجام دینا ہے۔ فرمایا: **ان اللہ لایغیر ما بانفسھم** خدا اس نعمت کو جو کسی قوم کو حاصل ہے نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت کو نہ بدلے اور جب خدا کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو پھر وہ پھر نہیں سکتی اور خدا کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں ہوتا (الرعد: 11) تو پہلے نفس کا تزکیہ ہوگا اُس کے بعد خارج کی زندگی کا۔ یعنی خارجی تبدیلی سے پہلے داخلی تبدیلی ضروری ہوگی (فرنچ مفکر راجر گارودی کہتا ہے کہ: ہر وہ انقلاب جس میں انسان اپنے نفس کو بدلنا نہ چاہے باقی ہر چیز میں تبدیلی چاہے اس کا انجام ناکامی ہوتا ہے۔ وعود الاسلام صفحہ 83)۔

انسان دنیا میں اللہ کے حکموں کے مطابق زندگی کو تحریک دیتا ہے اس کے لیے پہلے اسے

داخلی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔جس میں حریت بھی ہے اور شرع کا التزام بھی اور اسی داخل عمل سے تاریخ حرکت میں لائی جاسکتی ہے۔زمانہ منقلب ہوتا ہے اور مظاہر حیات میں تبدیلی آتی ہے۔جیسا کہ فرمایا: وان لیس للانسان الا ماسعی: اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے، اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی۔ پھر اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا (النجم:39، 41) یہیں سے ہم کہ سکتے ہیں کہ اسلامی تہذیب وہ ''انسانی تہذیب'' ہے جس کی اساس یہ ہے کہ انسان خالقِ کائنات کی ہدایات سے فیض یاب ہو کر عمل کرتا ہے۔اس کا عمل دو متوازی سمتوں میں ہوتا ہے جو دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہ عمل خود انسان کے اندر ہوتا ہے جس سے انسان کا ارتقاء وتطہیر ہوگی اور پھر زمین اور فطرت میں انسان کا عمل زمین کو آباد کرنا اور ترقی دینا ہے۔لیکن اس کا نظریہ مادی نہیں ہوتا، جو کہ انسان کو محض سامان تجارت بنا کر رکھ دیتا ہے اور جس میں آخرت سے قطع نظر آدمی جبر واستحصال کے قوانین کے تابع ہوجاتا ہے۔انقلاب لانے میں اور انسان خلیفہ کے تہذیبی کام میں تزکیہ کی اہمیت کی بنیاد پر ہم دیکھتے ہیں کہ مکی آیات امام شافعیؒ کے نزدیک ''نفس کے ساتھ انصاف پر مبنی ہیں۔اور حقوق اللہ وحقوق العباد کے سلسلہ میں احکام شرع کی پابندی کے لیے جدوجہد پر مبنی ہیں (الموافقات للشاطبی 4/236) تو تزکیہ ابتدائے اسلام میں انسانِ خلیفہ کی تشکیل کے لیے ایک ضروری چیز اور مقاصد شریعت میں سے ایک مقصد تھا، یہی نہیں بلکہ وہ بعثت نبوی کے ان چار ارکان میں سے ایک ہے جن کی تکمیل کے لیے آپ ﷺ کو بھیجا گیا جیسا کہ فرمایا: ہوالذی بعث فی الامیین رسولا: وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں ان ہی میں سے ایک رسول (محمد) بھیجا جو ان کو پاک کرتے اور خدا کی کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے (الجمعۃ:2)۔

اسی لیے امام راغب نے اپنی کتاب الذریعہ الی مکارم الشریعہ (دیکھیں کتاب کا صفحہ 86) میں ایک بحث کا عنوان یہ قائم کیا ہے: اللہ تعالی کی خلافت وکمال عبادت کے لیے طہارتِ نفس شرط ہے: اس میں وہ کہتے ہیں: خدا کی خلافت اس کی عبادت اور زمین کی آبادکاری کے لیے وہی شخص لائق

ہوسکتا ہے جو طاہر النفس ہو،جس نے اپنی گندگی اور نجاست کو دور کر لیا ہو، کیونکہ نفس میں بھی نجاست ہوتی ہے بدن میں بھی۔تو خلافت الٰہی کے قابل وہی انسان ہوگا جو نفس کی طہارت رکھتا ہو کیونکہ خلافت انسانی وسعت کے مطابق افعال الٰہی کی تحرّی میں خدا تعالیٰ کی اقتداء کا نام ہے اب جو طاہر نفس نہ ہو وہ قول و فعل میں بھی پاکیزہ نہیں ہوسکتا کہ ’برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اُس میں ہوتا ہے‘۔اِس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اصول جوامت کو خلافتِ الٰہی کے لائق بناتے ہیں جن کو ہم یہاں پیش کررہے ہیں وہ وہ اصول واقدار ہیں جو انسان کا تزکیہ کرتے ہیں اور خدائی اخلاق اختیار کرنے کے لائق بناتے ہیں۔اور کسی تہذیب کی بناوتکوین میں اس کو مستبعد نہیں سمجھنا چاہیے۔چنانچہ اگر میں یہ کہوں تو حقیقت سے دور نہ ہوں گا کہ: شریعت اپنے احکام و تکوینات اور مطلوبات میں اس کے علاوہ کچھ اور نہیں کہ کچھ جوہری قدروں کا نام ہے جو مجموعی طور پر انسان کا تزکیہ کرتی ہیں۔وہ تزکیۂ نفس ہو یا تزکیۂ معاملات۔اور یہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادِ مبارک کے مطابق ہے کہ: بعثت لاتمم مکارم الاخلاق، میں اس لیے بھجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کردوں (اس حدیث کی تخریج گزر چکی ہے)۔

اور یہیں سے ایک مسلمان سے مطالبہ ہے کہ وہ تہذیبی جدوجہد میں ہمیشہ ’’اپنی ذات کی نگرانی کرے، اللہ کے حکم اور شریعت کے مطابق عمل کرنے کی اس کی تربیت کرے، ذاتی تربیت سے ہماری مراد ہرگز بھی کوئی سلبی عمل اور زندگی سے فرار نہیں، کہ اجتماعی توازن کھو کر معاشرہ سے آدمی بھاگ جائے، اور غاروں وکوہوں میں روحانی ریاضتیں کیا کرے، یہ تو زندگی کو چھوڑنا اور عجمی تصوف ہے،ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ذات کے تزکیہ اور نفس کی تربیت کا میدان اس سے بھی کہیں زیادہ وسیع ہے۔وہ میدان ہے زندگی کے برے بھلے تمام پہلوؤں کا۔یہ وہ تربیت ہے جو کارزارِ حیات میں رہنے سے ہی ملے گی جس میں آدمی سماج میں رہے، روزانہ کی مشکلات اور چیلنجوں کا سامنا کرے، اِن کو پہلے سے تاڑلے۔ان کے سامنے سرفگندہ نہ ہو بلکہ ڈٹ کر کھڑا رہے۔ہاں حالات اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اِس مورچہ سے کبھی پیچھے بھی ہٹا جاسکتا ہے اور آگے بھی بڑھا جاسکتا ہے۔دوسرے مذاہب میں

توزہد ورہبانیت کا نام ہے جو ایک منفی چیز ہے مگر اِسلام میں اس رہبانیت کی کوئی بھی جگہ نہیں ہے۔ یہاں تو تربیت ذات اور شخصی سلوک وتزکیہ ہے (ملاحظہ ہو عمر عبید حسنہ،نظرات فی مسیرۃ العمل الاسلامی، طبع ثانی (بیروت مؤسسۃ الرسالۃ 1405ھ(1980) صفحہ 81 (۲) المفردات: صفحہ 213)۔

**اس مفہوم کی بنیاد:** اسلامی تہذیبی تشکیل میں تزکیہ ایک جامع تصور ہے جس میں ''نمو اور خیر'' دونوں معنے ایک ساتھ پائے جاتے ہیں۔امام راغب 'تزکیۃ النفس کا مفہوم یوں بیان کرتے ہیں کہ: وہ خیرات وبرکات کے ذریعہ ذات کو ترقی دینا ہے (المفردات: صفحہ 213) یعنی یہ تصور اپنے اندر معانی کی جو دنیا رکھتا ہے ان کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔

**اول:** تطہیر یا نفس کو تمام برے عوارض، شر کے محرکات اور سستی کے خیالات سے پاک وصاف کرنا۔

**دوم:** ذات کو مضبوط بنانا اور آراستہ کرنا یعنی نفس کو صفاء، برکت اور صالحیت جیسے عناصر سے آراستہ کرنا (تزکیہ کے مفہوم پر دلالت کرنے کے لیے کچھ اور تصورات بھی ہیں۔اسلامی نظام میں تطہیر وترسیخ کی اہمیت کو مزید واضح کرنے کے لیے ہم یہاں ان میں سے دو مفاہیم مستعار لیتے ہیں۔ پہلا ہے مجاہدہ یا اخلاقی جہاد یعنی اپنی ذات کو ترقی دینے کے لیے پوری پوری کوشش صرف کر دینا جس میں اپنے آپ سے تعامل کے علاوہ غیر سے تعامل اور اپنے کو خیر کی بلندیوں تک لے جانا اور شر کے محرکات سے روکنا ہے۔ملاحظہ کریں: ابن القیم، مدارج السالکین صفحہ ۲۴ ابن حجر، فتح الباری 11/338 دوسرا ہے سیاسۃ النفس یعنی اپنی ذات کی اصلاح کرنے والے امور انجام دینا، دیکھیے، الذریعہ صفحہ 84) مطلب یہ ہے کہ تزکیہ نفس انسانی کو رذائل سے پاک کرنے اور فضائل سے آراستہ کرنے کا نام ہے۔جس سے نفس کو دنیا میں صلاحیت وصالحیت اور آخرت میں فلاح ملے۔ چنانچہ ہر اس چیز کو اختیار کیا جائے جس سے اُسے کمال حاصل ہوتا ہو اور جس سے رذائل دور ہوں۔ اِس کے مقابلہ میں تدسیہ (دبا دینا) کا تصور ہے جس کے اندر خفاء، بہکانے اور فاسد کرنے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ظاہر ہے کہ اِن چیزوں سے انسان دنیا میں ناکام اور آخرت میں خسارہ میں رہے گا۔اللہ تعالی کے ارشاد ونفس وما سواہا: اور انسان کی اور اس کی جس نے اس (کے اعضاء) کو برابر کیا، پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیز گاری کرنے

کی سمجھ دی کہ جس نے (اپنے )نفس (یعنی روح ) کو پاک رکھاوہ مرادکو پہنچا (الشمس:10-7) میں یہ دونوں باتیں آ گئی ہیں۔لفظ تزکیہ کے استعمالات کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کئی دلالتیں رکھتا ہے (اس ضمن میں مجھے سب سے جامع کلام امام راغب کا لگا جوانہوں نے اپنی کتاب المفردات میں صفحہ 213 پر کیا ہے کہ زکوۃ کی اصل وہ بڑھوتری ہے جواللہ کی برکت سے آئے ) جن کوہم اجمالا یوں بیان کر سکتے ہیں:

ا۔تزکیہ کا اسلامی تصور'' تکریم'' انسان سے وابستہ ہے۔جوایک

امرالٰہی ہے اورجس کو کوئی چیز توڑنہیں سکتی ،نہ اس میں غفلت برتنے کا کسی کو اختیا ر ہوسکتا ہے۔ارشاد الٰہی ہے: ولقد کرمنا بنی آدم : اورہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اوران کوجنگل اوردریا میں سواری دی اور پاکیزہ روزی عطا کی اوراپنی بہت سی مخلوقات پرفضیلت دی(الاسراء:70)۔

توانسان کی اس لازمی تکریم کا تقاضایہ ہے کہ وہ اپنے تزکیہ کی کوشش کرے،اوراپنی ذات کو اونچااٹھائے اوراُس کو ان سارے عوارض اورآفتوں سے دوررکھے جواِس تکریم کے تقاضوں کے منافی ہوں اوراس کواس کی حقیقتِ انسانی سے نکال دیں۔لہٰذاضروری ہے کہ انسان اس تکریم انسانیت کے تقاضے کے مطابق ہی تہذیبی عمل انجام دے،جواُس سے مربوط ہو،اُس سے الگ نہ ہو۔اورتکریم ایک فعال ومؤثرعمل ہے جو انسان کو کارگرومؤثربنا کراوراس سے ہم آہنگ ہوکر کائنات میں آقابناتی ہے۔ایسانہیں ہوتا کہ وہ اس پرقہروسطوت حاصل کرلے اور، اسکتکبار وغضبنا کی میں اُسے غلام بنادے۔کیونکہ یہ تکریم انسانی کے منافی ہوگا۔کیونکہ تکریم ایک انسانی حالت ہے جوسرکشی وتکبر سے علاقہ نہیں رکھتی اورنہ ہی ذلت وخواری ومحکومی سے اورنہ ہی تہور،طیش ،یاخواہشات نفسانی سے، بلکہ تکریم توایک ایساعمل ہے جو پورے شعوروبصیرت سے ہوتا ہے۔وہ مؤثرعمل ہےاور ہروہ عمل انجام دلاتا ہے جس سے انسان کی تکریم واعزاز میں اور اضافہ ہو۔اس میں افراط نہیں ہوتی جس سے کہ کبر،اتراہٹ،اورسرکشی جیسی کوئی نوعیت پیداہواورنہ ہی تفریط جس سے ریوڑ کی ذہنیت پیداہوجائے کہ ؂

چلوبس ادھرکوہوا ہوجدھر کی

اس کا شعار بن جائے۔ کیونکہ تکریم واعزاز کو کھودینا اصل میں انسانیت کو کھودینے کی ابتداء ہے۔ بلکہ اس سے وہ تمام انسانی اقدار ہاتھ سے جاتی رہتی ہیں جن پر خلافت کا دارومدار ہے۔ایک آدمی پر طاقت کا نشہ اور تکبر کا بھوت سوار ہوجائے تو وہ اپنے اور دوسروں کے حق میں تمام حقیقی وجوہری قدروں کو گنوادیتا ہے، ٹھیک اسی طرح ذلت اور خواری کا شیوہ بھی آدمی سے اپنے آگے اور غیر کے لیے ہر حقیقی وجوہری قیمت چھین لیتا ہے(سیف الدین عبدالفتاح، العلاقات الدولیۃ فی الاسلام، مدخل القیم،صفحہ 142)۔

۲۔تزکیہ ذات انسانی کے اندر سے امنڈتا ہے بلکہ انسان کو وہی نمایاں کرتا ہے، جبکہ تدسیہ ذات انسانی کی حقیقت کو چھپاتا ہے۔تزکیہ میں انسان کوشش کرتا ہے کہ برائیوں سے اپنے آپ کو بچا کر اپنے وجود کو ثابت کرے ۔یعنی یہ ایسا تصور ہے جو انسان کو تہذیبی جدوجہد میں صالح اور مفید قدروں کے التزام کا خوگر بناتی ہیں اور اس کا واسطہ ہوتا ہے حق نفس کی ادائیگی، کہ وہ نفس کی تطہیر کرتی ہے، سلوک کی بنیاد کو اور مقصود وذریعہ سب کو درست کرتی ہے۔ساتھ ہی تزکیہ انسان کو اِس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ غیر کے حقوق کی بھی ادائیگی کرے۔پھر وہ 'غیر' انسان بھی ہوسکتا ہے اور غیر انسان بھی مثلاً نباتات اور جمادات۔ اِس طرح انسان تزکیہ سے ادب حاصل کرتا اور اپنے آپ سے تمام رذائل کو دور کرتا ہے جو اُس کے وجود کو فساد آلودہ کریں۔اور جو اُس کی انسانی شخصیت کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہوں۔اسی سے انسان کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر مغربی ماڈل سے بالکل الگ ہوجاتا ہے۔جیسا کہ گارودی کہتے ہیں(وعود الاسلام صفحہ 82)۔

یعنی ہم کہ سکتے ہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے بغیر تزکیہ کے انسان انسان نہیں اور بنا اس کے امت امت نہیں !!اور اس کا مطلب کبھی بھی نہ نہیں کہ کوئی بھی انسان ایسے درجہ کو پہنچ گیا جس کے بعد کوئی درجہ نہیں یا وہ تطہیرِ نفس کے بارے میں آخری منزل کو پا چکا۔ ہاں اس میں نبی ﷺ کی ذات گرامی کا استثناء ہے۔ جو انسان کامل ہیں۔

خود تزکیہ وتطہیر کے معانی میں نیا پن (تزکیہ وتطہیر دونوں باب تفعیل سے ہیں اور عربی میں فَعَّل کے وزن پر

ہیں اور عربی میں یہ وزن تسلسل، گہرائی اور گیرائی اوراستقرار پر دلالت کرتا ہے) ،نظر ثانی اور نگرانی و درستگی کا مفہوم شامل ہے۔ظاہر ہے کہ یہ معانی اس کے متقاضی ہیں کہ مختلف مراحل والی یہ جدو جہد ہمیشہ جاری رکھی جائے، کیونکہ 'تزکیہ' کسی بھی عمل سے الگ نہیں ہوتا اور مہلت عمل ختم ہونے تک جاری رہتا ہے۔یہیں سے معلوم ہوا کہ انسان تزکیہ نفس وتصفیہ ذات میں جس درجہ کو بھی پہنچ جائے کم ہی ہے۔اُسے ہر آن ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہونا ہے۔ایک اچھی پوزیشن سے دوسری اچھی پوزیشن کی طرف جانا ہے۔اور کسی حد پر رکنا نہیں ہے۔نہ ہی رب تعالیٰ سے ملاقات تک جدوجہد کو روکنا ہے۔ **یاایھاالانسان** :اے انسان! تو اپنے پروردگار کی طرف (پہنچنے میں) خوب کوشش کرتا ہے سواس سے جا ملے گا (الانشقاق:6)۔

۴۔تزکیہ اوراُس سے متعلقہ قدروں کا مفہوم نمبراس کے بالمقابل تدسیہ کا جومفہوم ہے وہ انسان کا معاملہ اس کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ اگر وہ دنیا میں عمل صالح کرے گا،تو اس کی کوشش میں برکت ہوگی،اگر وہ دنیا میں فساد پھیلائے تو اپنی کوششوں میں ناکام ہوگا،دونوں ہی حالتوں میں نتیجہ اس کے سامنے آئے گا،جیسا کہ فرمایا: ولوان: اگران بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور پرہیزگار ہوجاتے تو ہم ان پر آسمان اورزمین کی برکات (کے دروازے) کھول دیتے مگرانہوں نے تو تکذیب کی ،سوان کے اعمال کی سزا میں ہم نے ان کو پکڑ لیا (الاعراف:96) دنیا کے علاوہ وہ آخرت میں بھی اپنے عمل کا نتیجہ ثواب یا عتاب کی صورت میں دیکھ لے گا۔جیسا کہ فرمایا: (یعنی) ہمیشہ رہنے کے باغ جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، ہمیشہ ان میں رہیں گے،اور یہ اس شخص کا بدلہ ہے جس نے پاکی اختیار کی (طٰہٰ: 67)۔

اِن چیزوں سے انسان کی حس میں بیداری،تقویٰ اوراحتساب کے تمام احساسات پیدا ہوتے ہیں۔وہ جانتا ہے کہ وہ اپنی تقدیر اپنے عمل سے آپ بناتا ہے،اور یہ کہ یہ ذمہ داری شدید ہے ،جس سے وہ سرِمو غافل نہیں رہ سکتا!

۵۔ اس مفہوم میں تزکیہ انسان کو کارزارحیات میں دائمی طور پر ثابت شدہ الٰہی موازین کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت کا احساس دلاتا ہے (تربیت ذات کے الٰہی موازین کو فقہ الباطن بھی کہہ سکتے ہیں۔ جو دلوں کے اعمال کے ساتھ خاص ہے اور جو فقہ الظاہر کی تکمیل کرتی ہے، فقہ الظاہر جوارح کے اعمال سے تعلق رکھتی ہے)۔

تو تزکیہ اس میں اس حق اور واجب کے درمیان تلازم کا متقاضی ہے، بلکہ حق وہ چیز ہے جو ہمیشہ کام آتی ہے۔ اس سے آدمی کو یہ بھروسہ رہتا ہے کہ اُس کی خواہشات اسے دھوکہ نہیں دیں گی نہ گمراہ کریں گی۔ اِس طرح اس کی خواہشات اسے ہلاکت میں نہ ڈالیں گی، اس پر اپنی خواہشات کو معبود بنانے کا الزام بھی نہیں آئے گا۔ اور اس طرح وہ اللہ سے قریب، اس کی ہدایت سے فیضیاب اور اپنی راہ کو اس کے نور سے مستنیر کرے گا۔ توحید اور ربوبیت کو اس طرح سے سمجھے گا کہ حرکتِ حیات کے اندر چیزوں کے انتخاب میں اور تقدیر الٰہی میں ہم آہنگی و توافق ہو۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اسلامی تصور میں تزکیہ اللہ سے دور ہو کر ہو نہیں سکتا۔ نہ اس سے کسی ایسے عمل کو متصف کیا جائے گا جو امر و نہی میں اللہ کی مراد و منشاء کے مطابق نہ ہو (اسی سے تزکیہ اور جدید فن تربیت کے تصورات جدا ہو جاتے ہیں۔ تزکیہ ایک اسلامی تصور ہے جو انسان کی ترقی و تطہیر کا ایک واضح پیٹرن پیش کرتا ہے جبکہ تربیت ایک غیر جانب دار تصور ہے جس میں تزکیہ کے بعض مضامین اور دلالتیں شامل ہیں)۔

یعنی مذکورہ بالا معنوں میں تزکیہ تغییر کے کام میں ایک اہم بُعد ہے۔ جو استخلاف والے سماج کو قائم کرنے میں بنیادی رول ادا کرتا ہے، جہاں بندہ کائنات میں اللہ کی نعمتوں اور اشیاء کا استعمال کرتا ہے جہاں وہ دنیا کو آخرت کے لیے استعمال کرتا ہے اور ''ربانی'' بن رہتا ہے۔ اللہ کی خلافت کا مستحق اور بندوں پر شہادت کا فرض انجام دیتا ہے۔ اللہ کے اُس منہج سے ہدایت حاصل کرتا ہے جو اس کی طرف وحی کیا گیا ہے، جو انسان سے متعلق تہذیبی عمل کو منضبط کرتا ہے، جس میں حقوق بھی ہیں واجبات بھی، کوشش بھی ہے فکر و عمل بھی، وسائل بھی ہیں مقاصد بھی۔ اور یہ سب اس تزکیہ کے ذریعہ انجام پاتا ہے جو ''حق النفس'' کا لحاظ بھی کرتا ہے اور ''حق الغیر'' کی رعایت بھی۔ تاکہ اُس میں انسان درجہ کمال کو پہنچ جائے اور ''انسانی ذات کو'' پائدار بنائے۔ اور اُس کی تفصیل یوں ہے:

**اولا:** حق نفس کی ادائیگی کے ذریعہ تزکیہ: یہاں تزکیہ کا مفہوم ہے وہ افعال وامور حاصل کرنے کی کوشش جو کارگاہ حیات میں مسلمان کے کاموں پر نگراں ہوں۔ جو اس کے نفس کو پاک کریں ،اس کی ذات کو اٹھائیں اور جو اللہ کی خالص بندگی اور ہمیشہ بیداری کے ذریعہ اللہ سے اس کے تعلق کو مضبوط بنائیں۔ یا اس کے علاوہ وہ چیزیں جن کو مکارم اخلاق کے اصول کہتے ہیں جیسا کہ امام شاطبی نے ان کو نام دیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے: دنیا سے اشتغال بڑھ جانے کی وجہ سے ان اصولوں کے مطابق عمل میں کمی آتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بالکل فراموش سا ہو جاتا ہے۔ اوران اصولوں پر عمل کرنے والا بالکل اجنبی بن کر رہ جاتا ہے۔ جو اپنے گھر والوں سے دور ہو۔ اور وہ اللہ کے رسول کے اس ارشاد کے تحت آجاتا ہے (اس حدیث کی تخریج امام مسلم نے کی ہے۔ راوی حضرت ابو ہریرۃؓ ہیں کتاب الایمان باب بیان ان الاسلام بدأ غریبا 1/130 حدیث نمبر 145)۔

''اسلام غربت کی حالت میں شروع ہوا اور ایک زمانہ میں وہ پھر اجنبی بن کر رہ جائے گا تو خوش خبری ہے ایسے اجنبیوں کے لیے'' (الموافقات 4/237 اور الاعتصام 1/92)۔

یہ اصول اجمالی طور پر تین ہیں:

پہلا: پختگی کے ساتھ اخلاق کو بہتر طور پر اختیار کرنا، اللہ کے اخلاق کو بہتر طور پر اختیار کرنے میں یہ بھی شامل ہے کہ تمہارے ہر عمل کا عذر ہونا چاہیے اور اللہ سبحانہ کے ہر عمل پر شکر ادا کرنا چاہیے (مدارج السالکین 2/324) اخلاق میں مخلوق خدا کے ساتھ اچھا سلوک کرنا بھی شامل ہے، کہ ان کی بھلائی کرے، ان کی تکلیفوں کو دور کرے۔ اس کا تقاضا ہے کہ مخلوق خدا تم سے امن میں رہے، تم سے محبت کرے اور تمہارے ذریعہ نجات پائے (نفس مصدر 2/317) جیسا کہ اُس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ مسلمان ہمیشہ اپنے اور غیر کو نفع پہنچانے کے لیے کوشاں اور اس میں لگا رہے (الموافقات 2/179) اخلاق کو اعلی طریقہ پر اختیار کرنے کے بھی کئی درجے ہیں (ڈاکٹر طٰہٰ عبدالرحمان کی رائے ہے کہ اخلاق کے درجے مختلف ہیں ،انہوں نے ان کو چار میں تقسیم کیا ہے: پہلا انسانیت یعنی بشری خصوصیات ہونا، دوسرا رجولیت یعنی انسانی خصوصیات وصفات میں اعلی درجہ حاصل کرنا، پھر مروئت کا درجہ ہے جس میں رجولیت، مرتبہ کمال اور عقل سب ساتھ ساتھ پائے جائیں۔ دیکھیے

الحق العربی فی الاختلاف الفلسفی طبع دوم (بیروت، المرکز الثقافی العربی 2006 صفحہ 183) سب سے اونچا درجہ ہے: مروّت، جس کا مطلب ہے کہ اللہ کے احکامات کی پابندی اوراعلیٰ اخلاق کے ذریعہ اس کا قرب حاصل کرنا۔اس کو جامع لفظ میں یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ ''دین کا تحفظ اور اپنے آپ کو شر سے بچانا (ابونعیم الاصبہانی، حلیۃ الاولیاء طبع ۴ (بیروت دار الکتاب العربی 1405/76/10ھ) اس کے بعد درجہ فتوت (مردانگی) ہے، اس کا مطلب ہے کہ دوسروں کے لیے آدمی ہمیشہ ایثار وقربانی کے لیے تیار رہے (امام سیوطی، معجم مقالید العلوم، تحقیق ڈاکٹر محمد ابراہیم عبادہ طبع اول، القاہرہ، مکتبہ الآداب 1424ھ 1/120/2004)۔

**اصل ثانی:** عقل کے درجہ کا کمال ہے یا جس کو حیات عقلی بھی کہہ سکتے ہیں (مدارج السالکین 1/447) کہ آدمی کی عقل اللہ کے امر ونہی کے مطابق ہی چلے اس کی سوچ شریعت ومقاصد کے عین مطابق ہو، وہ خواہش نفس اور اس کے مفاسد سے برحذر رہے۔ ایسے ہی آدمی کو حدیث میں محفوظ العقل کہا گیا ہے۔جیسا کہ ابن ابی الدنیا نے بروایت ابن عمرؓ نقل کیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''کسی شخص کے اسلام سے اس وقت تک متاثر نہ ہو جب تک اس کی عقلی وذہنی پختگی نہ دیکھ لو (ابن ابی الدنیا، العقل وفضلہ، تحقیق لطفی محمد الصغیر، طبع اول، الریاض: دار الرایۃ 1409ھ صفحہ 34)۔

یعنی اسلامی نظریہ کے مطابق اُس عقل میں جو اشیاء کو خود سمجھنا چاہے اور اُس عقل میں جو ان کو رب تعالیٰ کی ہدایت کی روشنی میں سمجھنا چاہے بڑا فرق ہے۔ یہ دوسری عقل ہی مقاصد نافعہ تک پہنچتی اور کامیاب وسائل سے سرفراز ہوتی ہے۔جیسا کہ امام مناوی فرماتے ہیں: (فیض القدیر 536-3/535) انسان کا دین اُس کی عقل ہے، جس کے پاس عقل نہیں وہ دین والا بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ عقل ہی عبودیت کی مقدار کو بتاتی اور اللہ کی محبوب اور پسندیدہ چیزوں کو کھول کر بیان کرتی ہے۔ وہ اللہ کی دلیل ہے اور ضلالت سے روکتی ہے۔ آدمی کے پاس جتنی زیادہ عقل ہوگی، اس پر دلیل وبرہان کا اتنا ہی زیادہ اثر ہوگا۔تو عقل مند ہے ہی وہ جو اللہ کے امر ونہی کو سمجھے۔اور جس چیز کا حکم اللہ دے اسے بجالائے، جس سے روکے اس سے رک جائے، یہی کمال عقل کی علامت ہے (حول فضل العقل، دیکھیں الامام المحاسبی، فہم القرآن ومعانیہ، تحقیق حسین القوتلی، طبع دوم (بیروت: دار الکندی، دار الفکر، 1398ھ صفحہ 246 اسلامی تصور کے

مطابق عقل اور عقل پرستانہ مناہج میں فرق اور عقل کے سلسلہ میں دیکھیں م،طٰہٰ عبدالرحمان،سؤال الاخلاق صفحہ 74)۔

یہی تقاضا ہے اس حدیث کا جو ابوالدرداءؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اے عویمر اپنی عقل کو بڑھا رب تعالیٰ سے قربت بڑھے گی۔ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں، مجھے یہ چیز کیسے حاصل ہوگی؟ فرمایا: اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے بچو اور اللہ کے فرائض ادا کرو، اعمال صالحہ کرو، اس سے تمہیں اس دنیا میں رفعت وعزت ملے گی اور رب تعالیٰ کی قربت اوراعزاز ملے گا (اس کی تخریج ترمذی نے نوادر میں کی ہے۔دیکھیے ،فیض القدیر 86 اور زوائد الہیثمی 2/808اورالمطالب العالیہ بزوائدالمسانیدالثمانیۃ لابن حجر12/124) ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی عقل والا دین میں سستی نہیں کرتا مگر'' اس وقت جب وہ دینی ذمہ داریوں کو بوجھ سمجھتا ہو، اور شریعت جو عبادتوں اور توفیق کو لے کر آئی ہے اس کو حقیر سمجھتا ہو۔ اور ایسا وہ آدمی نہیں کرسکتا جس کی عقل سلیم ہو جس کا رویہ درست ہو، کیونکہ عقل اس بات سے روکتی ہے کہ انسان بے کار و بے وقعت بن جائے۔ اپنی مختلف رایوں پر بھروسہ کرے اور اپنی خواہشات کے پیچھے چلتا ہو اور جس کے امور و معاملات میں اختلاف و نزاع نے گھر کرلیا ہو۔ اوران کے احوال ان کو باہم دوری وقطع تعلق تک پہنچادیں، ایسے میں وہ اُس دین ومذہب سے بے نیاز نہیں ہوسکتے جو ان کو ایک لڑی میں پرودے اور ایک پلیٹ فارم پر جمع کردے، اب یا تو عقل ایسے دین کو واجب کرے گی یا مانع ہوگی۔ اب اگر مختل تصور والا شخص یہ تو سمجھ لے کہ دین عقل کی ضرورت ہے اور عقل ہی دین میں اصل ہے تو وہ غلطی سے دور ہوا اور حق کو ماننے والا ہوگیا، لیکن اگر اس نے پھر بھی اپنے آپ کو مہمل بنالیا تو وہ خود گمراہ اور دوسروں کو گمراہ کرنے والا ہوجائے گا (الماوردی، ادب الدنیاوالدین، صفحہ 45)۔

تو معلوم ہوا کہ عقل کامل غور وفکر کے ذریعہ اللہ کے قرب تک پہنچاتی ہے، جو غایات ونتائج کا اعتبار کرتی اور ان کا رخ کرتی ہے۔ اور غور وفکر کرکے دلالت حقیقی سے مقصدی دلالت کی طرف جاتی ہے کیونکہ وہ دین کے اسرار ومصالح کے مابین رابطہ کا اعتبار کریں گے، ہم جانیں گے کہ اللہ سے مربوط عقل وہ ہے جو کامل ترین ہو اور جس کے پاس وہ عقل ہوگی وہ انسان کامل ہوگا۔ اس لیے اسلام کا تعقل

سب سے اعلیٰ درجہ کا ہے اور مومن کی عقل سب سے اعلیٰ ہونی چاہیے کہ وہ زندگی میں اپنے رب کی ہدایت سے مستنیر ہوتا ہے (سؤال الاخلاق، صفحہ 162)۔

**تیسری اصل عبودیت کی تشکیل:** اس معنی میں کہ ہر چیز میں اللہ کی عبودیت کا استحضار رہے ،اور اللہ سے قرب کی منزلیں بندہ بتدریج طے کرے ۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرۃؓ کی حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''جو میرے کسی ولی سے دشمنی کرے گا،تو میں اس سے اعلان جنگ کرتا ہوں ،اور میرا بندہ فرائض سے بڑھ کر عمل کر کے میرا تقرب حاصل کرتا ہے، وہ نوافل سے میرا قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں ،اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں ،جس سے وہ سنتا ہے ،اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے ،اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے،اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے ۔اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں اور اگر وہ میری پناہ چاہتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں (صحیح البخاری ،کتاب الرقاق باب التواضع 5/1384 حدیث نمبر 6136)

مطلب یہ ہے کہ عبودیت کی تکمیل اس سے ہوگی کہ بندہ ہر چیز میں الوہیت کے وجود کا احساس کرے اور یہ سمجھے کہ حق تعالیٰ ہر چیز میں اس سے مخاطب ہے اور اس کی یہ مخاطبت پوری زندگی جاری رہتی ہے ۔ جہاں بھی وہ جائے گا اپنے رب کو پائے گا،جس کے امر و نہی کا خیال رکھے گا اور یقین رکھے گا کہ اللہ کی رویت اس سے منقطع نہیں ہوتی ۔ یعنی اس سے ہر گام پر یہ مطالبہ ہے کہ وہ اپنے نفس کا مراقبہ کرے اور اپنے رب کا جلوہ دیکھے ۔بس اسی کو دیکھے ،اُسی سے لو لگائے ،اُسی کا ہو کر رہ جائے ،اسی کی طرف بھاگے، ایسا کرلے گا تو اسے مرتبہ کمال واحسان حاصل ہوگا،جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ: احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اِس احساس کے ساتھ کرو کہ تم اُسے دیکھ رہے ہو، اور یہ نہ ہو تو کم از کم یہ کیفیت ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے (اس کی تخریج گزر چکی ہے )۔

عبادت گزار کو اس عبودیت تامہ کے اس مرتبہ تک چند قلبی اعمال پہنچاتے ہیں:

اخلاص: جو ''فعل کی تطہیر'' ہے اس معنی میں کہ بندہ جو کچھ بھی کرے اس میں اللہ کو گواہ بنائے

اوراس کا عمل غیر اللہ کے لیے ہونے کے ادنی شائبہ سے بھی خالی ہو۔اس میں باطل نہ درآئے، نہ اس کا عمل رائگاں ہو۔جب ایسا ہوگا تو بندوں کے اعمال واقوال سب اللہ کے لیے ہوں گے۔اوران کا دینا اللہ کے لیے ان کا روکنا سب اللہ کے لیے ہوگا۔وہ اللہ کے سوا کسی سے بدلہ اور شکریہ نہ چاہیں گے، نہ جاہ ومرتبہ کے طالب ہوں گے نہ ان کے دلوں میں کسی کی منزلت ہوگی۔نہ کسی سے ڈریں گے بلکہ وہ ان لوگوں کو اصحاب قبور کی طرح شمار کریں گے جو نہ ضرر پہنچا سکتے ہیں، نہ فائدہ، نہ موت نہ زندگی اور نہ کسی کو اٹھا سکتے نہ گرا سکتے (مرجع سابق 1/83)۔

جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا قول ہے: ''جس نے اللہ کے لیے دیا، اللہ کے لیے منع کیا، اللہ کے لیے محبت کی، اللہ کے لیے دشمنی کی اور اللہ کے لیے شادی کی تو اس نے اپنے ایمان کی تکمیل کرلی'' (اس کی تخریج امام احمد نے کی ہے، مسند احمد حدیث نمبر 15655 اسی کے مثل ترمذی نے روایت کی ہے 4/670 حدیث نمبر 2521 اور اسے حسن قرار دیا ہے۔حاکم نے مستدرک میں روایت کی ہے حدیث نمبر :2684 اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے شیخین کی شرطوں پر ہے مگر انہوں نے اس کی تخریج نہیں کی) یعنی یہ حدیث انسان کے تمام کاموں کو بامعنی بنا دیتی ہے۔کوئی بھی کام بے کار اور ظاہری نہیں رہتا بلکہ مضمون اور نتیجہ کے اعتبار سے اہم بن جاتا ہے۔جیسا کہ اس حدیث میں آیا ہے جو امامہ باہلیؓ سے مروی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی آیا اور اس نے پوچھا: اے اللہ کے رسول، یہ بتائیے کہ ایک آدمی جہاد میں شریک ہوتا ہے، وہ خدا کے ہاں اجر کا بھی طالب ہے اور دنیا میں شہرت کا بھی، اس کے لیے کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: اُس کے لیے کچھ نہیں، اُس آدمی نے اپنا سوال تین بار دہرایا، ہر بار آپ نے یہی جواب دیا کہ اس کے لیے کچھ نہیں۔پھر آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ بس اس آدمی کے عمل کو قبول کرتا ہے جو خالص اس کے لیے کیا جائے، اور جس پر اس کی رضا چاہی جائے (اس کی تخریج نسائی نے اپنی سنن میں کی ہے۔25/60 حدیث نمبر 3140 اور طبرانی نے اوسط میں 25/2 اور معجم کبیر 8/140 میں)۔

**حیا:** حیا بے حیائی کا الٹا ہے، اور اس سے مراد نفس کو رذائل سے محفوظ رکھنا ہے۔اس طرح وہ سب سے نمایاں اخلاقی اساس اور اصلاح کن عنصر ہے۔جو انسان کے 'دوسرے' کے ساتھ معاملات کی

حفاظت کرتا ہے۔اورحقیقت یہ ہے کہ تمام اعلی اخلاقیات میں اللہ کے ساتھ تعلق کو مضبوط کرنے اورانسان کے کاموں سے بے شرمی کو دور کرنے میں حیاء سے زیادہ کارگر وصف اور کوئی نہیں ہے۔ اگر ''بے شر'' غیر کا حق ادانہ کرنے کے بارے میں سوچتا ہے تو حیادار اس کے برعکس یہی سوچتا ہے کہ اداء حق میں اس سے کمی رہ گئی ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حیاء اور ایمان دونوں ساتھ ساتھ بنائے گئے ہیں۔ ایک اٹھالیا جائے گا تو دوسرا بھی اٹھ جائے گا (اس کی تخریج حاکم نے مستدرک میں کی ہے، 73/10 حدیث نمبر: 58 اور کہا: یہ حدیث صحیح ہے شیخین کی شرطوں پر ہے، انہوں نے اس کے راویوں سے دلیل لی ہے مگر ان الفاظ کے ساتھ اس کی تخریج نہیں کی) اور فرماتے ہیں کہ ہر دین میں کوئی اخلاقی صفت ہے اور اسلام کی اخلاقی صفت حیاء ہے (اس کی تخریج مالک نے کی ہے، 2/905 حدیث نمبر: 1610 اور ابن ماجہ نے اپنی سنن میں کی 2/1399 حدیث نمبر 4181 اور طبرانی نے اوسط، کبیر اور صغیر تینوں میں کی ہے) امام راغب کہتے ہیں: انسان میں حیاء سب سے پہلے اس کی عقل کو بتاتی ہے اور آخر میں ایمان کا مرتبہ ہے۔ اور یہ محال ہے کہ جس کے پاس پہلا مرتبہ نہ ہو اسے آخری مرتبہ مل جائے۔ لہٰذا یہ نتیجہ نکلا کہ جس کے پاس حیاء نہیں، اس کے پاس ایمان بھی نہیں (الذریعۃ الی احکام الشریعۃ صفحہ 283)۔

اسلامی نظام اخلاق میں حیاء کو یہ مقام اس لیے حاصل ہے کہ وہی برائیوں کے ارتکاب سے روکتی ہے اور منہیات شرع میں لگنے سے منع کرتی اور عقل کے نزدیک جو باتیں بری ہیں ان سے باز رکھتی ہے۔ امام مناوی کہتے ہیں کہ: حیا پورا دین ہے کیونکہ وہ دین کا آغاز اور اس کا انجام ہے، وہ برائی کو روکنے پر انسان کو آمادہ کرتی ہے۔ اور برائی کا ترک خیر ہی خیر ہے اور اس لیے بھی کہ جو آدمی مخلوق کی شرم کرے گا اس کا شر کم ہوگا اور خیر زیادہ ہوگا اور اسے سخاوت اور دریادلی کی صفتیں حاصل ہوں گی جو خوبیوں تک پہنچاتی ہیں۔ حیادار اس بات سے ڈرتا ہے کہ کوئی اس کے دین میں خلل دیکھے یا اس کے عمل میں لغزش دیکھے، اسی وجہ سے اس میں کمال دین ہے۔ حیا پوری کی پوری خیر ہے کیونکہ حیا کا آغاز اس انکساری سے ہوتا ہے جو آدمی کو برائی کی نسبت سے بھی ڈراتی ہے اور اس کی انتہا برائی کو چھوڑ دینا ہے۔ اور یہ دونوں ہی باتیں اچھی ہیں اس کے ثمرات میں نعمت واحسان کا حصول ہے کیونکہ

شریف وکریم آدمی اپنے محسن کے ساتھ احسان کرتا ہے برائی نہیں۔ برائی تو کمینہ آدمی کرتا ہے، اور جس پر احسان کیا جاتا ہے وہ اپنے محسن سے حیا کرتے ہوئے اس کی نافرمانی نہیں کرتا کہ نافرمانی سے خیر اور بھلائی اٹھ جاتی اور برائی ٹوٹ پڑتی ہے۔ایک فرشتہ اُسے لیکر چلا جاتا ہے تو دوسرا اِسے لے کراترتا ہے، تو یہ کیا ہی برامقابلہ ہوتا ہے!! (فیض القدیر 3/427) اس تصور کی خاصیت یہ ہے کہ وہ انسان کی حرکات وسکنات کو پابند بناتا ہے۔ کیونکہ حیاء میں عقل کی درستگی ہے۔اس لیے کہ حیا اس کو ہر گرے ہوئے کام سے روکے گی ۔جیسا کہ اُس میں 'دوام حیات' بھی ہے کہ ابن القیم کے نزدیک حیا'' زندگی سے ہے۔

جیسے کہتے ہیں الحیا المطر (بارش زندگی کا سبب ہے)اور جتنا زیادہ دل زندہ ہوگا اتنا ہی اس میں حیاء پیدا ہوگی ،اور قلت حیا سے دل وروح کی موت ہوجاتی ہے۔ جتنا زیادہ ہی دل زندہ ہوگا اتنی ہی زیادہ حیا بڑھے گی (مدارج السالکین 2/259)۔

اسی طرح اس میں آفتوں سے سلامتی ہے، کیونکہ اپنے سے حیاء آدمی کو احساس تفوق سے روکے گی اور غیر سے حیا فریب خوردگی کے شعور سے روکے گی اور اللہ سے حیاء اپنی عقل وشعور کو بڑا سمجھنے کی آفت سے روکے گی (طٰہٰ عبدالرحمٰن، الحق الاسلامی فی الاختلاف الفکری صفحہ 153/156)۔

ورع وتقوی: ورع وتقوی ظاہری وباطنی گناہوں سے دور رہنا ہے (مدارج السالکین 1/514) مالوفاتِ نفس کو توڑنا اور نفس کو خواہشاتِ نفسانی سے خاص طور پر بچانا ہے (الموافقات 1/106) جیسا کہ ابوذرؓ کی حدیث میں آتا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: تدبیر جیسی کوئی عقل نہیں اور اپنے آپ کو روکے رکھنے جیسا کوئی تقوی نہیں ،اور حسن اخلاق سے بڑھ کر کوئی حسب ونسب نہیں (ابن ماجہ نے اس کی تخریج کی ہے۔2/1410 حدیث نمبر:4218) اسی طرح آپ ﷺ نے ابوہریرہؓ سے فرمایا: تم متقی بن جاؤ سب سے بڑے عبادت گزار بن جاؤ گے ،قناعت پسند بن جاؤ سب سے زیادہ شکر گزار ہوجاؤ گے ، لوگوں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، مومن بن جاؤ گے ۔اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرو مسلمان بن جاؤ گے کم ہنسو کیونکہ زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہوجاتا ہے (ابن ماجہ: 2/1410)۔

ورع وتقوی میں پوری پوری عبادت یوں ہے کہ اس کا مطالبہ تزکیۂ قلب ،تصحیح نیت ، گہراایمانی شعور،عزیمت کی راہ پر چلنا،شبہات سے احتیاط،احتسابِ خویش وغیرہ چیزوں کا ہوتا ہے ،اوراحتسابِ خویش خوداپنے کاموں کی نگرانی ،حق داروں کوحق دینے اوراصلاحِ ضرر،اورتوبۂ خالص اوردوسروں سے سچ بولنے پر مبنی ہوتا ہے۔اِس میں یہ بھی شامل ہے کہ بندہ دنیاپرحکمرانی سے محظوظ ہونے کے بجائے کائنات کے مالک حقیقی کی بندگی کے حقوق اداکرے،اور بلاشبہ جس کی تربیت اِس نقشہ کے مطابق ہوگی وہ کارگاہ زندگی میں غالب ہوکررہے گا۔

**صبر:** صبر اِس چیز کا نام ہے کہ عقل وشرع کے تقاضوں کے مطابق آدمی اپنے نفس کو گرفت میں رکھے(المفردات فی غریب القرآن،صفحہ 273)۔مطلب یہ ہے کہ راہ کی رکاوٹوں سے لڑنے اورتزکیہ کے راستہ میں مشقتوں کو برداشت کرناصبر ہے۔اورمجاہدہ کرنے اوراللہ کے امرونہی پر جم جانے کا نام صبر ہے۔جب آدمی کو معلوم ہوجائے کہ شریعت کو شارع نے اس لیے بنایا ہے کہ نفوس کو اس کی خواہشات وعادات سے باہرنکالا جائے تو اس مرحلہ میں مقام صبر سب سے بڑا کرداراداکرتا ہے۔اسی سے بندہ اُس پرقائم رہتااوراُسے برداشت کرناسکھاتا ہے۔وہ برابرخیر کے کام اورنیکیاں کرتارہتا ہے یہاں تک کہ اُس پرزیادہ متوجہ ہوجاتا ہے۔شراور برائی کی چیزوں سے دورہوتا ہے یہاں تک کہ ان سے بہت دورہوجاتا ہے۔یہیں سے صبرمجاہدہ کی اصل اورتزکیۂ نفس کا ستون قرار پایا کہ تزکیہ کا کوئی بھی مقام بغیرصبر کے حاصل نہیں ہواکرتا(الموافقات،1/336)قرآن کی سورہ عصراس پر گواہ ہے،فرمایا: والعصر:زمانہ کی قسم،یقیناًانسان گھاٹے میں ہے۔سوائے ان لوگوں کے جوایمان لائے اورانہوں نے نیک عمل کیےاورجنہوں نے اس میں حق کی وصیت کی اورایک دوسرے کوصبر کی نصیحت کی(العصر:2-1)۔

اوراسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:کسی بندے کوصبر سے بڑھ کراوراس سے اچھا عطیہ نہیں دیا گیا(امام ابن قیم مدارج السالکین 2/28 لکھتے ہیں کہ عزیمت وصبر ہرحال ومقام میں فائدہ دیتے ہیں۔متفق علیہ،یہ الفاظ بخاری کے ہیں 2/534 حدیث نمبر 2400 مسلم میں یوں آئی ہے کہ :کسی کو بھی صبر سے بہتراوروسیع تر عطیہ نہیں دیا گیا 2/729 حدیث نمبر:1053)کیونکہ اسی کے ذریعہ سے انسان نہ صرف یہ کہ ماموارت کو بجالانے

اور منہیات کو ترک کرنے پر ثابت قدم رہے گا بلکہ وہ مصیبتوں اور شدائد پر بھی ثابت قدم رہے گا اور ان کو اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھے گا جس سے اُس کے ایمان کی قوت کو جانچنا مقصود ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے، اس کا پورا معاملہ ہی خیر ہے، کہ اگر خوش حال ہو اور شکر ادا کرے تو اُس کے لیے خیر ہوگا اور اگر اُسے مصیبت لاحق ہو اور اس پر صبر کرے تو بھی اس کے لیے بہتر ہوگا (مسلم کتاب الزہد والرقائق 4/2295 المفردات فی غریب القرآن صفحہ 532)۔

**التقوی:** نفس کو اللہ کے عذاب سے بچالینے کا نام ہے۔ اس کا حصول یوں ہوگا کہ انسان اور مخلوقِ خدا اور انسان اور خالق سبحانہ کے مابین مضبوط تعلق قائم کیا جائے۔ یہ ایک قلبی بات ہے جو اللہ کی اطاعت سے پیدا ہوتی ہے۔ کہ اللہ کے امر پر عمل کیا جائے اور اس کی منع کردہ چیزوں سے باز رہا جائے۔ اس کا ادنی درجہ یہ ہے کہ آپ اپنے اور اللہ کے عذاب کے بیچ اور اپنے اور اس کی ناراضگی اور غضب کے درمیان ایک آڑ قائم کرلیں اور اپنے آپ کو شہوت کی ذلت میں نہ ڈالیں۔ اس کا اعلی درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے تبرّی کریں۔ اس طرح سے اللہ کا دھیان، احتساب نفس اور اپنے اور اللہ اور دوسری مخلوقات کے مابین تعلق کو اچھا کرے۔ اس مفہوم میں تقوی تمام معاملہ کی جڑ واصل ہے۔

کیونکہ یہ ایسا عنوان ہے جو آدمی کو تزکیہ کی قدروں سے روشناس کراتا ہے، جیسا کہ یہ وہ منطق اخلاقی ہے جو زندگی میں حرکتِ مسلم کو فریم ورک دیتی ہے۔ اور اس پر کوئی بات نہیں کی جاسکتی۔ جیسا کہ فرمایا: اللہ تو متقیوں سے ہی قبول کرتا ہے (المائدہ:27) وہی انسانوں کے مابین تفاضل کی اساس اور اس کا واحد معیار ہے۔

**یا ایھاالناس اناخلقناکم من ذکر:** لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنادیے، تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کرو، اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے، بے شک خدا سب کچھ جاننے والا اور سب سے خبردار ہے (الحجرات:13) وہ حرکتِ حیات میں مسلمان کا زادراہ ہے۔ وتزودو: اور زادراہ (یعنی رستے کا

خرچ) ساتھ لے جاؤ کیونکہ بہتر (فائدہ) زادراہ (کا) پرہیز گاری ہے اور اے اہل عقل مجھ سے ڈرتے رہو (البقرۃ:197) اوراسی وجہ سے اللہ نے تقوی کی وصیت اولین وآخرین کو کی، جیسا کہ فرمایا: ولقد وصینا الذین اوتوا الکتاب: اور جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی ان کو بھی اور (اے محمد) تم کو بھی ہم نے حکم تاکیدی کیا ہے کہ خدا سے ڈرتے رہو اور اگر کفر کروگے تو (سمجھ رکھو کہ) جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے اور وہی سزاوار حمد وثنا ہے (النساء: 131) جیسا کہ اللہ کے رسول نے اس کی وصیت تمام مسلمانوں کو کی، ابوسعید الخدریؓ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ میرے پاس ایک آدمی آیا اور نصیحت کا طلب گار ہوا، میں نے کہا تم نے وہی سوال کیا ہے جس کا سوال میں تم سے پہلے رسول اللہؐ سے کیا تھا تو آپؐ نے فرمایا تھا: میں تمہیں اللہ سے تقوی کی وصیت کرتا ہوں، وہی ہر شیئی کی جڑ ہے، اور تمہارے اوپر جہاد لازم ہے۔ کیونکہ جہاد ہی اسلام کی رہبانیت ہے، تمہارے اوپر اللہ کا ذکر اور قرآن کی تلاوت واجب ہے، کیونکہ وہ تمہیں زمین وآسمان میں راحت دے گا اور تمہارا چرچا کرے گا (اخرجہ الامام احمد 3/82 حدیث نمبر: 11791 ورواہ ابویعلی 2/283 جس میں یہ الفاظ ہیں علیک بتقوی اللہ فانہ جماع کل خیر"، ھیثمی مجمع الزوائد 4/215، احمد کے رجال ثقات ہیں اور ابویعلی نے بھی تخریج کی ہے مگر اس کی اسناد میں لیث بن ابی سلیم ہے جو مدلس ہے)۔

اس کی وصیت آپؐ نے صحابی جلیل ابوذرؓ کو بھی کی تھی جب فرمایا: اتق اللہ حیثما شئت جہاں رہو اللہ سے ڈرو، برائی کو بھلائی سے مٹادو، اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آؤ (اس کی تخریج گزر چکی ہے) تو یہ تین اصول، اخلاق کاملہ، کامل عقل، اور کمال عبودیت مکارم اخلاق کے نمائندہ اصول ہیں۔ یہ باریک قلبی اعمال ہیں یا امام ابن القیم کے لفظوں میں " یہ تینوں ارکان راہ سلوک کے امتیازی نشان اور نقوش راہ ہیں، اگر کوئی ان کے اوپر سلوک کی منزلیں طے نہیں کرتا تو وہ پورا راستہ نہیں چل سکتا، اگر اپنے آپ کو راہِ سلوک کا راہی سمجھے۔ کیونکہ اس صورت میں اس کا چلنا منزل مقصود کی طرف نہ ہوگا، یا اگر منزل کی طرف بھی جائے گا تو گرتے پڑتے اور بندھا ہوا ہوکر۔ یا اس کی مثال ایسی ہوگی کہ وہ سرکش گھوڑے پر سوار ہے جو ایک قدم آگے بڑھاتا ہے تو دس قدم پیچھے۔ کیونکہ عدم اخلاص اور عدم

استقلال نے اس کی منزل کھوٹی کردی ہے۔ اور اگر وہ اس پر چلنے میں پوری جدوجہد نہیں کرے گا تو ایسے چلے گا جیسے بیڑیوں میں بندھا شخص جاتا ہے۔ اور جس کو یہ تینوں نشاناتِ راہ مل گئے تو اُس کی رفتار کے کیا کہنے!

کوئی بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے (امام عینی کہتے ہیں کہ: ربانی وہ ہے جو اللہ سے محبت کرتا ہو اور اس کا عارف ہو، عمدۃ القاری، 2/43 مزید دیکھیے مختار الصحاح اور تاج العروس باب الراء) تو ان تینوں اصولوں کے ذریعہ سے اُس انسان کا تزکیہ ہوتا ہے جو خلیفہ بنایا گیا ہے، جو استخلاف کا مفہوم پورا کرسکتا ہے، اور جو اللہ کے امر و نہی کے مطابق زمین کو آباد کرسکتا ہے۔ اور 'ربانی اخلاق' کے مطابق وہ زندگی کو حرکت دے سکتا ہے۔ اور اس کے بدن کی ہر رگ و پے میں اخلاق کے اثرات جاری وساری ہوں گے، اس کی روح کے ذرہ ذرہ میں اخلاق رچا بسا ہوگا۔ اِس طرح کے انسان اسلام کی ابتدائی صدیوں میں پائے گئے تھے اور کسی بھی زمانہ میں پائے جاسکتے ہیں، اگر انسان تزکیہ کے اس نظام کے مطابق پوری تیاری کرے اور اپنے تمام احوال میں ربانی بن جائے۔ اللہ کے ساتھ مشغول ہو اور اس کو یہ ادراک ہوجائے کہ غیر اللہ کے ساتھ اس کا ہر اشتغال اسے ہمیشہ اور مسلسل اللہ کی یاد دلاتا رہے۔ اس کے معاملات میں یہ پہلو اوجھل نہ ہو اور اس کی زندگی کا کوئی بھی گوشہ اللہ کے حقوق کے پاس ولحاظ سے خالی نہ ہو۔ وہ ہمیشہ اس کا محتاج ہو، یہاں تک کہ شریعت پر عمل اس کی زندگی کی عادت ثانیہ بن جائے۔ اس کا قول، اس کا فعل، اس کا اشارہ، اور حال غرض زندگی کے ہر گام پر وہ یہ سمجھے کہ اللہ اس سے مخاطب ہے، اور وہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ اس طرح اللہ سے اس کا جو تعلق قائم ہوگا، وہ اس کے دوسرے تمام تعلقات کو بھی منضبط کرے گا۔ جیسا کہ اللہ کا یہ قول بتاتا ہے۔: قل ان صلاتی ونسکی : یہ بھی کہ دو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب خدائے رب العالمین کے لیے ہے (الانعام:162)۔

یوں انسانوں کو وہ ''انس'' ملے گا جو اس کو روحانی طور پر غذا دے گا، جو مزید تقرب اور سکینت عطا کرے گی جس سے وہ اپنے ساتھ معاملہ کرنے کے آداب سیکھے گا اور اسے غیر کے ساتھ

تعامل کے آداب معلوم ہوں گے۔ تو وہ اس کے ساتھ صلح صفائی کرے گا۔ اسی طرح اُسے معلوم ہوگا کہ شرع کے ساتھ اس کا رویہ کیا ہو۔ جسے وہ اختیار کرے اور کائنات کے ساتھ اس کا معاملہ کس طرح کا ہو کہ وہ اسی کے مطابق کائنات سے تعلق استوار کرے۔ اِس طرح اس کو اپنے ''حال'' میں درستگی اور انجام کار فلاح حاصل ہوگی۔

**ثانیا:** حق غیر کو پورا کر کے تزکیہ حاصل کرنا (غیر سے یہاں مراد ''ذات'' کے ماسوا ہر ایک ہے، چاہے یہ غیر دوسرا مسلمان ہو جوان بنیادی اور اعلی اقدار پر ایمان رکھتا ہے جو اسلام لے آیا ہے، یا وہ غیر مسلم ہو جو عقیدہ اور اصول میں اس سے اختلاف رکھتا ہو)۔

اگر مسلمان اپنی تہذیبی کوشش میں ''عبادت میں طاعت'' کے اصول پر عمل پیرا ہوتا ہے، تو وہ ''معاملات'' میں طاعت کے اصول پر بھی عمل کرتا ہے، جس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ''اپنے اور غیر'' کے ساتھ معاملات کرنے میں نفس کا تزکیہ کرنا جس کا منہج الٰہی ہو جس میں عدل اور احسان بنیادی مقام کے حامل ہیں۔ اور غیر کے ساتھ مسلمان کے ساتھ تعلقات کو ایک فریم ورک دیتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا: ان اللہ یامر: اللہ تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور نامعقول کاموں سے اور سرکشی سے منع کرتا ہے (اور) تمہیں نصیحت کرتا ہے تا کہ تم یاد رکھو (النحل :90) علماء کہتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ قرآن کی سب سے جامع آیت ہے۔ اور اگر قرآن میں یہی ایک آیت ہوتی تو بھی کافی ہوتا۔ کیونکہ اس میں ہر چیز کا بیان و ہدایت ہے (الشیخ مرعی المقدسی، قلائد العقیان، تحقیق عبدالحکیم الانیس، طبع اول (دبئی دار البحوث للدراسات الاسلامیۃ و احیاء التراث، 1426ھ 2005 صفحہ 75)۔

اور جب رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کو یہ آیت پڑھ کر سنائی تو ان کے فصحاء تک بول اٹھے: خدا کی قسم آپ تو مکارم اخلاق اور محاسن اعمال کی طرف دعوت دے رہے ہیں (مرجع سابق، صفحہ 77) یعنی مسلم کا غیر کے ساتھ منہج تزکیہ کے مطابق سلوک کئی معیاروں کا پابند ہوگا، تو طاعت فی المعاملہ کی اصل یہی ہے جس کے محرکات وضوابط بھی ہیں اور ان سے درج ذیل مقاصد و وسائل نکلتے ہیں۔

ا۔سب سے اہم معیار "عدل" ہے، غیر کے ساتھ معاملہ میں کرنے میں عدل کا کردار محوری اور بنیادی ہے۔ چنانچہ دوسری تمام قدروں کو اسی کے سیاق میں دیکھا جائے گا کیونکہ وہ سب ابتدا سے انتہاء تک اُسی سے جڑی ہوئی ہیں۔اس کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ اسلامی اصولوں کے مطابق اپنے اور غیر کے حقوق کی حفاظت کرے، کیونکہ اسلام میں ہر مخلوق کے حقوق ہیں اور عدل یہ ہے کہ بندہ ان سب حقوق کا پاس ولحاظ رکھے اور ان کو ادا کرے۔ بلکہ اس معاملہ میں جتنا حکم ہے اس سے بڑھ چڑھ کر کرے۔حقوق اللہ ہوں یا بندوں کے حقوق ہوں ان کو کامل طور پر ادا کرے۔جیسا کہ ابن القیم کہتے ہیں: (مدارج السالکین 1/476) اور جیسا کہ حدیث نبوی ہے: تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے (متفق علیہ) اور فرمایا: تم میں سے جس کو یہ پسند ہو کہ اسے آگ سے دور کیا جائے اور جنت میں داخل کیا جائے ،تو اس کی موت اِس حال میں آئے کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور لوگوں کے لیے بھی وہی پسند کرتا ہو جو اپنے لیے کرتا ہے (مسند احمد بن حنبل 2/161 حدیث نمبر 6503)۔

پھر ایسا بھی نہیں کہ بات صرف معاملاتی ہو بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر عدل کرنے کا حکم ہے: جیسا کہ فرمایا: اللہ تم کو امانتیں امانت والوں کو دینے کا حکم کرتا ہے اور یہ حکم دیتا ہے کہ جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو اللہ تمیں بہت ہی اچھی نصیحت کرتا ہے، بے شک اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے (النساء:58)۔

پھر اگر حاکم عدل کرنے میں صراحت اور باریک بینی سے کام نہ لے گا تو ایسا سمجھا جائے گا جیسے دوسرے کے حق میں کمی زیادتی کر رہا ہو، جو کہ بعینہ ظلم ہے،ایک حدیث قدسی میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی فرماتا ہے: اے میرے بندو! میں اپنے اوپر ظلم کو حرام کرلیا ہے اور تمہارے لیے بھی اس کو ظلم قرار دیا ہے تو ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو (اس کی تخریج امام مسلم نے کی ہے کتاب البر والصلۃ والآداب حدیث نمبر 2577) یہ حدیث واجب کرتی ہے کہ مسلمان اپنے ہر عمل میں "ظلم اور اسباب ظلم سے

پورے طور پر خالی ہواور ہر عمل میں ہمیشہ اللہ کی طرف متوجہ رہے جوصفت عدل سے آراستہ ہے۔یہی ہر اچھے اور نیک اور مصلحانہ کام کی بنیاد ہے۔

عادلانہ معاملہ کا یہی معیار دراصل اس فقہ کی بنیاد بنتا ہے جواداء حقوق کی حریص ہے ،جیسا کہ حقوق کے سلسلہ میں وارد احادیث میں کہا گیا ہے جس میں سب سے مشہور وہ متفق علیہ حدیث ہے جس کے راوی ابو ہریرہؓ ہیں جو کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے سنا کہ: ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں : سلام کا جواب دینا،مریض کی عیادت کرنا، جنازوں کے پیچھے جانا، دعوت قبول کرنا اور چھینکنے والے کی چھینک کا جواب دینا (مرجع سابق 10/380) جیسا کہ وہ اس فقہ کی بنیاد بھی بنتا ہے جو فقہ ان حرمات کے احترام کی حریص ہے جن کو ابو ہریرہؓ کی حدیث نے بیان کیا ہے کہ اللہ کے رسول نے فرمایا: تم آپس میں حسد نہ کرو نہ ایک دوسرے سے غبن کرو، نہ عداوت کرو اور نہ ایک دوسرے کی جڑ کاٹو۔نہ ایک آدمی دوسرے کی بیع پر بیع کرے ،اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو،مسلمان مسلمان کا بھائی ہے ،نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اس کو چھوڑتا ہے اور نہ اس سے حقارت برتتا ہے ۔تقوی یہاں ہے،(یہ کہ کر آپ ﷺ نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ فرمایا) آدمی کے برا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے ، ہر مسلمان ،مسلمان کے لیے محترم ہے،اس کا خون ،اس کا مال اور اس کی ''آبرو'' (بخاری نے اس کی تخریج کی ہے،کتاب الجنائز باب الامر باتباع الجنائز 1/418 حدیث نمبر 1183 اور مسلم نے اس کی تخریج کتاب السلام باب من حق المسلم للمسلم میں کی ہے 4/1704 حدیث نمبر 2162) اوران سب کو دولفظوں میں یوں کیا جاسکتا ہے کہ ''سب کا خیال رکھا جائے ، ہمیشہ اپنا احتساب اور غیر کی حرمت کو ملحوظ رکھیں (مسلم نے اس کی تخریج کتاب البر والصلة والآداب میں کی ہے۔حدیث نمبر 2564)۔

یہاں یہ بھی یادرکھیں کہ اداء حقوق اور حرمتوں کے لحاظ رکھنے والی فقہ کی اساس جو عدل ہے وہ صرف مسلمان کے حقوق دوسرے مسلمان پر بیان نہیں کرتا بلکہ اسی طرح ہمارے اوپر غیر مسلموں کے حقوق کو بھی بیان کرتا ہے۔اور تاکید کرتا ہے کہ ان کے حقوق کا پاس اور احترام واجب ہے اور ان کے

مسلمانوں سے الگ رہنے اور مغایرت کے حق کی پوری نگہ داشت کی جائے گی۔ اوراس کی حفاظت وحمایت کی جائے گی۔

یہ ایسا ضروری قاعدہ ہے کہ جس سے خروج مسلمان کے لیے جائز ہی نہیں ہوگا (جمہوریت کے گن گانے والی حکومتوں میں اقلیتوں کے حقوق کے برخلاف، کہ جہاں یہ حقوق اکثریت کی رائے کے تابع ہوتے ہیں۔ اوران کے ثابت رہنے کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاتی، جس کو ہم یوروپی ممالک میں اس استصواب رائے کی شکل میں دیکھ سکتے ہیں جو وہ وقتاً فوقتاً مسلمان اقلیتوں کو کبھی حجاب واسکارف سے محروم کرنے اور کبھی اذان کے میناروں پر پابندی لگانے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثریت کی رائے پر عمل کرتے ہیں!!) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے کسی معاہد پر ظلم کیا، اُس کے حق میں کمی کی یا اُس کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلّف بنایا، یا اُس سے کوئی چیز بغیر اس کی خوشی کے لے لی تو قیامت کو میں اس کی طرف سے مقدمہ پیش کروں گا۔

اور بیہقی کی روایت میں مزید یہ اضافہ ہے کہ آپؐ نے اپنی انگلی سے اپنے سینہ کی طرف اشارہ کیا اور کہا ''جان لو کہ جس نے کسی معاہد کو قتل کیا، جس کو اللہ اور رسول کا ذمہ حاصل ہو، اللہ اس پر جنت کی خوشبو حرام کردے گا حالانکہ اس کی خوشبو 40 سال کی مسافت پر سے آتی ہے (اس کی تخریج ابوداؤد نے کی ہے 30/170 حدیث نمبر 3052 اور بیہقی نے اپنی سنن صغری میں کی ہے، 8/154 حدیث نمبر 3766 اور سنن کبری میں کی ہے 9/205 حدیث نمبر 18511) اور قاعدہ ''ان کے بھی ہمارے جیسے حقوق ہیں اوران پر ہمارے جیسے فرائض ہیں''۔

اسلامی دستور کی اساس ہے، جس میں کسی اجتہاد کی گنجائش نہیں (غیر مسلموں کے ساتھ مسلم ریاست کے اس موقف کا کہ وہ ان کی پوری زندگی کو مامون قرار دیتی اوران کو مسلمانوں کے مماثل ہی حقوق دیتی ہے اوراس چیز کو بنیادی اہمیت دیتی ہے جس کی خلاف ورزی جائز نہیں، تقابل یہودیت اور محرف عیسائیت سے کیجئے جہاں دوسروں کو غلام بنالیا جاتا اوران پر ظلم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سفر اشعیاہ، اصحاح، ۹۴ میں صہیون سے خطاب کرکے کہا گیا ہے: ان کو زمین کی طرف منہ کرکے تیرے لیے سجدہ کرنا چاہیے، اور تیرے پاؤں کے غبار کو چاٹنا چاہیے اور تلمود میں ہے کہ: کتاب مقدس کی تعلیم یہ ہے کہ ہم غیر یہودی سے زیادہ کتے کی توقیر کریں، ہر یہودی غیر یہودی کا خون بہا کر خداوند کے لیے قربانی دیتا ہے!! اور یہ دیکھیے کہ دوسری تہذیبوں نے اقلیتوں کے ساتھ کیا کیا۔ انہوں نے ان کو یا تو برباد کردیا یا ان کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جو آج بھی ان کے

لیے باعث شرم ہے۔جبکہ ہم نے ان کی حفاظت کی ۔عیسائیوں نے اِن اقلیتوں کے لیے دوہی آپشن رکھے تھے یاتو عیسائی ہوجائیں یامٹادیے جائیں''اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں: یہودیت اورعیسائیت میں غیر کا تصور،ڈاکٹر رقیہ علوانی،خدا ایسا نہیں ہے ،جرمن اسکالر،زیجر ڈ ہونکہ ،عیسائیت اور بت پرستی ،الیکزنڈر کراؤجوک ،عیسائیت اورتلوار، پادری کازاکس،صلیبیوں کے نقش قدم پر،جان جوئبر،نہایۃ الاندلس وتاریخ العرب المتنصرین،عبداللہ عنان )۔

یہاں تک کہ اسلام نے''اقلیت کی اصطلاح'' کی ضرورت بھی نہیں سمجھی بلکہ''امت واحدہ'' (نیشن،قوم ) کی اصطلاح استعمال کی جس میں قوم کے تمام عناصر وشہری شامل ہیں ۔جس کی وضاحت اس''وثیقہ ،یا''صحیفہ''یاکتاب میں کی گئی ہے جورسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے مہاجرین وانصاراور یہودیوں کے مابین لکھوایا تھا۔

جس کوعرف عام میں میثاق مدینہ کہا جا تا ہے (میثاق مدینہ کی تفصیل کے لیے دیکھیں: احمد قائدالشعیبی ، وثیقہ المدینۃ ،الدلالۃ والمضمون، کتاب الامۃ قطر)۔جس میں آپ نے ان سے صلح کی ،ان سے معاہدہ کیا اوران کے دینی، مذہبی اور مالی حقوق کی حفاظت کی یقین دہانی کرائی ۔ان کے اوپر شرائط عائد کیں اوران کے حقوق متعین کیے ۔اور بات صرف اتنی نہ رہی کہ ان کے وجودکا اعتراف کیاجا رہا ہے بلکہ اسلامی سلطنت کے دائرہ میں ان کوبھی امت مسلمہ کی ایک اکائی سمجھا گیا حالانکہ عقیدہ میں وہ مختلف تھے ،پھربھی اس اختلاف کو اس لیے گوارا کیا گیا کہ انہوں نے اسلامی تہذیب کے سایہ میں رہنا پسند کیا تھا۔اس لیے اسلامی حدود کے اندراندران کوبھی اپنا تعمیری کردارادا کرنے اوراس کو چلانے میں شرکت کرنے کاحق دیا گیا۔امام قرافی کہتے ہیں:''عقد ذمہ سے ہمارے اوپران کے حقوق واجب ہوجاتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے پڑوسی ہیں اور ہماری ذمہ داری میں ہیں اوراللہ ورسول اوراسلام نے ان کا ذمہ لیا ہے ۔اب اگرکوئی ان کے حق میں زیادتی کرتا ہے،مثلا ان کے حق میں کلمۂ سوء کہہ دیتا ہے، یاکسی کی غیبت کردیتا ہے یاکسی بھی طرح کی کوئی تکلیف پہنچاتا ہے،تواُس نے اللہ،رسول اوراسلام کے ذمہ کوضائع کردیا۔اسی طرح ابن حزمؒ نے اپنی 'مراتب الاجماع' میں نقل کیا ہے کہ: کوئی شخص جو ہمارے ذمہ میں ہو،اوراہل حرب اُس کا قصد کرکے ہمارے ملک میں آجائیں تو ہم پرواجب ہوگا کہ

فوج اور ہتھیاروں کے ساتھ ان اہل حرب سے جنگ کریں اور اہل ذمہ کا دفاع کریں۔

کیونکہ وہ اللہ ورسول کے ذمہ میں ہیں اور ان کو دشمن کو دے دینا عقد ذمہ کی خلاف ورزی ہے، ابن حزم نے اس بارے میں امت کا اجماع نقل کیا ہے'' اور اسی وجہ سے ان کے کمزور کے ساتھ نرمی، غریب کی ضرورت کو پورا کرنا، اور بھوکے کو کھلانا، ننگے کو پہنانا اور ان سے نرم بات کرنا، مہربانی اور لطف کے طور پر واجب ہے مگر ان سے خوف نہ کھانا چاہیے نہ ان کے آگے ذلیل ہونا چاہیے۔ اور پڑوس میں رہنے کے باعث ان کی اذیت برداشت کر لینی چاہیے ان کی تعظیم یا خوف کی بنا پر نہیں بلکہ لطف کی بنیاد پر ہے، گرچہ ہمیں ان کی اذیت دور کرنے کی قدرت ہو، اور ان کی ہدایت کی دعا کرنی چاہیے۔ ان کو خوش وخرم رکھنا چاہیے۔ اور دین ودنیا کے تمام امور میں ان کے ساتھ خیر خواہی کرنی چاہیے۔ کوئی ان کے غائبانہ میں ان کو نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی حفاظت کرنا، ان کے مالوں، ان کے عیال اور ان کی آبروؤں کو بچانا اور ان کے تمام حقوق ومصالح کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔ ان سے زیادتی رفع کرنے میں اور ان کے تمام حقوق انہیں پہنچانے میں ان کی مدد کرنی چاہیے۔ کیونکہ یہ سب مکارم اخلاق میں سے ہے۔ لیکن یہ سب کرتے ہوئے ہم ان کی تعظیم اور اپنی تحقیر نہ کریں، بلکہ ایسا ہمیں اس لیے کرنا ہے کہ رب تعالیٰ اور ہمارے نبی کا یہی حکم ہے (کتاب الفروق مع حواشی 29-2/30)۔

اسلام نے اپنے آپ کو اسی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ وضعی مذاہب وافکار کے ماننے والوں کو بھی اہل کتاب کے زمرہ میں رکھ کر ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا۔ فقہ اسلامی کا موقف بھی یہی ہے۔ امام قرطبی کہتے ہیں: پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کا حکم مستحب ہے پڑوسی چاہے مومن ہو یا کافر۔ یہی صحیح قول ہے اور یہ احسان، مواسات، حسن معاشرت، ان کو تکلیف نہ دینے اور ان کا دفاع سب کو شامل ہے۔ بخاری نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: جبریل مجھے برابر پڑوسی کے بارے میں نصیحت کرتے رہے، یہاں تک کہ مجھے گمان ہوا کہ وہ اس کو وراثت میں حصہ دلوادیں گے۔ ابوشریح سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: خدا کی قسم وہ مسلمان نہیں خدا کی قسم

وہ مسلمان نہیں، خدا کی قسم وہ مسلمان نہیں، آپ سے پوچھا گیا یارسول اللہ ﷺ کون؟ فرمایا: وہ جس کا پڑوسی اس کی اذیتوں سے محفوظ نہ ہو، یہ ہر پڑوسی کے بارے میں عام ہے، آپ نے تین بار قسم کھا کر ان کو اذیت نہ دینے پر زور دیا ہے (تفسیر القرطبی 5/183) یہ سب اللہ کے قول **لاینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین** : جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں لڑی اور تمہیں جلاوطن نہیں کیا ان کے ساتھ سلوک واحسان کرنے اور منصفانہ بھلے برتاؤ کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہیں نہیں روکتا بلکہ اللہ تعالی تو انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے (الممتحنہ:8) کے مفہوم میں شامل ہے، اور غیر کے ساتھ رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ کا تقاضا ہے، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ''سہل بن حنیفؓ اور قیس بن سعدؓ قادسیہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس سے ایک جنازہ گزرا وہ کھڑے ہوگئے ان سے کہا گیا کہ یہ تو مقامی آدمی کا جنازہ ہے یعنی ذمی کا تو دونوں نے فرمایا: نبی اکرم ﷺ کے پاس سے ایک یہودی کا جنازہ گزرا تھا۔ آپ کھڑے ہوگئے تو آپ سے کہا گیا: یہ تو یہودی کا جنازہ ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا، کیا وہ انسان نہ تھا؟ (متفق علیہ) اس سلسلہ میں آپ ﷺ کا جو طریقہ تھا اُسے حافظ ابن کثیر نے ابن عساکر کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ حرملہ نام کا ایک آدمی نبی ﷺ کے پاس آیا اور بولا: ایمان یہاں ہے اور یہ کہ کر اپنی زبان کی طرف اشارہ کیا اور اپنے دل کی طرف اشارہ کرکے بولا کہ یہاں نفاق ہے اور میں اللہ کو کم ہی یاد کرتا ہوں، آپ ﷺ نے اس کے لیے دعا فرمائی کہ یا اللہ اِس کو ذکر کرنے والی زبان اور شکر کرنے والا دل عنایت کردے، اِسے میری محبت اور میرے چاہنے والوں کی محبت دے اور اس کے معاملہ کو خیر وخوبی کی طرف گامزن کردے۔ کہنے لگا یارسول للہ میرا ایک منافق دوست ہے اور میں خود منافقین کا سردار تھا، کیا میں ان کو آپ کے لیے لے آؤں؟ آپ نے فرمایا: جو ہمارے پاس آئے گا ہم اس کے لیے دعاء مغفرت کردیں گے، اور جو اپنے گناہ پر اصرار کرے گا تو اس سے اللہ نمٹے گا مگر تم ہرگز کسی کے عیب پر سے پردہ نہ اٹھاؤ (تفسیر ابن کثیر 2/385، اس حدیث کو امام سبکی نے طبقات الشافعیہ الکبری میں نقل کیا ہے

1/122 اور مسند الشہاب میں آئی ہے 2/84)۔

**احسان کا معیار:** (یہاں احسان سے مراد بندگی والا احسان نہیں، جو دین کے اعلیٰ مراتب میں سے ہے جیسا کہ اس حدیث میں آیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت یوں کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر یہ نہ ہو تو یہ احساس ہو کہ گویا وہ تمہیں دیکھ رہا ہے، بلکہ یہاں مراد معاملات میں احسان کرنا ہے جو انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں اخلاق کا اعلیٰ مرتبہ ہے) احسان عدل سے آگے بڑھ کر ہے چنانچہ اگر عدل یہ ہے کہ آدمی حکم لگانے اور معاملہ کرنے میں اپنے یا غیر کے ساتھ صحیح صحیح حق کو ملحوظ رکھے تو احسان کا مرتبہ اس سے آگے کا ہے، وہ امام شاطبی کی تعبیر کے مطابق نفس کی لذتوں کو ختم کر کے بندگی کے قدم پر کھڑے ہو جانا ہے (الموافقات 4/240) جس کا ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ غیر کے کاموں میں خیر کا پہلو ڈھونڈے اور اونچا مرتبہ یہ ہے کہ غیر کی وجہ سے اپنے آپ کو قربان کر دے اور اوسط مرتبہ یہ ہے کہ غیر کی تکلیف پر صبر کرے اور اس کے لیے عذر ڈھونڈے اور اس کی برائیوں سے درگزر کرے اور برائی کا بدلہ بھلائی سے دے۔

یعنی ایک انسان کا معاملہ دوسرے انسان سے صرف یہ نہ ہو کہ اس سے کام لے یا اس کا کام کر دے، بلکہ یہ ہونا چاہیے کہ اس کی خیر خواہی چاہے اور اس سے خیر کے کام کرائے، اس سے فساد کو روکے یا اس کے ذریعہ فساد کو رکوائے (طٰہٰ عبدالرحمٰن، الحق الاسلامی فی الاختلاف الفکری صفحہ 21) یہی اللہ کے نبی ﷺ کے اس قول کا مطلب ہے کہ: اللہ نے ہر چیز میں احسان واجب کر دیا ہے (اس کی تخریج امام مسلم نے صحیح میں کی ہے کتاب الصید والذبائح: حدیث نمبر 1955)۔

امام قرطبی اس مفہوم کی وضاحت میں لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ خلق خدا ایک دوسرے پر احسان کرے، یہاں تک کہ اگر تم نے کوئی پرندہ بھی پنجرہ میں بند کر رکھا ہو، یا تمہارے گھر میں بلی ہو، تو وہ دونوں بھی تمہارے حسن سلوک کے مستحق ہیں (تفسیر القرطبی 10/166) حسن معاملہ کا یہ معیار اس فقہ کی بنیاد ہے جو نیکیاں کرنے والی فقہ ہے، چنانچہ حافظ ابن ابی الدنیا اپنی سند سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: تمہارے اوپر بھلائی کرنا واجب ہے، کیونکہ نیکی کرنے سے غلط جگہ موت نہیں آتی، اور صدقہ خاموشی سے کیا کرو، کیونکہ اس سے اللہ عزوجل کا غصہ ٹھنڈا پڑتا ہے (ابن

ابی الدنیا، قضاء الحوائج تحقیق: مجدی السید ابراہیم (القاہرہ: مکتبہ القرآن صفحہ 25 اسی کے مثل بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کی ہے۔ 7/445 حدیث نمبر 10927)۔

ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نبی ﷺ کے پاس آیا اور بولا: یا رسول اللہ، اللہ کو لوگوں میں کون سب سے زیادہ پسند ہے، اور اللہ کو سب سے محبوب عمل کونسا ہے، تو اللہ کے رسول نے فرمایا: اللہ کو تم سب سے محبوب بند ہو جاؤ گے اگر تم کسی مسلمان کو خوشی پہنچاؤ یا اس کی تکلیف دور کرو، یا اس کا قرض اتار دو یا اس کی بھوک مٹا دو۔ اور یہ بات کہ میں اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے اس کے ساتھ جاؤں مجھے اس مسجد (مسجد نبوی) میں مہینہ بھر اعتکاف میں بیٹھنے سے زیادہ پسند ہے۔ جو اپنے غصہ کو روکے گا اللہ اس کی شرم گاہ کو چھپائے گا اور جو اپنا غصہ پی لے گا، حالانکہ غصہ نکالنے کی قوت رکھتا ہے۔ تو اللہ اس کے دل کو قیامت میں امیدوں سے بھر دے گا۔ جو آدمی اپنے بھائی کی ضرورت کے لیے اس کے ساتھ چلا اور اس کی ضرورت پوری کر دی اللہ اس کے قدم اس دن ثابت رکھے گا جس دن قدم لڑکھڑائیں گے (ہیثمی نے مجمع الزوائد 8/191 میں کہا: اس حدیث کی تخریج طبرانی نے تینوں معاجم میں کی ہے۔ جس میں مسکین ابن سراج ہے جو ضعیف ہے) حدیث میں جو بھلائی کرنے کا حکم آیا ہے یہی مراد ہے اللہ کے ارشاد اقتحام عقبۃ (اقتحام کے لفظی معنی کسی چیز میں قوت سے بغیر کسی غور وفکر اور مشکلات کی پرواہ کیے گھس جانا ہے۔ العقبۃ پہاڑ کی اونچی و دشوار چڑھائی کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد جیسا کہ آیت کریمہ بیان کرتی ہے وہ نیک عمل ہے جس کے لیے انسان کو جدوجہد کرنی چاہیے۔ یا ایسے مشکل احوال ہیں جن کو بس صالحین ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ امام راغب اصفہانی المفردات کے صفحہ 43 میں کہا ہے۔ '' تو عقبہ وہ عمل ہے جس سے انسان اعلی درجہ حاصل کرتا ہے، یعنی وہ عمل جس سے اس کا تزکیہ ہو، اور معلوم ہے کہ تزکیہ خاص طور پر انسان کے عملی ارتقاء کو بتاتا ہے اور '' گھاٹی '' میں داخل ہونے کا مطلب ہے اس تزکیہ میں پورے زور سے شامل ہو جانا۔ الحق الاسلامی فی الاختلاف الفکری صفحہ 234) سے، جس کا مفہوم ہے غیر کی آزادی کی حفاظت، اس کی محتاجی دور کرنا اور ضرورت پوری کرنا۔ جیسا کہ فرمایا: **فلا اقتحم العقبة**: سو اس سے نہ ہو سکا کہ گھاٹی میں داخل ہوتا (البلد: 11)۔

جیسا کہ احسان اس فقہ کی بنیاد بھی ہے جو ایثار و قربانی کی اخلاقیات پر حریص ہو۔ یہ فقہ امام

شاطبی کے نزدیک دووجھوں پر قائم ہے (الموافقات 2/353-354) پہلی صورت یہ ہے کہ بندہ استبدادکو ختم کرکے سب کی مواسات کرے ،یوں کہ دوسروں کو اپنے جیسا سمجھے کہ اپنا بھائی، بیٹا، رشتہ داراورعزیز یتیم کی طرح ان کو خیال کرے ۔جس کی نگہ داشت اس کے اوپرواجب یامستحب ہے۔مخلوق خدامیں وہ نیکی ،اصلاح اور بھلائی پھیلانے کے کام کرےاور نبی اکرم ﷺ کے اس قول کی عملی تفسیر بن جائے کہ مومن دوسرے مومن کے لیے بمنزلہ عمارت کے ہےجس کاایک حصہ دوسرے حصہ کوتقویت دیتاہے۔ یہ کہ کرآپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کوایک دوسرے سے گتھ دیا(متفق علیہ)۔

اورآپ ﷺ نے فرمایا:مسلمان مسلمان کے لیے بھائی ہوتاہے،نہ اس پرظلم کرتاہے نہ اسے دشمن کےحوالے کرتاہےاور جواپنے بھائی کی مددکرے گا،اللہ اس کی مددکرے گا،جومسلمان سے کسی تکلیف کو دورکرے گااللہ اس کے بدلہ میں قیامت کی تکلیفوں میں سے اس کی ایک تکلیف دورکردے گا۔اور جوکسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا،اللہ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا (متفق علیہ)۔توجب معاملہ یوں ہوتو بندہ کو یہ اختیارکہاں رہتاہے کہ وہ دوسرے کے لیے کچھ اوراپنے لیے کچھ اور پسندکرے۔وہ دوسراجواسی کی مثل ہے یاوہ ہےجس کی نگہ داشت کا اسے حکم ہے۔مثال کے طور پر باپ ایسانہیں کرسکتا کہ خودکھالے بچوں کو نہ کھلائے ۔احسان کرنے والے شخص کی بڑی تعریف کی جاتی ہے۔

خودرسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایسےلوگ تھے چنانچہ آپؐ نے بعضوں کی بڑی تعریف فرمائی،مثال کےطور پراشعری قبیلہ کےلوگ جب جنگ میں کسی کا شوہرمرجاتا یاشہر میں جب ان کا کھاناکم پڑجاتاتووہ اپناسب مال ایک کپڑے میں جمع کردیتے اورپھرایک برتن میں بھربھرکرآپس میں برابربرابرتقسیم کرلیتے ۔توآپؐ نے ان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ: وہ مجھ سے ہیں اورمیں ان سے (متفق علیہ)۔

کیونکہ نبی اس معنی میں امام اعظم اورمشفق باپ ہوتاہے کہ امت کوچھوڑکروہ اپنا آپ نہیں چاہتا،چنانچہ آپ ﷺ کسی چیز میں خودرائی نہیں برتتے تھے۔مسلم میں ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے

کہ انہوں نے کہا: جس دوران ہم نبیؐ کے ساتھ سفر میں تھے کہ ایک آدمی اپنی سواری پر آیا، کہتے ہیں کہ وہ دائیں اور بائیں دیکھنے لگا تو رسول اللہؐ نے فرمایا جس کے پاس فاضل سواری ہو تو بغیر سواری والے کو دے دے، جس کے فاضل زادراہ ہو وہ اس کو دے دے جس کے پاس زادراہ نہ ہو۔ اسی طرح آپ ﷺ نے متعدد اصناف مال کا تذکرہ کیا، یہاں تک کہ ہم میں سے ہر ایک نے سمجھ لیا کہ فاضل چیز میں ہمارا کوئی حق نہیں ہے (متفق علیہ) مزید برآں ایک اور حدیث میں آپؐ نے بڑے معنی خیز انداز میں اس فاضل مال کو جو محتاج کو نہ دیا جائے شیطان کا مال بتایا۔ چنانچہ سعید بن ابی ہند کہتے ہیں کہ ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہؐ نے مجھ سے فرمایا: کچھ اونٹ اور کچھ گھر شیطان کے ہوتے ہیں، شیطان کے اونٹ وہ ہیں کہ تم میں سے کوئی اپنے ساتھ فالتو اور موٹے تازے اونٹ لے کر نکلے جس پر کوئی سوار نہیں ہوتا اور ایسے آدمی کے پاس سے گزرے جس کے پاس سواری نہیں مگر وہ اس کو نہیں بٹھاتا۔

رہے شیطان کے گھر تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ ان پنجروں کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں جن پر لوگ دیبا و حریر کے پردے لگاتے ہیں (اس کی تخریج مسلم نے کتاب اللقطہ میں حدیث نمبر 1278 میں کی ہے) اس حدیث نبوی کا مآل یہ ہے کہ فاضل مال خرچ کیا جائے۔ یہ ایک فقہی قاعدہ کی بنیاد بھی بنتی ہے کہ ''ضرورتوں کی وجہ سے اخلاقیات کے کام بھی واجب بن جاتے ہیں''۔ اور یہ کہ ''جب مسلمان محتاج ہوں تو کسی ایک آدمی کا مال میں حق نہ ہوگا سب کا ہوگا'' (ابوداؤد نے اس کی تخریج کی ہے۔ حدیث نمبر 2568 بیہقی نے سنن کبری میں، حدیث نمبر 10119) اسی لیے فقہا کہتے ہیں کہ: اگر جنگل میں دو آدمی ہوں، ایک بیمار پڑ جائے تو دوسرے پر اسکی خبر گیری اور تیمارداری واجب ہوگی'' (اس قاعدہ میں مصلحتوں اور ضرورتوں اور حکمت کی چیزوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے)۔ ظاہر ہے کہ فقہ اسلامی کا یہ ایک بلند اور اعلی اسلوب ہے جس کی امت کو زندگی کے کارزار میں ضرورت ہے۔

**دوسری وجہ:** ایثار نفسی ہے، جو اپنے حصہ کو ساقط کر لینے کا اعلی مرتبہ ہے یعنی یہ آدمی اپنی ضرورت پر دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دے۔ اس سے اس کے ایمان کی پختگی، توکل کی حقیقت اور اللہ

کی محبت میں اپنے بھائی کے لیے مشقت برداشت کرنا ہے (المنثور فی القواعد للامام الزرکشی 3/30) ظاہر ہے کہ یہ بلند اخلاقیات اور برتر کاموں میں سے ہے، اور خود رسول اللہؐ کے اسوۂ حسنہ میں اس کے نمونہ ملتے ہیں۔ آپؐ لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے اور خاص طور پر رمضان المبارک میں آپؐ سب سے زیادہ سخی ہوجایا کرتے تھے۔

جب جبریل آپؐ کے پاس آتے تو آپؐ تیز ہواؤں سے بھی زیادہ فیاضی برتتے تھے۔ اسی لیے حضرت خدیجہؓ نے کہا تھا: آپؐ لوگوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں، فقیر کو روزگار دلاتے ہیں، قدرتی آفات میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں''۔ ایک بار آپؐ کے پاس 90 ہزار درہم آئے آپؐ نے ان کو چٹائی پر ڈلوادیا اور کھڑے ہوکر تقسیم کرنے لگے۔ اور جو بھی مانگنے کے لیے آیا اس کو آپؐ نے دے دیا اور سارے درہم ختم کردیے۔ ایک بار ایک آدمی مانگنے کے لیے آیا، آپ نے فرمایا: ابھی تو میرے پاس کچھ نہیں ہے، مگر تم میری طرف سے خریداری کرلو، جب کہیں سے کچھ آئے گا تو تمہارا قرض ہم ادا کردیں گے۔ حضرت عمرؓ نے کہا، یا رسول اللہؐ، اللہ نے آپ کو طاقت سے زیادہ کا مکلّف نہیں بنایا۔ آپؐ نے اس بات کو پسند نہیں فرمایا، تو ایک انصاری بولے یارسول اللہ آپ خرچ کریں رب العرش آپ کو محتاج نہ کرے گا۔ یہ سن کر آپ مسکرادیے، اور آپؐ کا چہرہ کھل اٹھا اور فرمایا: اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ اس حدیث کی روایت ترمذی نے کی ہے (الموافقات 2/355)۔

اس طرح کے اخلاقیات ایثار کو پیدا کرنے میں تین چیزیں مددگار ہوتی ہیں۔ جن کو ابن القیمؒ نے مدارج السالکین میں ذکر کیا ہے (مدارج السالکین 299/1-) پہلی تعظیمِ حقوق: اس لیے کہ جو حقوق کو عظمت دے گا وہ ان کو ادا کرے گا۔ ان کا لحاظ رکھے گا، ان کو کسی بھی حال میں ضائع نہ کرے گا۔ اور اسے معلوم ہوگا کہ اگر وہ ایثار سے کام نہ لے گا تو اس کا حق ادا نہ ہوگا۔ اس لیے احتیاطا ایثار کو اختیار کرے گا۔ دوسری چیز ہے کنجوسی سے نفرت: کیونکہ اگر آدمی کنجوسی سے نفرت وبغض کرنے لگا تو اس سے وہ ایثار پسند بنے گا۔ تیسری چیز ہے مکارم اخلاق کی رغبت: تو جتنا اس کی رغبت بڑھے گی اس سے

ایثار بڑھے گا۔اور یوں بھی کہ ایثار مکارم اخلاق میں سب سے افضل درجہ رکھتا ہے۔

**۳۔مہربانی ورحم کا معیار:** یہ"طاعت فی المعاملۃ" کے اہم مبادی میں سے ہے۔ہمارے علماء نے یہ قرار دیا ہے کہ کمالِ سعادت دومعاملوں میں ہے،اللہ کے حکم کی تعظیم اوراللہ کی مخلوق پر شفقت (التفسیر الکبیر 27/56) یہ اللہ کے رسول کے درج ذیل ارشاد سے ماخوذ ہے: ہر مسلمان پر صدقہ واجب ہے ،لوگوں نے پوچھا: اے اللہ کے نبی اگر کسی کے پاس مال نہ ہوتو؟ فرمایا: وہ اپنے ہاتھ کام کرے اپنے آپ کو فائدہ پہنچائے اورصدقہ بھی کردے ،لوگوں نے کہا: اگر یہ بھی نہ ہو پائے ؟ فرمایا وہ محتاج ونادار کی مدد کرے۔لوگوں نے کہا اگر یہ بھی نہ کر سکے؟ فرمایا: بس وہ نیک عمل کرے،اور برائی سے دور رہے کیونکہ یہ بھی اس کے لیے صدقہ ہے(صحیح البخاری کتاب الزکوۃ،باب علی کل مسلم صدقۃ 1/524 حدیث نمبر 1376)

علامہ ابن حجر کہتے ہیں :"اس باب میں جو حدیثیں گزریں ان کا حاصل یہ ہے کہ : اللہ کی مخلوق پر شفقت ضروری ہے چاہے وہ مال سے ہو یا کسی اور چیز سے ،مال یاتو اسے حاصل ہو یا کمایا ہوا ہو۔اور غیر مال یا تو کام ہوگا ،اسی کو فریادرسی کہتے ہیں یا کسی چیز کا ترک ، اس کو امساک (رک جانا) کہتے ہیں (اِس سلسلہ میں ملاحظہ ہو ڈاکٹر عبدالرحمٰن طٰہٰ کی کتاب روح الحداثۃ : المدخل الی تاسیس الحداثۃ الاسلامیہ صفحہ 244) اسلامی نظریہ میں اصل یہ ہے کہ موجودات مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں رحمان ، جو اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی میں سے ہے، کے اخلاق اختیار کرتے ہوئے ۔اس طرح امام غزالی کے مطابق بندہ کو اللہ کے نام رحمان سے یہ حصہ ملتا ہے کہ اللہ غافل بندوں پر رحم کرتا ہے (الامام ابوحامد الغزالی،المقصد الاسنی فی شرح معانی اسماء اللہ الحسنیٰ تحقیق: بسام عبدالوہاب الجابی طبع اول 1/64 (قبرص دار الجفان والجابی 1407ھ 1984)۔

تو بندہ بھی ان کو غفلت سے ہٹا کر وعظ ونصیحت کر کے اللہ کی طرف لاتا ہے ، نرمی برتتا ہے سختی نہیں۔وہ عاصیوں کو رحمت کی نظر سے دیکھے حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھے۔دنیا میں جو بھی معصیت ہو اس سے وہ بندہ نفس میں سخت آفت محسوس کرے اوراپنی وسعت کے مطابق اس کو دور کرنے کی کوشش کرے۔اوراس کا منشاء یہ ہو کہ وہ عاصی اللہ کے عذاب سے بچ جائے۔اوراللہ کی صفت رحمانیت سے

خلق اوراس کے جوار کی وجہ سے بندہ کسی محتاج کو بھوکا نہ چھوڑے اسے کھلائے ۔اپنے پڑوس میں اوراپنے شہرمیں کسی فقیرکودیکھےتواس کی ضرورت پوری کردے چاہےاپنے مال سے یااپنی حیثیت سے یادوسروں سے اس کے حق میں سفارش کرکے ۔اگراِن میں کچھ بھی نہ کرسکے تواُس کے لیے دعا کرے۔ اس کی مصیبت پرغم کا اظہارکرے ۔اس کے ساتھ رقت ومہربانی سے پیش آئے اسے احساس دلائے کہ اس کی مصیبت وتکلیف میں وہ بھی اس کے ساتھ ہے(ایضا)۔

یہیں سے حدیث میں آیا ہے کہ ابوہریرہؓ نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن بن علیؓ کو چوما آپ کے پاس الاقرع بن حابس بیٹھا ہوا تھا،اقرع کہنے لگا کہ میرے پاس دس لڑکے ہیں میں نے کبھی کسی کونہیں چوما آپؐ نے اس کی طرف دیکھ کرفرمایا: جورحم نہیں کرتااس پررحم نہیں کیا جاتا(متفق علیہ) ابن حجر نے فرمایا: ابن بطال کہتے ہیں کہ اس حدیث میں تمام خلق خداکے لیے رحمت پر ابھارا گیا ہےتواس میں مومن وکافراوروہ چوپائے بھی شامل ہیں جوآپ کی ملک میں ہوں یاملک میں نہ ہوں(فتح الباری100/440)۔

اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ رحم صرف انسانوں کے درمیان نہیں بلکہ ان کےاوران کے اطراف میں پائی جانے والی اشیاء کے مابین بھی ہوتا ہے یہاں تک ساکن وجامد چیزوں کے درمیان بھی۔رحم کی صفت سے متصف مسلمان اپنے مسلمان بھائی پررحم دینی اخوت کی وجہ سے کرتا ہے،اور غیرمسلم پررحم انسانیت کی بناپرکرتا ہے،اورغیرانسان پراس لیےرحم کرتا ہے کہ وہ بھی زندگی کا حامل ہے ۔جیسا کہ مسلمان اُس آفاقیت کا مظہرہوتا ہے جورحمان کے نام سے جڑی ہوئی ہے!!رحمت کے یہ سب معنی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی توسیع ہیں۔جن میں آخری نبوت کے پیغام کاوصف یوں بیان کیا ہے۔''ہم نے آپ کوسارے جہاں والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے''۔(الانبیاء:107) یہ باہمی رحم دلی ہی ترقی یافتہ سلوک کا معیار ہے جونفس کے اندرغیرسے معاملہ کرتے وقت ،اعتدال ،توسط،خوش ذوقی،نزاکت احساس،رقت شعوراورطمانیت نفس پیدا کرتا ہے۔

کیونکہ رحمٰن بذات خوداسم الٰہی ہے جوہمیں آپس میں تعلق وتعارف کی اخلاقیات کی قدرت

دیتاہے۔اورجدلیاتی دور کے چیلنجوں کو دورکرتاہے،جن سے ہمارا آج کا زمانہ جوجھ رہاہے۔یہ معیارایساعالم وجود پذیرکرنا چاہتاہے،جس میں کائنات کے ذی روحوں اوراشیاء کے مابین تعلقات ویسے ہی ہوں جیسے کہ اقرباء ورشتہ داروں کے درمیان ہوا کرتے ہیں۔یہ باہمی رشتہ دار بھی ہیں اوررحمان کی جہت سے بھی عزیز دار ہیں جوان پراپنی رحمت کی تجلی فرماتاہے،قہر کی نہیں۔اور یہ معیار وہ فضا بنانا چاہتاہے کہ جس میں حقوق وواجبات غیروں کے نہیں اپنوں کے حقوق سمجھے جائیں ۔جس کا راستہ نرمی ورفق کا ہے سختی وتشدد کا نہیں (روح الحداثۃ صفحہ 261)۔

چنانچہ صحیح مسلم میں ہے ہشام بن حکیم بن حزام کہتے ہیں کہ وہ شام میں کچھ لوگوں کے اوپر سے گزرے جن کو دھوپ میں کھڑا کرکے ان کے اوپر زیتون کا تیل ڈالا جارہاتھا۔انہوں نے پوچھا کہ یہ کیاہے؟ بتایا گیااِن کوخراج کی وجہ سے عذاب دیا جارہاہے،فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کوفرماتے سناہے کہ اللہ ان کوعذاب دیتاہے جودنیامیں عذاب دیتے ہیں (مسلم کتاب البروالصلۃ والآداب حدیث نمبر:2613)۔اتنا ہی نہیں بلکہ لوگوں کے درمیان رحم دلی ان پراللہ کی رحمت کے نزول کا سبب ہوتاہے ،جیسا کہ فرمایا: ''رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم فرمائے گا'' (ترمذی نے روایت کی ہے ،حدیث نمبر1924اوراس کوحسن صحیح قراردیا)۔اسی وجہ سے ہمارے علمانے حکم لگایاہے کہ ہروہ چیز جو''رحم دلی پر مبنی ''نہ ہووہ دین سے خارج ہے،اسلام کے میزان میں اس کا اعتبار نہیں،کیونکہ وہ شارع کے مقصود کے خلاف ہے۔

تالیفِ قلب: رحم دلی ،شفقت اورمحبت کے سوااور کچھ نہیں کہ شریعت پوری کی پوری عدل ،پوری کی پوری رحمت ،پوری کی پوری انسانی مصلحت اورساری کی ساری حکمت ہے ۔لہٰذا ہروہ مسئلہ جس میں عدل کی بجائے زیادتی ،رحمت کی بجائے ظلم ،مصلحت کی بجائے عقیدہ اورحکمت کی بجائے عبث ہووہ شریعت نہیں ،اگرچہ اس کوتاویلوں کے ذریعہ شریعت میں داخل کرلیا گیاہو،کیونکہ شریعت تواللہ کے بندوں کے درمیان عدل اورخلق خدا کے درمیان رحمت ہی رحمت ہے (اعلام الموقعین 3/3)۔

**۴۔مجاہدہ کا معیار:** (مجاہدہ سے مراد قول،فعل یانیت میں ممکن حد تک قوت خرچ کر دینااور اُس میں مبالغہ کرنا ہے،اِس میں نفس وشیطان اور خواہشات سے جہاد بھی شامل ہے اور غیر سے جہاد بھی شامل ہے۔جس میں غلط کام پر دل سے عدم رضااور زبان سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے اور علم کے ذریعہ اس پر حجت قائم کرنی ہے۔اسی طرح اُس سے قتال بھی شامل ہے۔تو اِس طرح مجاہدہ ایک ایسی اصطلاح ہے جو فقہ اسلامی کی اصطلاح ''قتال'' سے زیادہ عام ہے) **تو امت مسلمہ دوسروں کے حق کا خیال رکھنے میں بہت زیادہ حساس ہے پھر وہ چاہے افراد ہوں یا قومیں۔اسی طرح وہ اپنی زبان اور بول چال کا بھی بڑا خیال رکھتی ہے۔اس دائرہ میں جس کا ئناتی مقصود کی حفاظت ہو اور خلافت وتعمیر ارض کا نشانہ پورا ہو سکے۔لیکن اِس کے بالمقابل اگر غیر ظلم کرتا ہے تو یہ اس کے ظلم کو روکتی ہے۔**

اگر غیر گرم پڑتا ہے تو یہ بھی گرمی کا مظاہرہ کرتی ہے یعنی اسلامی نقطہ نظر سے غیر کی سرکشی کے آگے تعارف باہمی اور بقاء باہم کی دلیل دے کر جھکا نہیں جائے گا۔کیونکہ اگر ایسا ہوا تو اس سے افراد،قوموں اور تہذیبوں کے درمیان ایسے معاملات کا ظہور لازمی ہوگا جن کو اسلام قبول نہیں کرسکتا۔مثال کے طور پر ذلت وخواری سے غیر کی سرکشی کے آگے جھکنا،اس کی طاعت کی ذلت برداشت کر لینا اور اس کا دوسروں کی ہر چیز ہڑپ کر لینا اور ان پر غلبہ وتسلط جما لینا (سیف الدین عبدالفتاح ،العلاقات الدولیۃ فی الاسلام ،مدخل القیم صفحہ 360) جیسی چیزیں پیش آجائیں گی جو کہ سب ایسی چیزیں اور صورتیں ہیں کہ خلافت اور تمدن ارضی کے تقاضے ان کے ساتھ پورے نہیں کیے جاسکتے۔

جیسا کہ یہ چیزیں امت کے خیر امت ہونے ،اس کے وجوداور اس کی تہذیبی اثراندازی سب کے خلاف بھی ہیں۔جیسا کہ فرمایا: تم وہ بہترین امت ہو جس کو لوگوں کے لیے نکالا گیا ہے کہ تم لوگوں کو معروف کا حکم دو،منکر سے روکو،اور اللہ پر ایمان لاؤ۔اور اگر اہل کتاب ایمان لے آئے ہوتے تو ان کے لیے ہی بہتر ہوتا۔ان میں مومن بھی ہیں مگر زیادہ تر فاسق ہیں (آل عمران:11)۔

حدیث نبوی سے بھی اس معنی کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ نسائی وابن ماجہ میں حضرت عائشہ ﷺ سے مروی ہے کہتی ہیں: زینب بنت جحش آئیں اورانہوں نے مجھے برا بھلا کہا آپ نے ان کو منع

کیا مگر وہ نہیں رکیں تب آپؐ نے مجھ سے کہا تم بھی بدلہ لو تو میں نے بھی ان کو برا بھلا کہا یہاں تک ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تو میں نے دیکھا کہ نبی ﷺ کا چہرہ دمک رہا ہے (اس کو ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے باب الانتصار من الظالم 5/99 عینی نے عمدۃ القاری میں لکھا ہے، 12/291)۔

یعنی مسلمان سے ہمیشہ یہ مطالبہ ہے کہ وہ زندگی میں ہر اس اقدام سے مقابلہ کرے تو عدل واحسان اور رحمت باہم کے معیارات سے میل نہ کھاتا ہو اس میں یہ بھی ہے کہ غیر اس کو بودا سمجھ کر دبانا چاہے، اپنے پیچھے چلائے یا تخریب وتدلیس کرے یا سرکشی کرے اور دوسروں کو کمزور سمجھ کر ان پر زیادتی کرے۔ اس نقطۂ نظر سے جہاد 'تعارف' یا 'بقاء باہم' کے اصول سے متصادم نہیں ہے جیسا کہ اسلام کے بعض مخالفین کہتے ہیں بلکہ اس کے برخلاف جہاد تو اِس بقاء باہم اور تعارف باہم کا ضامن ہے"۔ وہ سرزمین اور اصولوں دونوں کا دفاع ہے جیسا کہ وہ اُس ظلم وجبر کو اور تہذیبی سرکشی کو ختم کرنے کا عمل بھی ہے، اسی سے حضرت ربعی بن عامرؓ کے اس قول کی معنویت سمجھ میں آتی ہے جو انہوں نے رستم کے دربار میں کہا تھا کہ:

"اللہ نے ہم کو اِس لیے بھیجا ہے تا کہ ہم اللہ کے بندوں کی عبادت سے اللہ کی عبادت کی طرف نکال لے جائیں اور دین کی تنگی سے اُس کی وسعت کی طرف اور مذاہب کے ظلم سے اسلام کے عدل کی طرف لے جائیں (تاریخ الطبری، 2/401 اور تاریخ ابن خلدون 2/530)۔

اس تصور کے مطابق جس کو حضرت ربعی بن عامرؓ کا یہ مقولہ ظاہر کرتا ہے، جہاد" ایک ایسی تحریک کا نام ہے جو انقلابی ہے، اور اصلاح وتصحیح کے اصول پر مبنی ہے۔ وہ ظالموں یا ظالمانہ حالات کے سلسلہ میں سلبی ومنفی موقف اختیار نہیں کرتی بلکہ ان دشوار کن رہ گزاروں کو ان سرگرمیوں کے ذریعہ عبور کر لیتی ہے جن کو جہادی ترکتاز میں بروئے کار لایا جاتا ہے۔

اس طرح تعلقات کو اصل پر لوٹاتی اور ان عناصر کو حرکت میں لاتی ہے جن سے ایسی عالمی مملکت وجود پذیر ہو جو جامع اور سب کو ساتھ لے کر چلے۔ وہ صرف ایسا تمدن نہ ہو جس میں بس مادی ٹیپ ٹاپ ہو۔ اسی طرح اُس میں تہذیبی سرکشی بھی نہ ہوگی اور نہ ثقافتی اجارہ داری، لہٰذا اس نقطۂ

نظر سے جہادتو انسان کو حقیقی آزادی دینے کا نام ہے (العلاقات الدولیۃ فی الاسلام، مدخل القیم، صفحہ 414) تو امت مسلمہ اس لیے جہاد نہیں کرتی کہ دوسروں پر اپنا عقیدہ تھوپ دے۔ کیونکہ ایسا کرنا خود اس قرآنی اصول کے خلاف ہوگا جو اسلامی دستور کا ناگزیر حصہ ہے جس میں کسی اجتہاد کی بھی گنجائش نہیں۔ وہ یہ فرمان خداوندی ہے: لا اکراہ فی الدین: دین کے معاملہ میں جبر کی کوئی گنجائش نہیں (البقرۃ 256) بلکہ وہ حریت ارادہ واختیار کو یقینی بنانے کے لیے جہاد کرتی ہے۔ تو اگر ہم لوگوں کو ''ایمان لانے'' پر مجبور کرنا اپنے لیے حرام سمجھتے ہیں تو بدرجہ اولی ہم ان لوگوں سے جہاد کریں گے جو لوگوں کو جبراً گمراہی اختیار کرواتے ہیں۔

تو جب کچھ لوگ دوسروں پر اپنا طریقہ تھوپنا چاہتے ہوں تو اُس وقت اسلام ان پر جہاد کو فرض قرار دیتا ہے تا کہ ان کو اختیار وارادہ کی آزادی حاصل رہے۔ اوران کے ساتھ عدل واحسان کا معاملہ کیا جائے۔ تو جہاد کرنے والی امت ہی مذہب میں جبر کو روک سکتی ہے اور وہ خود بھی اس سے باز رہے گی (اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں: محمد جلال کشک، خواطر مسلم صفحہ 27-19) اسی وجہ سے تو اللہ کے رسول نے فرمایا کہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا (ابوداؤد نے اپنی سنن میں اس کی تخریج کی ہے: 2/18 راوی حدیث اعمش ہیں)۔ کیونکہ جہاد ہی اس کا ضامن ہے کہ قوموں اور افراد میں انسانی اخلاقیات کو برتا جائے اور انسان کا وجود، استقرار اور اس کے فرض کی انجام دہی کو یقینی بنایا جا سکے۔ اور دقیق معنوں میں وہ اپنے مقام کے شایان شان تہذیبی تبادلہ کا کام کر سکے۔

جیسا کہ فرمایا: وقاتلوہم حتی لاتکون فتنۃ: اور ان سے لڑو جب تک فتنہ نہ مٹ جائے اور اللہ تعالی کا دین غالب نہ آجائے، اگر یہ رک جائیں تو تم بھی رک جاؤ زیادتی تو صرف ظالموں پر ہی ہے۔ (البقرۃ: 193) کہ فتنہ اپنے ادق معنی ومضمون میں انسان کے ساتھ تدلیس وتلبیس ہے۔ اور انسان کو اُس چیز پر مجبور کرنا ہے جسے وہ پسند نہ کرتا ہو اور جس سے وہ مطمئن نہ ہو۔ انسان کے ارادہ واختیار کو چھین لینا نفسیاتی اور عملی لحاظ سے اس کے لیے قتل سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اُس میں اس کی انسانیت کے لیے خطرہ

ہے جواس کی وجہ سے ختم ہوکر رہ جاتی ہے۔جیسا کہ فرمایا: فتنہ (یعنی مذہبی جبر) قتل سے بھی بڑھ کر ہے (البقرۃ:217) (عمر عبید حسنہ، لااکراہ محوررسالۃ النبوۃ طبع ۲، بیروت المکتب الاسلامی، 1428ھ 2007 صفحہ 10)۔

جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے اِس جہاد کے مزاج کو بھی بتایااور یہ بھی کہ وہ اللہ کے احکام کے مطابق اورامت کے تہذیبی فرض کے مطابق ہونا چاہیے‘‘۔چنانچہ ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے کہایا رسول اللہ !ایک آدمی اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے مگر دنیا کا سامان بھی چاہتا ہے اس کا کیاحکم ہے،فرمایا: اسے کوئی اجرنہیں ملے گا۔لوگوں نے آپؐ کے جواب کو بڑا سمجھا اورانہوں نے اس آدمی سے کہا کہ آپؐ سے دوبارہ پوچھو،ممکن ہے کہ تمہاری بات آپؐ نہ سمجھ سکے ہوں ،چنانچہ اس نے دوبارہ یہی سوال کیا،آپؐ نے پھروہی جواب دیا کہ اس کو کوئی اجر نہ ملے گا۔اُس نے پھر تیسری بار پوچھا آپؐ نے پھروہی جواب دیا کہ اسے کوئی اجر نہ ملے گا (امام احمد نے مسند میں اس کی تخریج کی ہے ،2/290 حدیث نمبر 7887 حاکم نے مستدرک میں اس کے مثل روایت کی ہے،2/94 حدیث نمبر 2436 انہوں نے اس کی سندکوصحیح قرار دیاہےاورذہبی نے اس کی تائید کی ہے )اور صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے،

کہتے ہیں کہ ایک آدمی نبیؐ کے پاس آیااوراُس نے کہا: انسان غنیمت کے لیے لڑتا ہے ،اورایک شخص شہرت کے لیے اورکوئی اپنی شجاعت دکھانے کے لیے تو اللہ کے راستہ میں کون سا ہوا؟ فرمایا: جس نے اس لیے جنگ کی کہ اللہ کا کلمہ بلند ہوتو وہ اللہ کے راستہ میں ہے (صحیح البخاری ،کتاب الجہادوالسیر ،حدیث نمبر 2655 صحیح مسلم کتاب الامارہ حدیث نمبر 1904) تو جملہ ’’فی سبیل اللہ‘‘ ایک منہجی ضابطہ ہے اوران دوقسموں کی لڑائیوں کے درمیان حدفاصل ہے جن میں سے ایک اس لیےلڑی جاتی ہے کہ تمدن کی حفاظت ہو،شرعی مقاصد کا لحاظ ہویعنی دین ،نفس ،نسل ،عقل اور مال کا تحفظ ہواورانسانوں کی تمام بیڑیاں اورطوق کاٹ دیے جائیں ۔اور یہ لڑائی اسلام کے کائنات انسان اورزندگی کے نظریہ کے عین مطابق ہواور دوسری وہ جوظلم وجور کے لیے ہو،دنیوی اغراض کے لیے ہواورلوگوں کوظلم وجبر سے مغلوب کرنے اور پست کرنے کے لیے ہو یادوسروں پر اپنی تہذیب اوراپنا کلچر تھوپنے کے لیےلڑی جائے۔

اسی کی روشنی میں اس حدیث کوسمجھا جاسکتا ہےجس کوامام احمد نے مسند میں روایت کیا ہے کہ

حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی امت کو زیادتی اور قوت کے بے جا استعمال سے خبردار کرتے ہوئے فرمایا: ایک قوم کے لوگ کمزور وغریب تھے، ان پر ان لوگوں نے حملہ کیا جو ظالم بھی تھے اور تعداد میں بھی بہت تھے۔ پھر اللہ نے کمزوروں کو ان پر غلبہ دے دیا۔ اب اِنہوں نے اپنے دشمنوں کو غلام بنالیا، اور ان پر مسلط ہو گئے اور ان پر زیادتیاں کرنے لگے، تو اِس طرح انہوں نے اللہ کو ناراض کر دیا (مسند احمد 5/407 حدیث نمبر: 23509 ھیثمی نے مجمع الزوائد میں کہا ہے: 335/2: احمد نے اس کی تخریج کی ہے، اس میں اجلح کندی ہے وہ ثقہ ہے مگر اس کی تضعیف کی گئی ہے، اُس کے بقیہ رجال ثقہ ہیں) امام ابن کثیر نے اس حدیث کا مفہوم یوں بتایا ہے کہ ''یہ کمزور جب ظالموں پر غالب آ گئے تو اِنہوں نے اُن پر زیادتیاں کیں اور ان کو اپنی ناجائز خواہشات کو پورا کرنے کا آلہ بنالیا۔ پھر اپنے اس ظلم کی وجہ سے انہوں نے اللہ کو اپنے اوپر ناراض کرلیا، اُس کی مدد ناراضگی میں بدل گئی۔ اس بارے میں احادیث وآثار بہت ہیں (تفسیر ابن کثیر (بیروت، دار الفکر 1401ھ 228-1/227)۔

اور اس طرح سے اسلامی قدروں کے نظام میں یہ دراصل جہاد ہے جو احسان کی شان رکھتا ہے۔ برخلاف جہاد کے مقبول عام تصور کے، جس میں اُسے شوکتِ اسلام کے قبیل کی چیز گردانا جاتا ہے۔ اور یہ صرف اسی وجہ سے ہے کہ ہمارا جہاد شروع سے آخر تک صرف انسانیت کی بھلائی کے لیے ہوتا ہے۔ اس سے اپنی نصرت اور بھلائی مقصود نہیں ہوتی۔ اور ان دونوں باتوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے (الحق الاسلامی فی الاختلاف الفکری، صفحہ 265) کیونکہ اس میں مسلمان اپنی اور غیر کی آزادی کی خاطر اور تمدن وخلافت کا حق ادا کرنے کے لیے اپنے آپ کو بھی قربان کر دیتا ہے۔ اس لیے اسلام نے جہاد کو مختلف اصول وآداب کے نظام میں باندھ دیا ہے۔ جو شروع سے آخر تک اس کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام کی نظر میں جہاد (جنگ) ایک استثنائی چیز ہے، ایک ایسی ناگزیر چیز ہے جسے ضرورت کے مطابق ہی کیا جاسکتا ہے۔ جس سے اپنے وجود اور تمدن کی حفاظت ہو، اس میں ظلم وزیادتی یکسر غلط ہے۔ اس میں دوسروں کو غلام نہیں بنایا جاتا کیونکہ یہ تو ان کو آزادی دلانے کے لیے کیا جاتا ہے نہ کہ اس لیے کہ فریق مخالف کی جڑ کاٹی جائے۔ خوں ریزی کی جائے، اس

کے کلچر وثقافت کو برباد کیا جائے ،اُس کی آبادیوں کوتہس نہس کیا جائے۔یعنی جہاد کا رخ اتنا روشن ہے کہ تاریخ انسانی میں اس کی اور کوئی مثال نہیں ملتی (العلاقات الدولیۃ فی الاسلام ،مدخل القیم صفحہ 451 مزید دیکھیے یوسف القرضاوی فقہ الجہاد، دراسۃ مقارنۃ لاحکامہ وفلسفتہ فی ضوء القرآن والسنۃ طبع اول ،القاہرۃ ،مکتبہ وہبہ 2004 فصل ،الدستورالاخلاقی للحرب فی الاسلام 1/754) چنانچہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ جنگ جیسے وقت میں بھی ان کے تمام تصرفات اور کام اسلامی قدروں واصولوں کے مطابق ہوں۔اس سے اس پروپیگنڈے کی نفی ہوجاتی ہے جس کو عیسائی مشنریوں اور سامراج کے ایجنٹوں نے پھیلایا ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا ہے۔

تاریخِ انسانیت میں ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے کہ جب ہماری ہی تلوار بولتی تھی۔اس وقت اگر ہم چاہتے تو ویانا سے لے کر فلپائن تک ایک بھی غیر مسلم باقی نہیں بچتا۔ہم کہ سکتے ہیں کہ ہماری تلواروں نے تو دوسری اقلیتوں کو آج تک باقی رہنے اور امن وسکون سے رہنے کو یقینی بنایا۔کیا یہ بات قابل لحاظ نہیں کہ جہاں جہاں اسلام غالب رہا وہاں تمام مذہبی اقلیتیں اپنی تہذیب وثقافت کے ساتھ باقی رہیں اور آج تک ہیں جبکہ غیر اسلامی سلطنتوں میں دوسری اقلیتوں کو صفحہ ہستی سے مٹادیا گیا۔جن میں سب سے آگے مغربی تہذیب ہے،جس نے اسلامی جہاد کے بارے میں یہ بکواس پھیلائی ہے۔ حالانکہ مغربی لوگوں نے تو زمین پر بالشت بھر حصہ بھی ایسا نہیں چھوڑا جسے اپنے سامراجی ،نسلی، اوراستحصالی مقاصد کے لیے خون آلود نہ کردیا ہو اور تباہی وبربادی نہ پھیلائی ہو(خواطر مسلم صفحہ 24)۔

لہٰذا مجاہدہ کا تصور اس نظام اقدار کے تحت کام کرتا ہے،جن میں عدل واحسان اور باہمی رحمت جیسی صفات ہیں۔تو اسلامی نقطہ نظر سے جہاں مجاہدہ وعدل وانصاف اور اقامت تمدن کے مابین گہرا رشتہ ہے وہیں احسان وباہمی رحمت کے مابین بھی وہی تعلق ہے۔خلافت والے اس نظام عمل میں آدمی کا اپنا حق اور غیر کا حق سب کا خیال رکھا جاتا ہے ان سب معنوں کو ارشاد الٰہی والذین جاھدوا فینا :اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم انہیں اپنی راہیں ضرور دکھادیں گے، یقیناً اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کا ساتھی ہے (العنکبوت 69) میں جمع کردیا گیا ہے۔یوں عدل

واحسان اور باہمی رحمت اور زمین پر کمزوروں کی مدد ونصرت ایسے حقائق ہیں جو اسلامی تہذیب کے ضمیر کی آواز ہیں۔

پھر یہ کہ یہ سب ایسے عنوان نہیں جن کو خاص لوگوں کے مفاد میں حرکت میں لایا جاتا ہو۔جیسا کہ اقوام متحدہ یا عالمی اداروں کا حال ہے۔اوراس طرح صرف مسلمان ہی ہر زمان ومکان میں اس بات پر قادر ہیں کہ حضرت عبادہ بن الصامتؓ کا کردار ادا کرسکیں، جو جزیرۃ العرب سے اپنے بھائیوں کو لے کر مظلوموں کی مدد اور کمزوروں کی نصرت کے لیے نکلے تھے۔اورانسان کو دوسرے انسان کے استحصال سے نجات دلانے آئے تھے جنہوں نے انسان کی فطرت میں پڑے ہوئے ظلم واستحصال،حق مارنے اور زیادتی کرنے اور طاقت کی طرف دوڑ لگانے جیسی منفی قوتوں سے لوہا لیا تھا۔اوراسی وجہ سے اللہ تعالی نے جہاد کو ایمانی مہم قرار دیا ہے ۔اوراللہ نے یہ لکھ دیا ہے کہ وہ زندگی کے ابدی محرکات میں سے ایک ہو جیسا کہ فرمایا: ولولا دفع اللہ الناس: اگر اللہ تعالی لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو عبادت خانے اور گرجے اور یہودیوں کے معبد اور مسجدیں بھی ڈھادی جاتیں جہاں اللہ کا نام بہ کثرت لیا جاتا ہے ۔جو اللہ کی مدد کرے گا اللہ بھی ضرور اس کی مدد کرے گا۔بے شک اللہ تعالی بڑی قوتوں والا بڑے غلبہ والا ہے (الحج:40) یہ معیارات یعنی عدل واحسان، باہمی رحم اور مجاہدہ اسلامی تصور میں غیر کے ساتھ معاملہ کرنے میں اصل ہیں اور افراد وجماعتوں اور قوموں کے درمیان معاملات کو منضبط کرتے ہیں۔جبکہ ان سب کو ایک لڑی میں اللہ کا منہج پروتا ہے ۔جو ان تعلقات کو یوں استوار کرتا ہے کہ وہ اخوت ومحبت ،الفت ورحم سے معمور ہوجاتے ہیں۔کہ یہ منہج سینوں کو غل وغش سے اور دلوں کو حسد ونفرت سے خالی کر دیتا ہے۔اوران سب سے وہ فقہ تشکیل پاتی ہے جس کو ہم فقہِ تعارف یا دوسروں کے ساتھ معاملات کرنے والی فقہ کہتے ہیں، ۔جس میں ’غیر‘ کو تہذیبی شراکت دار سمجھا جاتا ہے۔اس ’غیر‘ میں امتِ استجابت بھی شامل ہے اور امتِ دعوت بھی ۔دونوں کے ساتھ قدروں کو شئیر کیا جائے گا اور سب کے ساتھ گفتگو ہوگی، بات چیت اور ثقافتی تبادلہ ہوگا اور حکمت وموعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت دی جائے گی اور نیکی اور انصاف کا معاملہ کیا جائے

گا۔دوسروں کے ساتھ رشتہ رکھنے کا یہی اسلام کا طریقہ ہے جس کے برخلاف مغربی طریقہ ہے جوکہ رواداری پر مبنی ہے۔یعنی جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ہمارے سواجو''دوسرا''ہے وہ ہم سے کم درجہ کا ہے۔مگر ہم اس سے رواداری کا سلوک کرتے ہیں۔لیکن اسلام کا تصور''تعارف''کا ہے،کیونکہ اس میں دونوں کوایک دوسرے کی ضرورت ہوتی ہے۔اوراس کی گنجائش ہے کہ دونوں ایک کوفائدہ دیں اورایک دوسرے کی تکمیل کریں۔اور بنیادکشمکش اورتصادم کی بجائے یہ ہوکہ''تمام انسانیت ایک ہی ہے''اورایک انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے چاہے وہ اس کو پسند کرے یا ناپسند(یوں انسان دوسرے انسان کے لیے بھیڑیا نہیں ہے،کہ دوسرے کو برااور بے چین سمجھے جس کو قابو میں رکھنے کے لیے قوت کی ضرورت ہو،جیسا کہ معاصر نظریات کا کہنا ہے:دیکھیں طٰہٰ عبدالرحمٰن،روح الحداثۃ صفحہ 313)۔

یہی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا تقاضا ہے کہ یٰا ایہا الناس:اے لوگو!اپنے پروردگار سے ڈرو،جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیااوراسی سے اس کی بیوی کو پیدا کرکے ان دونوں سے بہت سے مرداورعورتیں پھیلا دیں،اس اللہ سے ڈروجس کے نام پرایک دوسرے سے مانگتے ہواوررشتے ناطےتوڑنے سے بھی بچو بے شک اللہ تعالیٰ تم پرنگہبان ہے(النساء:1)اورفرمایایاایھا الناس (الحجرات 13:)اوراللہ کے رسولؐ بھی روزانہ یہ دعافرماتے کہ:**اللھم ربناورب کل شئی اناا شھدان العبادکلھم اخوۃ** (مسنداحمد بن حنبل،4/369،حدیث نمبر:19312)کہ اے اللہ ہمارےاور ہر چیز کے رب،میں گواہی دیتاہوں کہ بندے سب کےسب بھائی بھائی ہیں۔

اورابونضرؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ مجھ سے بیان کیااُس شخص نےجس نے رسول اللہ کا خطبہ ایام تشریق کے بیچ میں سناجس میں آپؐ نے فرمایا:اےلوگو!آگاہ ہوجاؤ کہ تمہارارب ایک ہے، تمہارے باپ ایک ہیں،جان لوکہ کسی عربی کوکسی عجمی پرکوئی فضیلت حاصل نہیں،نہ کسی عجمی کوکسی عربی پر،نہ کسی سرخ کوکالے پرنہ کسی کالےکوسرخ پرمگرتقوے کی وجہ سے۔کیامیں نے پہنچادیا؟لوگوں نے کہاہاں،اےاللہ کےرسول آپ نے پہنچادیا۔پھرآپ نے پوچھایہ کون سادن ہے؟لوگوں نے کہا کہ محترم دن ہے،آپ نے پوچھا کون سامہینہ ہے،لوگوں نے کہامحترم مہینہ ہے،آپ نے پوچھا کون

ساشہر ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ محترم شہر ہے تو آپؐ نے کہا: دیکھو اللہ نے تمہارے مابین تمہارے خون، اور تمہارے مال حرام کر دیے ہیں، راوی نے کہا کہ مجھے یاد نہیں رہا کہ آپ ﷺ نے ''تمہاری آبروئیں'' بھی کہا تھا یا نہیں ۔ یہ ایسے ہی حرام ہیں جیسے تمہارا یہ دن ، یہ مہینہ ، اور یہ شہر حرام ہیں۔ کیا میں نے پہنچا دیا لوگوں نے کہا کہ اللہ کے رسول نے پہنچا دیا۔ پھر آپ نے کہا جو یہاں موجود ہیں وہ ان کو بھی پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں (امام احمد نے مسند میں اس کی تخریج کی ہے 5/411 حدیث نمبر :23536)۔

ان نصوص سے معلوم ہوا کہ امت مسلمہ کے ہر فرزند کا کردار دوسروں کے ساتھ معروف کے مطابق ان ہی احکام کے مطابق معاملہ کرنے کا ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق مسلم اخلاقیات کی اصل یہی ہے۔ ساتھ ہی یہ معیارات ، عدل وانصاف ، احسان ، باہمی رحم اور مجاہدہ عالمی سطح پر مسلمانوں کے تعامل کے لیے وہ نظریہ اور مقدمات پیش کرتے ہیں جن کا وجود نہ ان سے پہلے تھا نہ بعد میں دیکھا گیا۔

اور جن پر عمل درامد ضروری ہے اسی طرح یہ معیارات ایک ایسی باشعور تہذیبی تاریخ کی نظریہ سازی بھی کرتے ہیں جو تہذیبوں کے مابین رشتوں کو منضبط کرتی ہے اور جس میں نہ بے شرمی سے دوسروں کی نفی ہے نہ بے دریغ جارحیت اور لوٹ مار ہے، جو نام نہاد گلوبلائزیشن کی علمبردار قوتوں کا وتیرہ ہے جو کہ جھوٹوں کو تہذیبوں کے مابین گفتگو کی دعوت دیتے ہیں حالانکہ ان کو سوائے سرکشی کے اور دوسروں پر غلبہ وتسلط کے علاوہ اور کسی چیز سے سروکار ہی نہیں۔ وہ تو 'تاریخ کا خاتمہ' اور 'تہذیبوں کے تصادم' وغیرہ جیسے گمراہ کن نعروں کے ساتھ چلتے ہیں۔ اور ان تھیوریوں کے ساتھ چلتے ہیں جن کو امریکی مفکر نوم چامسکی نے انجینئرنگ آف موافقت وقبولیت یا زبردستی کے اتفاق کا نام دیا ہے (ان دونوں تصورات کی تشریح ان کی کتابوں ''امریکہ اور جمہوریت کا راستہ روکنا'' اور ''مفاد قوم سے بالا ہے'' میں دیکھی جا سکتی ہے ، مزید دیکھیں: عقلوں کے ساتھ کھیلنے والے، تصنیف ہربرٹ اے، شیلر، ترجمہ: عبدالسلام رضوان، المجلس الوطنی للثقافۃ والفنون والآداب، الکویت، سلسلۃ عالم المعرفۃ، نمبر 234 یہ کتاب بتاتی ہے کہ سیاست، صحافت، اور سوشل میڈیا کو اپنی انگلیوں پر نچانے

والے لوگ رائے عامہ کو کس طرح متاثر کرتے ہیں)۔

دوسری تہذیبوں کو دبانا اوران سے اپنی باتیں منوانا اوران کو عالمی قوتوں کی اطاعت پر مجبور کردینا اوردنیا کی قوموں پر اپنے جھوٹ اوراپنی رائے مسلط کردینا یہی ان لوگوں کا شیوہ ہے جوجدید عالمی نظام کی بات کرتے ہیں جس میں صرف اورصرف مغرب کی تہذیب کے مصالح کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

اُس میں توسیع لانے اوراُسے پھیلانے اوراس کی زبان وثقافت کوفروغ دینے اورزندگی کواپنے مطابق چلانے والے مغرب کے تصورات اوراس کی قدروں کے لیے جانب داری برتنے کی بات کی جاتی ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ مغرب اوردوسری تہذیبوں (عالمی قوتوں سے مراد امریکہ اوراس کے اتحادی ممالک ہیں۔اوراس تصور کے ذریعہ وہ زیادہ طاقت ور کے لیے اورحقیقت میں اس کے مفادات کی خدمت کے لیے اس اصطلاح کا استعمال کرتے ہیں۔جوممالک اس اینگلوسکسن غلبہ کونہیں مانتے ان کو باغی قرار دیدیا جاتا ہے،اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں،نوم چامسکی کی کتاب گلوبلائزیشن اوردہشت گردی' جس کا عربی ترجمہ ڈاکٹرحمزہ المزینی نے کیا ہے،طبع اول،قاہرہ،مکتبہ مدبولی 2003 صفحہ 78) کے مابین جوتعلقات ہیں وہ عدل ومساوات پرمبنی نہیں بلکہ ظلم وجبر پرمبنی ہیں۔جن میں تہذیبوں کوغلام بنانے،ان کی نفی کرنے ان کی جڑ کاٹنے،تہذیبوں میں ٹکراؤ،ان پرغلبہ واستیلاء،ان کوحاشیہ پرلانا،زبردستی ان سے اپنی بات منوانا اوراس کواتفاق رائے کا نام دینا شامل ہیں (مغربی تہذیب اوردوسری تہذیبوں کے مابین بگڑے تعلقات کے سلسلہ میں ملاحظہ کریں،سیف الدین عبدالفتاح،رویۃ العالم طبع اول،دمشق،دارالفکر،1430ھ 2009 اس سے ہمیں مغرب کے انسانی حقوق کے سلسلہ میں ان کے pragmatism والے پہلو پرغوروفکر کرنا چاہیے،کیونکہ حقوق انسانی کے تصور سے ان کی مراد دوسری قوموں پراپنے نظریات وخیالات تھوپنا ہے) یہ چیزیں آج دنیا کے چودھریوں کواس زعم میں مبتلا کرتی ہیں کہ''ہم مالک ہیں،ہر چیز پر ہمارا حق ہے دوسروں کے لیے کچھ نہیں ہے (دیکھیے: سیف الدین عبدالفتاح،العولمۃ والاسلام صفحہ 94)۔

یہ چیز فرعونی ماڈل کا تقاضا کرتی ہے جس کے نقوش قرآن کریم نے یوں واضح کردیے ہیں:

قال فرعون ما اریکم الا ما اری: فرعون نے کہا: میری قوم کے لوگوں میں تمہیں وہ راہ دکھارہا ہوں جو میں

تمہارے لیے مناسب سمجھتا ہوں (غافر:29)اسی طرح اس کے متبعین کے نقوش یوں بیان کیے: فاستخف قومہ: اس نے اپنی قوم کو ذلیل سمجھا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی یقیناً وہ حد سے گزرنے والے لوگ تھے (الزخرف:54) اور ایک جگہ اس کی تصویر کشی یوں کی ہے: فاتبع امر: مگر انہوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی حالانکہ فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا۔ قیامت کے روز وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور اپنی پیشوائی میں انہیں دوزخ کی طرف لے جائے گا، کیسی بدتر جائے ورود ہے وہ جس پر کوئی پہنچے! اور ان لوگوں پر دنیا میں بھی لعنت پڑی اور قیامت کے روز بھی پڑے گی ۔ کیسا برا صلہ ہے یہ جو کسی کو ملے (ہود:99-97)۔

تو اس طرح تزکیہ اپنے دونوں مظہروں ''اپنی رعایت'' اور ''غیر کے حق کا پاس ولحاظ'' ایک حقیقی اور یکتا اسلامی منہج اور ذات انسانی کو مضبوط کر کے اور زندگی میں اس کے عمل کے لیے بنیادی قدر ہے۔ جو اللہ کے احکامات کے مطابق روبہ عمل ہوتی ہے۔ اور فرعونی منہج سے دور ہے۔ کہ اس سے خود اپنے ساتھ تعامل میں مکمل اخلاقیات، مکمل غفلت، اور مکمل عبودیت کا اظہار ہوتا ہے اور غیر کے ساتھ تعامل میں عدل واحسان، باہمی رحم اور مجاہدہ کے معیارات کا اظہار ہوتا ہے۔ اور اس طرح امت مسلمہ حقیقی معنی میں وہ امت بنتی ہے جو خلافت، تعارف بنی آدم اور پورے عالم کے اللہ کے ساتھ وابستہ ہونے کی نمایندہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ یہ معیارات پوری قوت سے عالم اسلام کو اس کی دعوت دیتے ہیں کہ شریعت کے پابند لوگوں کو دنیا میں آگے بڑھ کر قیادتِ عالم اور تہذیب کی تشکیل میں فعال کردار ادا کرنا چاہیے، جس میں تہذیبوں کے مابین صحیح تعلقات کا قیام بھی شامل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آج وہ اس میں کامیاب نہیں اور پوری طاقت سے مادی و تکنیکی میدان میں کوئی بڑا حصہ نہیں لے سکتی مگر اُس کو تہذیبوں کے باہمی تعارف میں اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ اس سے وہ اپنے تہذیبی سفر میں آگے بڑھے گی ۔ اس کے تہذیبی وجود کے لیے ایسا کرنا لازمی ہے۔ اور جس سے ہم دست بردار نہیں ہو سکتے، ورنہ ہم اس دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے (مرجع سابق صفحہ 122-121)۔

☆☆☆

فصل سوم:

# استقامت اور زمین کی ایمانی آبادکاری

## تعمیر ارض مومن کا شیوہ:

جبکہ تزکیہ، جیسا کہ گزرا، تبدیلی کے عمل میں اور خلافت والی سوسائٹی کی تشکیل میں سب سے اہم پہلو ہے۔ جو کہ انسان کو اس کے رب سے اور کائنات اور انسان سے جوڑنے کا اسلامی منہج ہے۔تو زمین کی ایمانی آبادکاری خلافت کے عمل کی تکمیل کرنے والا رکن ہے۔اور یہ اسلام میں سب سے بڑی تہذیبی قدر ہے۔ جو کائنات کی آبادکاری کی نظریہ سازی کرتی ہے۔اور اللہ کے امر ونہی کے مطابق اور اشیاء کے ساتھ تعامل کو فریم دیتی ہے۔کیونکہ اسلامی شریعت کا مقصد عام زمین کی اصلاح، اس کی آبادکاری اور اس میں لوگوں کی روزی کا انتظام کرنا ہے اور اس کو ان کے لیے مسخر کرنا ہے۔ اور انسانوں کے تمام کاموں کو اللہ کے تابع کر دینا ہے۔اس طرح کہ کائنات کی تمام سرگرمیاں اللہ کی طرف متوجہ ہوں۔اس کے حکم کے ذمہ داری کا تقاضا یہ ہے کہ زمین کی مادی تعمیریوں کی جائے کہ اس میں اچھی چیزیں بنائی جائیں، صناعت، زراعت اور ان کے متعلقات کو پروان چڑھایا جائے، اور اس کی معنوی تعمیریوں کی جائے کہ اس میں عدل کا قیام ہو اور لوگوں کے درمیان احسان کو رواج دیا جائے۔ علامہ الطاہر بن عاشور کہتے ہیں: بڑے مقاصد شریعت میں سے ہے کہ افراد امت کے مابین عام دولت سے اِس طرح فائدہ اٹھایا جائے کہ عام وخاص سب کے منافع اور مصلحتیں پوری ہوں۔ اور وہ یوں کہ مال کو جمع کرنے اور کمانے والے کے ساتھ عدل وانصاف کیا جائے اور اس احسان کا لحاظ رکھا جائے جس نے کمانے والے کی جدوجہد کو ایک حد میں رکھا (التحریر والتنویر 2/449)۔

شیخ علال الفاسی لکھتے ہیں: اسلامی شریعت کا مقصد زمین کی تعمیر اور اس میں رہنے سہنے کے نظام کو ٹھیک کرنا اور زمین جن کو خدا نے عطا کی ہے، اس کی درستگی سے زمین کی درستگی ہوگی۔ان کو جس عدل و استقامت کا اور عقل و عمل میں جس صلاح کا اور زمین کی اصلاح اور اس کے خزانوں کو نکالنے اور سب کے فائدوں کے نظم کا حکم دیا گیا ہے اس کی بجا آوری سے ہوگی (مقاصد الشریعۃ ومکارمہا طبع ۵ دار الغرب الاسلامی 1993 صفحہ 42-41)۔

اسلامی تہذیب کے اس تشریعی مقصد کو وہ حدیثِ نبوی واضح کرتی ہے جس میں کلالۃ النفس (انسان کی محتاجگی) سے منع کیا گیا ہے (آج امت کی زندگی میں اس محتاجگی اور بے مایگی کے مظاہر بہت ہیں۔کیونکہ منہج وحی تہذیبی سفر میں پیچھے رہ گیا ہے !!امت کی زندگی میں اس محتاجگی اور بے مایگی کے مظاہر کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو، عبد المجید النجار، الشہود الحضاری للامۃ الاسلامیۃ فقہ التحضر الاسلامی 1/76)۔

آپؐ نے فرمایا: وہ تم سب سے اچھا نہیں جو اپنی دنیا کو آخرت کے لیے چھوڑ دے اور نہ وہ جو آخرت کو دنیا کے لیے چھوڑ دے۔بلکہ اسے دونوں سے سروکار رکھنا چاہیے، کیونکہ دنیا ہی آخرت کا راستہ ہے۔اور لوگوں پر بار بن کر نہ رہ جاؤ (رواہ ابن عساکر، کما جاء فی التیسیر بشرح الجامع الصغیر للسیوطی، للمناوی انہوں نے اس ضعیف قرار دیا ہے، 2/322 اس کی تخریج کے لیے دیکھیے کشف الخفاء للعجلونی 2202/ اور کنز العمال 3/89)۔

امام زمخشری نے ''کلّ'' کی تشریح یوں کی ہے، یعنی معاملات کے ذمہ دار اور عیال دار پر بوجھ اور عیال '' (الکشاف 582-2/581) یعنی لوگوں میں الکلو ہ شخص ہے جو محتاج و عاجز ہو جو اپنے معاملات کے لیے بھی دوسرے پر بوجھ ہو۔آپ ﷺ نے لوگوں پر بوجھ بننے سے جو منع کیا ہے اس کی بڑی تہذیبی اہمیت ہے، کیونکہ وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس امت کے لیے واجب ہے کہ وہ کارزار حیات میں طاقت وروں کی طرح شرکت کرے، دوسروں پر بوجھ نہ بنے اور۔

وہ دوسروں کے ہاتھ میں پھرکنی نہ بن جائے کہ وہ جیسے چاہیں اسے گھمائیں اور نچائیں۔ رسول اللہ کا یہ قول علامات نبوت میں سے ہے۔آپ غور کریں کہ غفلت اور دوسروں پر بوجھ بننے سے کس طرح دنیا ہم سے چھن گئی، دشمن ہمارے ملکوں پر چھا گئے، انہوں نے سازشیں کیں ہم ان کے

آ گے ڈھیر ہو گئے اور کمزوری کی وجہ سے کچھ نہ کر سکے وہ ہمارا جو حال ہوا وہ سب کو معلوم ہے!!

تو مومن کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ زمین کی آبادکاری سے دستکش رہے اور غیر پر منحصر ہو کر رہ جائے خود کوئی چیز نہ کرے اور اپنی زندگی کو بنانے اور مستقبل کی صورت گری کرنے سے عاجز و درماندہ ہو جائے اور اپنے خول میں سمٹ کر رہ جائے۔ کہ اس پر غیر غالب آجائے اور اس کا آپا چھین لے، جس سے وہ اپنے آپ کو اور اپنی بقاء کے جواز کو کھودے۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ اپنی شخصیت، اپنی روزی روٹی اور اپنے تہذیبی وجود سب میں ناکارہ ہو کر رہ جائے گا۔ پہلے یہ فتنہ فرد پر طاری ہوگا پھر پوری امت کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ یہ کمزور کو تو عبادت سے روکتا ہی ہے، اس میں مزید یہ اضافہ کرلیں کہ اسلام کی اکثر عبادات میں مال کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو ہر تمدن کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ مثال کے طور پر مال کے بغیر صدقہ، جہاد اور خیر کے کام اور دوسروں کے ساتھ صلہ رحمی نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے علماء اسلام کا کہنا ہے کہ اللہ سے تقوی پر مالداری بہت اچھی مددگار ہوتی ہے (الامام الذہبی، سیر اعلام النبلاء، تحقیق شیخ شعیب الارناؤط، محمد نعیم العرقوسی، (بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ 1414ھ 355/5)

حدیث میں آیا ہے کہ سات کاموں میں جلدی کرو، کیا تم اس انتظار میں ہو کہ بھلا دینے والا فقر تم پر مسلط ہو جائے (ترمذی نے سنن میں اس کی روایت کی ہے، باب ماجاء فی المبادرۃ بالعمل 356/4 حدیث نمبر 2306 اور انہوں نے اس کو حسن غریب قرار دیا ہے۔ حاکم نے مستدرک میں روایت کی۔ 40/356 حدیث نمبر 7906)

یعنی ایسا فقر و فاقہ جو آدمی کو سرگرداں کردے اور وہ بھوک مٹانے، تن ڈھانپنے اور روزی روٹی کی تلاش میں ہی الجھا رہے (المبارکپوری، تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی، (بیروت، دارالکتب العلمیۃ، 6/488) مزید یہ اضافہ کرلیں کہ فقر و فاقہ، محرومی اور انحراف کا احساس پیدا کرتا ہے اور اس کے ساتھ امت کی بنیاد اکھڑ جاتی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔'' آدمی جب مقروض ہو جاتا ہے تو اپنی باتوں میں جھوٹ کا سہارا لیتا ہے اور وعدہ پورا نہیں کرتا (متفق علیہ) اسی وجہ سے ہمارے فقہاء نے یہ واجب قرار دیا ہے کہ اسلامی سلطنت مالداری کی اور لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے کیونکہ اس کے اُن کے اخلاق پر ایجابی اثرات پڑتے ہیں۔ چنانچہ امام ماوردی نے اس بات کو جس

تحلیل نفسی کے ساتھ بیان کیا ہے اسے اونچے درجہ کے فقہی دستاویزوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اُس میں انہوں نے نفس انسانی کے مزاج، اس کے محرکات، اسبابِ انحطاط اور سلامتی کے مدارج بیان کیے ہیں۔ وہ ان قواعد کے بیان میں جن پر سلطنت قائم ہوتی ہے، کہتے ہیں: ''دائمی خوش حالی زمین کی مسلسل اور اچھی پیداوار، اموال و جائداد کہ ان ہی سے لوگوں میں حسد کم ہوتا ہے اور نفرت وعداوت ختم ہوتی ہے۔ دلوں میں کشادگی پیدا ہوتی اور صلہ رُحمی ومواسات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان چیزوں سے سلطنت کی درستگی اور اس کے احوال اچھے ہوتے ہیں کیونکہ ثروت سے غنا حاصل ہوتا ہے اور غنا سے امانت وشجاعت پیدا ہوتی ہے (ادب الدین والدنیا صفحہ 127)۔

تو یہ واضح ہے کہ مادی آسائش جو زیادہ سے زیادہ پروڈکشن اور زندگی کے وسائل کو ترقی دینے سے آتی ہے ایک ایسا ہدف ہے جس کے لیے متقیوں کے معاشرہ کو کوشش کرنی ہوتی ہے۔ اس سماج کا نظریۂ زندگی اس چیز کو لازم کر دیتا ہے جس نقطہ نظر کے سایہ میں وہ اپنا سفر حیات طے کرتا ہے۔ چنانچہ وہ فقر کے اخلاق سے دور اور احتیاج وضرورت مندی سے نفور ہوتا ہے۔ غالبا یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ سستی، غفلت اور کاہلی سے پناہ مانگا کرتے تھے۔ جیسا کہ صحابی جلیل انس بن مالکؓ کہتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا جب بھی آپؐ بالا خانے سے اترتے میں سنا کرتا کہ آپؐ کہتے: اے میں تیری پناہ چاہتا ہوں غم وفکر اور رنج سے، عاجزی وسستی سے، بخل اور بزدلی سے اور قرض کی مار اور لوگوں کے قہر سے (صحیح البخاری، کتاب الدعوات، حدیث نمبر 6002) اور غالبا یہی سبب ہے جس کی وجہ سے آپ تاکیدا مانگنے سے اور بے کار رہنے سے منع فرماتے تھے۔

اور تمدن وتہذیب کے میدانوں میں سعی وجہد کرنے اور اس کی قدروں، اخلاق، علوم، مدنیت ومعاش کی طرف زیادہ سے زیادہ کوشش کرنے پر ابھارتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم میں کوئی آدمی اپنی رسی لے کر نکلے اور اپنی کمر پر لکڑیاں لاد کر لائے مجھے اِس سے زیادہ پسند ہے کہ کوئی آدمی کسی کے پاس جائے اور اُس سے سوال کرے، جو اُسے دیدے یا منع کردے (مرجع سابق، کتاب الزکوۃ، باب

الاستعفاف 2/535 حدیث نمبر 1401) اور مزید عروہ بن زبیر وسعید بن المسیب سے مروی ہے کہ حکیم بن حزامؓ نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے مانگا تو آپ نے مجھے دیا، میں نے پھر مانگا، آپؐ نے پھر دیا، میں نے پھر مانگا آپؐ نے مجھے پھر دیا پھر فرمایا: اے حکیم یہ مال میٹھا اور سرسبز وشاداب ہے جو اس کو نفس کی

سخاوت کے ساتھ لے گا، اس کے لیے اس میں برکت دی جائے گی۔ اور جو اِس کو اس طرح سے لے گا تا کہ نفس میں اس کے لیے بار بار چاہت ہو، تو اس کے لیے اس میں برکت نہیں ہوگی۔ اس کا حال تو ایسے شخص کا ہوگا جو کھائے مگر سیر نہ ہو، دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے (مرجع سابق، حدیث نمبر:1403) اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد کہ 'دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے'۔ امت کے لیے بڑا بابرکت جملہ ہے وہ مانگنے اور دست سوال دراز کرنے سے منع کرتا ہے، پھر ثروت کے حصول کی رغبت بھی دلاتا ہے کیونکہ ثروت ہوگی تو ہاتھ دینے والا رہے گا۔ اور مال کی فضیلت کے لیے اتنا کافی ہے کہ اس کو دینے والا ہاتھ اونچا قرار دیا جائے۔

**تعمیرِ ارض کا مفہوم:** تعمیر ارض کا اصطلاحی مفہوم ہے زمین کی آبادکاری، سرمایہ کاری، اس کے منافع سے استفادہ، اس کے اندر کی اشیاء کی تسخیر۔ مطلب یہ ہے کہ زمین کی آبادکاری اللہ کی بندگی کے نظام کے مطابق ہو، کائنات کے ساتھ معاملہ اس کے قوانین کی معرفت کے ساتھ ہو۔ اس کی اچھی چیزوں کو بڑھایا جائے۔ اس کی صلاحیتوں میں اضافہ ہو، اس میں نہ فساد ہو نہ کھلواڑ اور نہ اس کے نظام میں خلل ڈالا جائے (دیکھیں المفردات فی غریب القرآن صفحہ 473 اور تاج العروس 129/3)۔

یعنی تعمیر ارضی اپنے اسلامی تصور میں دو باتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے: ا۔ پہلی یہ کہ یہ ایسا عمل ہے جو اسلام کے تصورِ کائنات، تصور زندگی اور تصور انسانیت سے جڑا ہوا ہے ساتھ ہی اشیاء کی تشریح کے طریقہ سے بھی مربوط ہے۔ اسی طرح وہ آغاز وانجام میں اور ہمیشہ ومسلسل اللہ کے منہج سے مربوط ہے اسی کی روشنی میں یہاں تدبر ہوتا ہے۔ عبرت لی جاتی ہے اور خلافت کی انجام دہی ہوتی ہے ۔ اللہ کی عبادت کی کوشش ہوتی ہے اور اس کی رضا جوئی اور محبت الٰہی کا حصول ہوتا ہے۔ جو کہ اس تہذیبی

وتمدنی عمل پر مبنی ہوتا ہے جو وحی الٰہی کی روشنی میں اللہ کے بتائے ہوئے صراط مستقیم پر چل کر حاصل ہوتا ہے ۔اس کی اساس علم نافع اور عمل صالح ہے ۔اُس کی داخلی بنیاد سے ہر اُس خصوصیت کوختم کر دینا ہے جوانانیت ،ظلم ،تعصب ،اورنسلیت والی ہو۔قرآن نے ان تمام چیزوں کواس آیت میں جمع کر دیا ہے ۔اورہم نے قوم ثمود کی طرف صالح علیہ السلام کوبھیجا،جنہوں نے کہااے میری قوم کے لوگو،اللہ کی عبادت کرو،جس کے علاوہ تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے۔اُس نے زمین میں تمہیں آباد کیا ہے ،تواس سے مغفرت چاہوپھراسی کی طرف لوٹو۔

بے شک وہ میرارب ہے اورقریب ہے جواب دیتا ہے (ہود: 61) مطلب یہ ہے کہ اس قرآنی تصور کے مطابق زمین کی آبادکاری ایک مکمل اوروسیع نظام عمل کا نام ہے،جس کے واسطہ سے مومن اپنا سفرشروع کرتا ہےاورغیر کے ساتھ نیزفطرت اوراشیاءِفطرت کے ساتھ اپنا تعلق قائم کرتا ہے ۔جن میں زراعت ،صنعت ،معماری اورانجینیر نگ وغیرہ سب آتی ہیں ۔پھر یہ تعلق اللہ کے امرونہی کے مطابق ہونی چاہیے کیونکہ زمین میں جوبھی عمل اللہ کے منہج کے مطابق نہ ہواس کی آبادکاری نہیں اس میں فساد ہوگا۔اورفسادامام ابوحیان اندلسی کی تفسیر کے مطابق صلاح کی ضد ہے۔اور جواللہ کی مخالفت ہے اوراس کےقول واستعمر کم فیہا: (اوراس نےتم کوزمین میں آباد کیا)(البحرالمحیط 2/124) کی مخالفت ہے ۔یوں ایک مسلمان جان لیتا ہے کہ زندگی میں اس کی دوڑ دھوپ اورکائنات کی قوتوں کوقابل استفادہ بنانے کی اس کی کوشش نہ تواس میں فساد کا آلہ ہواورنہ زندگی اوراس کے مظاہر میں دوسروں سےتفریق کا ذریعہ۔ نیزان کوزندگی کی نعمتوں سے محروم کرنے کا ذریعہ نہ بن جائے ، بلکہ یہ توذمہ داری شراکت اورخلافت کی انجام دہی پر مبنی ہونی چاہیے۔ ۲۔دوسری چیز یہ ہے کہ عبادت کے جامع مفہوم میں زمین کی آبادکاری کا عمل بھی شامل ہے، کیونکہ اسلام کا قاعدہ ہے کہ: انسان کا ہرتصرف جوشرع کے ماتحت ہو وہ عبادت ہے (الموافقات 1/194) اس قاعدہ میں کائنات میں ہونے والے انسان کے سارے ہی اعمال وحرکات آجاتی ہیں ۔جس لیے قرآن تمدن کے اس عمل کوقرآنی ابعاد میں اللہ کی عبادت سے جوڑکر دیکھتا ہے۔''اللہ کی مسجدیں تو وہی آباد کرتے ہیں جواللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائیں ،نماز

پڑھیں، زکوۃ دیں اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہ ڈریں تو امید ہے کہ ایسے ہی لوگ کامیاب ہوں گے (التوبہ:18) اس طرح زمین کی آبادکاری کے لیے بندہ کی کوشش عبادت ہوگی اور ایمان کے ستر سے زیادہ شعبوں میں سے ایک شعبہ شمار ہوگی۔ ان میں آپ چاہیں تو ایمان باللہ، توحید کے اقرار اور راستہ سے گندی اور اذیت دہ چیزوں کو ہٹانا بھی شمار کرلیں (صحیح مسلم میں ہے کہ ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ایمان کے ستر سے زیادہ شعبے ہیں یا کہا 60 سہ زیادہ شعبے ہیں۔ ان میں سب سے افضل لا الٰہ الا اللہ کہنا ہے اور سب سے کم درجہ راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹا دینا ہے، کتاب الایمان، باب شعب الایمان 1/13 حدیث نمبر 35 اصحاب السنن نے ان شعبوں کی تحدید کرنی چاہیے، جیسا کہ امام بیھقی نے اسی بنیاد پر اپنی کتاب شعبوں الایمان لکھی ہے۔ امام ابن حجر نے فتح الباری میں کہا: (1/52-53) ''ایک جماعت نے اپنے اجتہاد سے اِن شعبوں کو حصر کرنے کا تکلف کیا ہے، لیکن ان کو شمار کرنا مشکل ہے۔ ایمان کی تفصیل میں ان شعبوں کے حصر کرنے سے کوئی خرابی بھی نہیں۔ کیونکہ جن لوگوں نے ان کو شمار کیا ہے وہ کسی ایک گنتی پر متفق نہیں۔ ان میں سب سے اچھا طریقہ ابن حبان کا ہے۔ ان کا اپنا کلام تو ہمیں نہیں مل سکا، دوسروں نے ان کے کلام کو یوں نقل کیا ہے: یہ شعبے تین طرح کے ہیں، اعمالِ قلب، اعمال لسان اور اعمال بدن، انہیں میں حلال طریقہ سے مال کمانا، حلال طریقہ پر مال خرچ کرنا اور اسراف وتبذیر کو چھوڑ دینا'') کیونکہ زندگی میں جو بھی سرگرمیاں اور کام کیے جاتے ہیں، مثلاً آفاق کائنات اور سنن الٰہیہ میں غور وخوض، استحصال سے جنگ، پختہ بنیاد بنانا، مال خرچ کرنا اور کمانا ان سب چیزوں میں اگر اسلامی اصولوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے تو یہ سب بھی ایمان کے شعبے بن جاتے ہیں۔ اور ان کو اسلام یہ رنگ دیتا ہے کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے مضبوط تعلق کا واسطہ بن جاتے ہیں!!

بلکہ زمین کی ایمانی آبادکاری اور اللہ کے منہاج کے مطابق اس کی کوشش بھی ایک جہاد ہے، اور امت کے اندر اپنے وجود اور اپنی قیادت کے تحفظ کے معرکہ کا ایک حصہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے قول کے مفہوم میں شامل ہے۔ اور ان کے لیے تیاری جتنی تم کر سکتے ہو کرو، اور تیز رفتار گھوڑے تیار کرو، جن سے تم اپنے دشمنوں اور اللہ کے دشمنوں کو خوف میں ڈال دو، اور ان لوگوں کو جن کو تم نہیں جانتے اللہ جانتا ہے، اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے اللہ کے راستہ میں اس کا پورا پورا بدلہ تمہیں دے دیا جائے گا اور

تم پر ظلم نہیں ہوگا (انفال:60) جیسا کہ ابن عباس سے روایت ہے کہ حلال روزی کی طلب بھی جہاد ہے اور اللہ تعالی اس بندہ سے محبت کرتا ہے جو کوئی پیشہ اختیار کرتا ہے (ابن ابی الدنیا نے اس کی تخریج کی ہے، اصلاح المال، باب الاحتراف صفحہ 71 پر اور ابن عدی نے الکامل فی ضعفاء الرجال میں کی ہے 6/263 امام سخاوی نے المقاصد الحسنہ میں لکھا ہے کہ 1/505 قضاعی نے محمد بن الفضل عن لیث بن ابی سلیم عن مجاہد کے طریقہ سے روایت کی ہے۔ابونعیم نے حلیہ میں، جن میں دیلمی عن ابن عمر کی سند ہے۔ یہ طرق ایک دوسرے کی تقویت کرتے اور اُس کے شواہد بہت ہیں)۔

اور ایک روایت میں ہے کہ روزی کی طلب اور کسب حلال فرض کے بعد فرض ہے (اس کی تخریج طبرانی نے معجم کبیر میں کی ہے، 10/74 اور اسی کے مثل اوسط میں بھی 8/372 بیہقی نے سنن کبری میں 6/128 اور کہا اس میں عباد بن کثیر بن الرملی منفرد ہے جو ضعیف ہے) اور ایک روایت میں ہے کہ **طلب الحلال واجب علی کل مسلم** (طبرانی نے اوسط میں روایت کی 8/272 ہیثمی نے مجمع الزوائد میں 10/291 میں کہا اس کی اسناد حسن ہے) حلال روزی کی طلب ہر مسلمان پر فرض ہے۔اور ایک روایت میں ہے ہے ان من الذنوب ذنوبا لا یکفرھا الصلاۃ: کچھ گناہ ایسے ہیں جن کا کفارہ نہ نماز ہے نہ روزہ نہ حج اور نہ عمرہ، لوگوں نے پوچھا تو یا رسول اللہ پھر کیا چیز اس کا کفارہ بنتی ہے؟ فرمایا:

روزی کے حصول کی فکر؟ (طبرانی نے اوسط میں اس کی تخریج کی ہے 1/38) صحابہ جو اس امت کے لیے تہذیبی فکر کا مرجع اور بنیاد ہیں ان میں کوئی بھی جہادِ کسب اور جہادِ عدو کے درمیان فرق نہ کرتا تھا۔ چنانچہ سعد بن معاذؓ کے حالات میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ تبوک سے واپس آئے تو سعد بن معاذؓ نے آپؐ کا استقبال کیا، ان کے ہاتھ میں پیمائش اور کام کا اثر تھا۔آپؐ کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ اِس سے چوٹ مارتا (کماتا) اور بچوں پر خرچ کرتا ہوں تو نبی اکرم ﷺ نے ان کے ہاتھ کو چوم لیا اور فرمایا: یہ ایسا ہاتھ ہے جسے آگ نہ چھوئے گی (الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ 3/86) امام سرخسی نے اس پر جو نوٹ لکھا ہے اس کی بڑی تہذیبی اہمیت ہے: ''اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کمائی آدمی کے لیے نہایت ضروری ہے، اور اس کے ذریعہ بھی اعلی درجات حاصل کیے جاتے ہیں، جو کہ فرائض کی اقامت سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ فرائض کی اقامت اس کے بغیر نہیں ہوسکتی لہٰذا زندگی

میں دوڑ دھوپ کرنا ایسا ہی ضروری ہو جیسا کہ اداء نماز کے لیے طہارت ضروری ہے (المبسوط، بیروت: دارالمعرفۃ 30/245) امام قرطبی تو اس طرف گئے ہیں کہ تجارت، کسب حلال اور جہاد ایک ہی درجہ کی سرگرمیاں ہیں جن کے درمیان خود اللہ تعالیٰ نے برابری کی ہے۔ چنانچہ فرمایا: علم ان سیکون منکم: اللہ کے علم میں ہے کہ تم میں کچھ بیمار ہوں گے، اور کچھ زمین میں اللہ کا فضل تلاش کرنے کے لیے سفر کریں گے اور کچھ دوسرے ہوں گے جو اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے۔ (المزمل: 20) اس کی تفسیر میں قرطبی لکھتے ہیں:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حلال کمانے والوں اور مجاہدین کے درجہ میں برابری کی ہے اور ان لوگوں کے درجہ میں بھی جو اپنے آپ پر اپنے اہل وعیال پر اور احسان وسخاوت میں خرچ کرتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کسبِ مال بھی جہاد کے درجہ میں ہے۔ کیونکہ اللہ نے اس کو جہاد کے ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے (تفسیر القرطبی 190/55) اتنا ہی نہیں امام محمد بن الحسن الشیبانی کا قول ہے کہ عمر فاروقؓ روزی کمانے کے درجہ کو جہاد کے درجہ پر ترجیح دیتے تھے، اور فرماتے تھے: یہ بات کہ میں اپنی سواری پر، زمین میں اللہ کا رزق تلاش کرتے ہوئے مروں مجھے جہاد میں مرنے سے زیادہ پسند ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جہاد فی سبیل اللہ کرنے والوں سے پہلے ان کا تذکرہ کیا ہے جو زمین میں اللہ کا فضل تلاش کرتے ہیں جب فرمایا: وآخرون یضربون فی سبیل اللہ: اور کچھ دوسرے ہوں گے جو اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے (الامام الشیبانی، کتاب الکسب، تحقیق، د، سہیل دکار طبع اول دمشق دار عبدالہادی حرصونی 1400ھ)۔

کائنات سے عبرت لینے اور اس کی آبادکاری میں زندگی کی سرگرمیاں اللہ تعالیٰ کی عبودیت کا ہی حصہ ہو جاتی ہیں جس کو اسلامی تصور میں واجب کا اور عبادت کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اور یوں ارادہ ُربانی کے کاگ میں مسلمان بھی اپنا کاگ ملاتا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور ایمان باللہ اور یوم آخرت پر ایمان کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور کائنات کی تعمیر میں مقاصد شریعت کو پورا کرتا ہے اور زمین میں انسانی خلافت کے تقاضے پورے کرتا ہے تمدن کی تشکیل کے حوالہ سے جس کی بہت سی

شکلیں ہیں اور جو کہ ایک دینی کام ہے اور دوسرے مذہبی کاموں کی طرح اس کے بارے میں بھی مسلمان جواب دہ ہوگا کہ اگر وہ تعمیر کائنات سے پہلوتہی کرتا ہے تو گویا اپنے تمدنی فرائض کو پوری طرح انجام نہیں دیتا جیسا کہ اللہ کے ارشاد، واستعمر کم فیہا: (اور اس نے زمین میں تم کو آباد کیا) کی تفسیر میں امام بصاص لکھتے ہیں: ''مطلب یہ ہے کہ زمین کی بناء و تشکیل کا حکم دیا جس کے تم محتاج ہو، اس میں یہ دلیل ہے کہ تعمیر ارضی واجب اور اسلام کے مطلوبات میں سے ہے (احکام القرآن للجصاص 4/378)۔ اور مسلمان کے لیے اس کو کرنا ضروری ہے۔ اگر اس میں کوتاہی کرے گا تو اپنے ایک مذہبی فریضہ میں کوتاہی کرے گا اور اس بارے میں اُسے جواب دہی کرنی ہوگی۔ کیونکہ اپنی کوتاہی سے وہ اپنی غایت وجود یعنی خلافت ارضی کے فرض کو پورا نہیں کر رہا۔ اسی طرف وہ حدیث رہنمائی کرتی ہے جس کی امام احمد نے مسند میں (حدیث نمبر 12925 جلد 3/183) اور امام بخاری نے الادب المفرد میں روایت کی ہے (حدیث نمبر 479 جلد اول صفحہ 168) جو یوں ہے: اگر قیامت قائم ہو جائے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں ایک ٹہنی ہو، تو اگر وہ کھڑے ہونے سے پہلے ہی اسے لگا سکتا ہو تو ضرور لگا دے۔

ایک حدیث میں یہ ہے کہ جس شخص نے بغیر کسی ظلم و زیادتی کے عمارت بنائی، یا بغیر کسی زیادتی کے کوئی پودا لگایا تو اس کو اس کا اجر برابر ملتا رہے گا جب تک اُس سے خلقِ خدا فیضیاب ہوتی رہے گی (اس کی تخریج امام احمد نے کی ہے، حدیث نمبر 15654 اور طبرانی نے معجم کبیر میں 2/181 کی ہے)۔

تو یہ دونوں اور ان کے علاوہ اور بہت سی حدیثیں یہ بتاتی ہیں کہ مسلمان کا تعمیر ارضی اور کائنات کی قوتوں کی تسخیر اور ان کو فائدہ مند بنانے کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے اور شعور سے لے کر قیامت تک جاری رہے گا۔ اور اسلامی تحریک کو دنیا میں ایسی تحریک بننا چاہیے جو مسلسل ایجاد کرنے اور تخلیقی صلاحیتوں سے اللہ کے بندوں کو فیضیاب کرے۔ کیونکہ قیامت آ رہی ہو، اور اس وقت ایک پودہ لگانے کا مقصد، ظاہر ہے کہ اس سے روزی حاصل کرنا اور ضرورت پوری کرنا تو ہو نہیں سکتا، پھر بھی اِس کی تاکید یوں آئی ہے کہ یہ شعور امت میں بیدار رہے کہ اُس کا فریضۂ منصبی تعمیر ارضی ہے اور یہ دین

میں فی ذاتہ مطلوب عمل ہے۔اس شعور کی تو شان ہی یہ ہے کہ اگر وہ بیدار ہو جائے تو مسلمان کو کائنات کے آفاق تک لے جائے اور اپنے فکر و عمل سے اس میں اضافہ کرے اور اس اضافہ کو دین سمجھے۔یعنی بات صرف ضرورت پوری کرنے یا رفاہی کام کرنے کی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر مادی تعمیر اور ایجاد نو کے عمل میں ایمان ایک محرک کا کام دے اور ایمان والے بحر و بر میں نکل پڑیں اور ان کے خزانوں سے استفادہ کریں۔اور تمدن کو بنانے میں حصہ لیں۔

مثال کے طور پر کپڑے بنانے کے کارخانے اور زندگی کے دوسرے سامانوں کے پروڈکشن میں حصہ ڈالیں اور یہ سوچیں کہ ان کے یہ سب کام بھی اللہ کی عبادت میں شامل ہیں، اور ان کاموں کو اسی جذبہ سے انجام دیں جس جذبہ سے ساری عبادتوں کو انجام دیا جاتا ہے۔اگر ایسا شعور بیدار ہو اور کسی بھی میدان میں لوگ پکاریں تو مسلمان دوڑ کر جائیں گے اور اسی طرح اجتماعی طور پر اس میں حصہ لیں گے جیسے کہ جمعہ کے دن اذان سن کر دوڑے چلے جاتے ہیں (عبدالمجید النجار، الشہود الحضاری للامۃ الاسلامیۃ، عوامل الشہود الحضاری 2/4238 عماد الدین خلیل، حول تشکیل العقل المسلم (الریاض: الدار العالمیۃ للکتاب الاسلامی، 1415ھ 1995 ص 136)۔

یہ بات کہ تعمیر ارضی بھی اللہ کے منہج کے مطابق ایک عبادت ہے، اور مسلمان کے لیے اُس کا کرنا واجب ہے، اور اگر اس فرض کو نہ کرے گا تو گنہ گار ہوگا، اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کا محتاج بننے سے روکا ہے۔اور وہ حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے جو بخاری میں آئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: جو بھی مسلمان کوئی پودہ لگاتا ہے، یا کچھ بوتا ہے اور اس سے کوئی انسان ،کوئی پرندہ یا کوئی جانور کھاتا ہے تو وہ اس مسلمان کے لیے صدقہ ہوگا (اس کی تخریج گزر چکی) تو ان احادیث سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعمیر ارضی، ایجاد نو اور مادی بھاگ دوڑ بھی مذہبی فریضہ ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ توکل جامد، سستی و کاہلی، بے کاری اور عدم ایجاد کا رویہ ایک غلط رویہ ہے اور اِس رویہ کو ان احادیث سے جواز نہیں دیا جا سکتا جو زہد اور ترکِ دنیا کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں۔مثلاً یہ حدیث کہ: **ازھد فی الدنیا**، دنیا سے بے رغبت ہو جاؤ اللہ تم سے محبت کرے گا، اور جو لوگوں کے پاس

ہے اُس سے بے رغبت ہوجاؤ، لوگ تم سے محبت کریں گے اس کی تخریج ابن ماجہ نے کی ہے: 2/1373 کتاب الزہد، باب الزہدفی الدنیاحدیث نمبر: 4101 حاکم نے مستدرک میں روایت کی: 4/348 حدیث نمبر7873ان کی روایت ہے کہ: لوگوں کے ہاتھ میں جو ہےاس سے بے نیاز ہوجاؤ لوگ تم سے محبت کریں گے۔اور کہا: یہ حدیث صحیح الاسناد ہےمگر شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی)۔

اور یہ حدیث: جان لو کہ دنیاملعون ہےاوراس کےاندرکی چیزیں ملعون ہے،سوائے اللہ کے ذکراورمتعلقاتِ ذکرکے اورعالم کے اورعلم سیکھنے والے کے (ترمذی نے بھی سنن میں اس کی روایت کی ہے، 4/561 حدیث نمبر2322اور کہایہ حدیث غریب ہے۔ابن ماجہ نے اپنی سنن میں کی ہے:2/1277 حدیث نمبر4112رہی یہ بات کہ نبی ﷺ پر ایسے اوقات گزرتے تھے جب آپؐ بھوکے رہتے ، اورآپؐ کے پاس کچھ نہ ہوتا،یعنی آپؐ غریب وفقیر تھے،تواِس پرنظرثانی کی ضرورت ہے۔کیونکہ صحیح بات یہ ہے کہ آپؐ مالدار تھے،امام سیوطی نےتفسیر درمنثور میں سورہ الحشر کے تحت نبی ﷺ کی ثروت کے وسائل وذرائع کے بارے میں ذکرکیاہے کہ وہ بہت سے تھے،مثال کے طور پر فئے ، مال غنیمت وغیرہ۔تاہم اکثراوقات آپؐ اپنے گھر میں کچھ نہ چھوڑتے تھے بلکہ سب غریبوں میں تقسیم کردیتے تھے جیسا کہ بخاری کی حدیث ہے کہ حضرت عقبہ کہتے ہیں کہ میں نے مدینہ میں آپؐ کے پیچھے عصر کی نماز پڑھی،آپؐ نے سلام پھیرااور سلام پھیرتے ہی لوگوں کی گردن پھلانگتے ہوئے ایک حجرہ کی طرف گئے،لوگوں کوآپؐ کی جلدی پرحیرت تھی۔پھرآپؐ واپس آئے اورلوگوں کی حیرت دیکھ کر فرمایا: مجھے یادآیا کہ ہمارے ہاں کچھ سونا (تبر) رکھاہواہے۔مجھے ڈرہوا کہ میرادل اُس میں نہ لگ جائے تومیں نے اس کوتقسیم کرنے کاحکم دیا۔اورصحیح ابن حبان میں ہے کہ جب رسول اللہ کی تکلیف بڑھ گئی توعائشہؓ فرماتی ہیں کہ: آپؐ کے پاس سات یانودینار تھے،آپؐ نے فرمایا: اے عائشہؓ! ان دیناروں کا کیاہوا؟ میں نے کہا کہ میرے پاس ہیں،فرمایا: ان کوصدقہ کردو،راوی نے کہا: حضرت عائشہؓ نے ان کوکئی حصوں میں بانٹ لیااتنے میں آپؐ نے پھر پوچھاعائشہؓ،ان دیناروں کا کیاہوا؟ میں نے کہا کہ میرے پاس ہیں۔فرمایا: ان کومیرے پاس لےکرآؤ،وہ لےکرآئیں،توآپؐ نے اس کوہتھیلی پررکھ کرکہا: محمد کا کیا گمان ہے اگراللہ کابلاوا آگیااور یہ مال اس کے پاس ہو؟ محمد کا کیا گمان ہے اگراللہ کابلاوا آگیااور یہ مال اُس کے پاس ہو؟)۔

لوگوں نے اس زہدکوسلبی معنوں میں لےکر یہ سمجھ لیاہے کہ مومن کودنیا کوچھوڑ دینااورزمین کی آبادکاری کی کوشش کوترک کردیناچاہیےحالانکہ یہ بات اسلام کی حقیقت اوراُس کی روح کےخلاف ہے بلکہ اس زہدسےمرادزہدِ ایمانی ہےیعنی یہ کہ مومن اس دنیاہی کوسب کچھ سمجھ کرآخرت کوفراموش نہ کرنے لگے۔اس کوتکبر، اتراہٹ ،اسراف اورفضول خرچی جیسی بیماریاں نہ لگیں وہ دنیاومافیہاسے

دھوکہ میں پڑ کرظلم وسرکشی اورفساد پر نہ اتر آئے۔کیونکہ جولوگ ان چیزوں کا شکار ہوجاتے ہیں وہ اعمال صالحہ اوران کے اہتمام سے بے نیاز ہوکر دنیامیں گلے گلے اتر جاتے ہیں۔آداب دینی سے اعراض کرتے اوراپنی آخرت کو برباد کرلیتے ہیں (التحریروالتنویر20/178) ان احادیث میں ان چیزوں کا شکار بننے سے مومن کوروکا گیاہےاور بتایا گیاہے کہ وہ دنیا کا غلام نہ بنے اس کا مالک بنے اوراس کورب تعالیٰ کے احکام کے مطابق اپنے لیے مسخر کرے۔اس طرح یہ حدیثیں توتعمیر دنیا کی داعی بن جاتی ہیں اورمومن کی دنیاوی ترکتاز کو اسلام کی قدروں کے تابع بناتی ہیں۔ظاہر ہے کہ یہی ہمارے نبی ﷺ اورصحابہؓ کامنہج تھا کہ آپؐ طیباتِ دنیا سے کھاتے تھے۔لیکن ان ہی کواپنا مشغلۂ حیات نہیں بناتے تھےاور ہرنماز کے بعدآپؐ یہ دعافرماتے:اللھم انی اعوذ بک من الکفر والفقر سنن(النسائی باب التعوذ فی دبرکل صلاۃ3/73حدیث نمبر1347 (اے اللہ میں کفراورفقر سے تیری پناہ چاہتاہوں)۔

جیسا کہ آپ سے یہ دعابھی مروی ہے:واعوذ بک من فتنۃ الدنیا (بخاری کتاب الدعوات ،باب التعوذ من فتنۃ الدنیا5/2347حدیث نمبر6072) اور میں دنیاکے فتنہ سے بھی تیری پناہ لیتاہوں۔تومسلمان جوزمین کی تعمیر یہ سمجھ کرکرتے ہیں کہ وہ بھی آسمانی زندگی کا ہی ایک مرحلہ ہے جوان کی غایت ہے۔اوراس کی ثروت وتخلیق میں اپناحصہ اس لیے ڈالتے ہیں کہ وہ اس کے خلیفہ ہیں،ان کو زہدسلبی سے سب سے زیادہ دوررہنا چاہیے۔اورزہدایجابی سے قریب تر ہونا چاہیے جوان کو دنیا کا غلام نہیں مالک بنادے گا۔اوروہ زمین پردوسرے طاغوتوں کوبھی اس کوخورد برد کرنے سے اوردوسروں کا استحصال کرنے سے بچائے گی۔اس طرح زندگی میں ان کی تہذیبی جدوجہدکوفریم اللہ کا یہ قول فراہم کرے گا:یاایھاالذین آمنو الاتلھکم:اے ایمان والوتمہیں تمہارے مال واولاد اللہ کے ذکر سے غافل نہ کردیں اورجوایسا کرے گاتو وہی لوگ گھاٹے میں رہیں گے(المنافقون9)اوراللہ کاقول:واعلمواا نما اموالکم:اورجان لوکہ تمہارے مال اورتمہاری اولادتمہارے لیے آزمائش کی چیز ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑااجر ہے(انفال:280)۔

تو زندگی اوراس میں منہج الٰہی کے تحت دوڑ دھوپ وہ آخرت کی کامیابی کا زینہ ہے۔جو آدمی اس میں کوشش نہ کرے اس میں کوئی بھلائی نہیں ۔ہاں اگر دنیاوی تگ ودو میں آدمی منہج الٰہی سے دور ہوجائے،اسی کو اپنی منزل سمجھ لے اوراسے فساد کا ذریعہ بنالے،تو یہی وہ کوشش ہے جوانسان کو اپنے رب سے دور کردے گی ۔اوراس کو دنیا کے اندرخلافت کے وظیفہ سے باز رکھے گی ،لہٰذاایسے عمل سے دور رہناواجب ہوگا۔اوراس مقصد سے کہ مومن کا دل دنیاہی کے رنگ میں میں نہ رنگ جائے اور حصول آخرت سے اسے روک نہ دے ،دنیا کی تحقیر کی گئی اوراسے اس کا جوواقعی مقام ہے وہ دیا گیا کیونکہ بہرحال دنیافانی ہےاورآخرت کی اصل زندگی کی ایک ناگزیرمنزل ہے۔اب اگراسی کو آخرت کا مقابل بنالیاجائے وہی اصل نشانہ بن جائے تو وہ فریضۂ خلافت کی ادا ئیگی میں رکاوٹ اور باعثِ فساد بن جائے گی۔

لیکن اگرمعاملہ اس کے برعکس ہواوردنیا کوآخرت کی زندگی کا ایک آلہ ہی خیال کیاجائے ،اس کی تعمیروتسخیر میں اللہ سے تعلق مضبوط رکھاجائے ۔تواس صورت میں دنیابجائے تنافس شرکی جگہ ہونے کے خیروفلاح اور بناءوتجدید کا مقام ثابت ہوگی ،نیک اوراچھی ایجادوں کا مرکز بنے گی اوراللہ کےاس قول کا مصداق ہوگی:و ابتغ فیما آتاک الله:اوراللہ نے جوکچھ تم کودیاہےاس سےآخرت کے طلب گار بنو،مگر دنیاسے اپنا حصہ لینا بھی مت بھولواوراحسان کروجیسا کہ اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیاہےاورزمین میں فساد نہ چاہو،بلاشبہ اللہ فساد پھیلانے والوں کو پسند نہیں کرتا(القصص:77)۔

☆☆☆

# اسلامی تصور میں تعمیر ارضی کے ابعاد

## اولا: کائنات میں تہذیبی کارنامہ اور ایمانی بُعد

زندگی کی تعمیر کے لیے تہذیبی جدوجہد اور اس کے وسائل کو ترقی دینے کے سلسلہ میں مسلمان کا نقطۂ آغاز ایمان باللہ ہوتا ہے۔جس نے اس کے لیے کائنات کی اشیاء کو مسخر کیا اور اس کے وسائل کو ترقی دینے کا حکم دیا،اس کو اپنی عبادت کا عمل اور امر خلافت کی انجام دہی قرار دیا اور اپنے ثواب ورضا کی طلبی بتایا،جیسا کہ صحیح بخاری میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ: کوئی بھی مسلمان جو پودہ لگاتا ہے یا کوئی چیز بوتا ہے جس سے کوئی پرندہ،کوئی انسان یا کوئی جانور کھاتا ہے تو اس مومن کے لیے یہ صدقہ ہوجائے گا (اس کی تخریج گزرچکی ہے)ابن حجر نے کہا کہ مسلم کی روایت میں یہ ہے کہ وہ قیامت تک کے لیے صدقہ ہوجائے گا۔اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک اس پودہ سے کھایا جاتا رہے گا،اس کا ثواب بھی بڑھتا رہے گا اگرچہ وہ پودہ لگانے والا یا بونے والا مرجائے یا اس کی ملک کسی دوسرے کو منتقل ہوجائے۔طیبی نے کہا: حدیث میں مسلم کا لفظ نکرہ لایا گیا ہے اور اس نہی کے سیاق میں رکھا ہے اور اس طرح استغراق میں اضافہ کردیا گیا ہے جو حیوان کو بھی شامل ہوگیا ہے۔

تاکہ علی سبیل الکنایۃ اس کا معنی یہ ہو کہ وہ مسلمان چاہے آزاد ہو یا غلام،فرمانبردار ہو یا نافرمان،کوئی بھی جائز عمل کرتا ہو اور اس کے کام سے کوئی بھی حیوان فائدہ اٹھاتا ہو تو اس کا نفع اسے بھی پہنچے گا اور ثواب ملے گا(فتح الباری 5/4)۔

تو اس حدیث میں وہ زبردست تہذیبی سبق ہے جو اسلام نے زمین کی ایمانی تعمیر کے لیے دیا ہے۔اور یہ بتایا ہے کہ انسان کا کردار اس سلسلہ میں کیا ہوگا۔یہاں دو باتیں کہی گئی ہیں:

جانوروں و پرندوں کوشفقت کی نظر سے دیکھا گیا ہے اور مسلمان کواس بات پر ابھارا گیا ہے کہ وہ اپنے اور دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لے کر تعمیر ارضی کا کام کرے اور اس ثواب واجر کی امید رکھے۔ یہاں تک کہ اگر وہ فاسق بھی ہو تب بھی۔ کیونکہ طیبی کی شرح کے مطابق اس میں تعمیم واطلاق ہے۔ بلکہ پودہ لگانے والے اور بیج بونے والے نے ثواب حاصل کرنے کا قصد بھی نہ کیا ہو تب بھی ان کو ثواب ملے گا۔ کیونکہ انہوں نے لوگوں پر اس کے فائدہ کو وسیع کیا ہے۔اس میں اس پر بھی ابھارا گیا ہے کہ زمین کی تعمیر اپنے لیے اور اپنے بعد میں آنے والوں کے لیے کی جائے کیونکہ عینی کی شرح میں سبھی اس کے اندر شامل ہیں (عمدۃ القاری شرح البخاری، 156-12/155)۔

تعمیر ارضی کے لیے مسلمان کا ایمان باللہ کو بنیاد بنانا ایک ایسا معیار ہے جس سے تہذیبی جدوجہد میں اس کو زندگی میں سرگرم رہنے کے لیے ایک قوت محرکہ ملتی ہے اور غیر معمولی صلاحیت بھی۔ کیونکہ جب وہ تہذیبی سفر شروع کرتا ہے تو اُسے رب تعالی کی مدد وتوفیق حاصل ہوجاتی ہے وہ ظن وگمان سے دور ہوتا ہے، بلکہ اشیاء کو حقائق کی بنیاد پر مانتا ہے اور ان کے منافع کو سمجھتا ہے کیونکہ حدیث کے مطابق اسے اس بات کی بصیرت حاصل ہوجاتی ہے۔جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ میرا بندہ برابر فرائض سے بڑھ کر عمل کر کے میرا تقرب حاصل کرتا ہے وہ نوافل سے میرا قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں اور اگر وہ میری پناہ چاہتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں (عمدۃ القاری، 156-12/155) جیسا کہ ایمان باللہ اور اللہ کا تقوی مومن کو بقاء اور اس کے اعمال کو زمان ومکان میں امتداد و برکت عطا کرتے ہیں۔جیسا کہ فرمایا: ولو ان اھل القری :اور اگر بستیوں والے ایمان لے آئے ہوتے اور انہوں نے تقوی اختیار کیا ہوتا تو ہم ضرور ان پر آسمان وزمین کی برکتیں کھول دیتے، لیکن انہوں نے تو تکذیب کی روش اختیار کی تو ان کی تکذیب کی وجہ سے ہم نے ان کو پکڑ لیا (الاعراف:

96) تو یہ آیت کریمہ ہمیں توفیق الٰہی کی کنجی سے آگاہ کرتی ہے۔ اورزمین کی ایمانی آبادکاری کے اسلامی تصور کے اصولوں سے واقف کراتی ہے۔ جو یہ ہے کہ: ایمان اور تقوی اور انسانی زندگی میں اللہ کے منہج کا قیام صرف یہی نہیں کرتا کہ آخرت کی کامیابی کا ضامن ایمان والوں کے لیے بنتا ہے' حالانکہ یہی کامیابی مقدر اور دائمی ہے۔ بلکہ وہ ساتھ ہی ساتھ دنیا کے امور کی اصلاح کا بھی ضامن بنتا ہے (اس کی تخریج گزر چکی ) جیسا کہ ایمان باللہ مومن کو سعادت وطمانیت دیتا ہے اور زندگی کو تحریک دینے میں یوں چلتا ہے کہ اُس کو نہ قلق لاحق ہوتا ہے نہ اکتاہٹ نہ بے کاری اور نہ اضطراب چاہے جتنی بھی شدت لاحق ہو اور کیسے ہی مشکلات پیش آئیں۔ اِس لیے کہ وہ یقینی طور پر جانتا ہے کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ ایک حکیم ورحیم کی تقدیر سے ہو رہا ہے۔ اور زندگی کو مکدر کرنے والی جو مشکلات پیش آرہی ہیں وہ سب خالق جل وعلا کی جانب سے آزمائش ہیں کہ کیا بندہ کفر کرتا ہے یا صبر کرتا ہے کہ نہ اُس کو فقر کا خوف لاحق ہو نہ موت کا اور نہ کسی بیماری کے وقت کمزور ہو کیونکہ وہ ہمیشہ ہی اپنے رب کی پناہ لیتا ہے اور اسی لیے اس کے دل میں اطمینان وسکون رہتا ہے اور اس کی کوشش بہتر ہوتی ہے۔ اور اسے وہ 'انس' حاصل ہو جاتا ہے جس سے اس کی روح کو غذا حاصل ہو، کیونکہ اس کے آس پاس کی ہر چیز اسے دوست لگتی ہے کہ سب اللہ کی صناعی ہے، جو اس کا محافظ ہے۔ اور اللہ اُسے ایسی 'سکینت' عطا کرتا ہے جو اسے زمین میں جدوجہد کرنے اور اُس کی تعمیر کی قوت دیتی ہے۔ اللہ نے فرمایا: جو ایمان لائے اور جن کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہیں۔ یاد رکھو کہ اللہ کے ذکر سے ہی قلوب کو اطمینان ملتا ہے۔ (الرعد: ۲۸) یعنی ان کو اطمینان اس لیے ملتا ہے کیونکہ یہ احساس ہوتا ہے کہ ہمارا تعلق اللہ سے ہے۔ اُس کے جوار میں انس، اس کے دامنِ رحمت میں حفاظت ملتی ہے۔ ان کے دلوں کو یہ اطمینان ہوتا ہے کہ اکیلے نہیں رہیں گے، راستہ میں سرگشتہ نہ ہوں گے۔ اور ان کو خلق، دنیا اور آخرت کی حکمت کا ادراک ہوتا ہے۔ اور اس احساس سے بھی اطمینان ہوتا ہے کہ اللہ ہر زیادتی ہر ضرر اور ہر 'شر' سے بچائے گا۔ ہاں وہ جو چاہے گا تو تکلیف لاحق ہوگی۔ پھر آزمائش پر صابر رہے گا اور مصیبت پر صبر کرے گا۔ اُسے اطمینان ملتا ہے کیونکہ ربِ تعالیٰ ہدایت، رزق اور دنیا وآخرت

میں اس کا ستر فرما کر اس کو اطمینان دیتا ہے۔تو اُس سے زیادہ شقی اور کون ہوگا جو اِس زمین میں اپنے اردگرد کی کائنات سے کٹا ہوا ہو کہ وہ اس مضبوط رابطہ سے کٹ گیا ہے جو اُسے خالقِ کائنات یعنی اللہ تعالیٰ سے جوڑے، اُس سے زیادہ شقی اور کون ہوگا جو نہیں جانتا کہ کیوں آیا اور کیوں جائے گا؟ اور جس نے یہ نہ جانا کہ زندگی کی مشقتیں کیوں جھیلی جاتی ہیں۔اور اُس سے زیادہ بدنصیب اور کون ہوگا جو زمین میں یوں چلتا ہے کہ ہر چیز سے اسے خوف لاحق ہوتا ہے کیونکہ اسے اپنے اور دنیا کی ہر شیئ میں مخفی تعلق کا علم نہیں۔اس سے زیادہ شقی زندگی میں اور کون ہوگا جو زندگی کے بے آب وگیاہ میدان میں اپنا راستہ اکیلا ہی طے کرتا ہے۔اکیلا ہی مزاحمت کرتا ہے کوئی اس کی مدد کرنے والا نہیں،کوئی راہ دکھانے والا نہیں اور کوئی مددگار نہیں۔بلاشبہ زندگی میں کچھ ایسے لمحات آتے ہیں جن کے سامنے جم نہیں سکتا سِوائے اُس کے کہ جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہو اور اُس کی حمایت پر مطمئن ہو۔واقعہ یہ ہے کہ چاہے جتنی قوت،صلابت،ثبات اور اعتماد حاصل ہو، پھر بھی زندگی میں ایسے لمحے آتے ہیں جب یہ سب کچھ ہَوا ہو جاتا ہے اور ایسے وقت میں صرف وہی ثابت قدم رہتے ہیں جو اللہ پر اطمینان رکھتے ہوں (فی ظلال القرآن،367:4)۔

ساتھ ہی یہ ایمان باللہ اس بات کی ضمانت بن جاتا ہے کہ اس کی یہ طاقت استحصالی طاقت اور کفر کی مددگار اور دنیا کی ثروتوں کو لوٹنے کھسوٹنے والی قوت نہ بن جائے جو زمین میں بربادی پھیلائے،اس کے وسائل کی اجارہ دار بن جائے اور مخلوقِ خدا کو اپنا غلام بنالے۔اللہ تعالیٰ نے زمین کا اقتدار کس کو دیا جاتا ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: **الـذین ان مکناھم فی الارض**: یہ وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جب ہم ان کو اقتدار بخشتے ہیں تو وہ نماز قائم کرتے،زکوۃ ادا کرتے،معروف کا حکم دیتے اور برائیوں سے روکتے ہیں، اور اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے تمام معاملات کا انجام (الحج:41)۔

اس کا مطلب ہے کہ زمین میں جو تحریک بھی ایمان باللہ سے دور ہوگی وہ انحراف وبغاوت کی بنیاد بن جائے گی،وحی کی روشنی سے محروم وہ زمین میں خلافتِ راشدہ کے کردار سے دست بردار ہو جائے گی۔وہ ان صالح قدروں سے دور ہو جائے گی جو نقوشِ راہ بنیں جو ہدف کو

بتائیں اور جو انسان کو آسمان سے مربوط رکھیں۔

جیسا کہ ہم اِس کا نمونہ اُس مغربی استعماری قوت میں دیکھ رہے ہیں جو آسمانی ہدایت سے منقطع اور زندگی میں اس کی اخلاقیات سے دور ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی میں ایمانی بُعد کا اثر صرف یہی نہیں ہوتا کہ تعمیرِ دنیا میں مسلمان کی کوششوں کو وہ انتشار، بکھراؤ اور گراوٹ سے دور کرے اور اسے بقاء واستمرار عطا کرے بلکہ ساتھ ہی وہ ان کوششوں کو ظلم وجبر، دست درازی، جارحیت اور انسان کے ذریعہ انسان کے استحصال وغیرہ کو روکتا ہے اور زندگی کو اللہ کی سنت کے مطابق رخ دیتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: تلک الدار الآخرۃ: وہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کردیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں۔ اور انجام کی بھلائی متقیوں کے لیے ہے (القصص:83)۔

**ثانیا: مقصدی پہلو:** یہ زمین کی ایمانی تعمیر کا دوسرا بُعد ہے جو زندگی کے معرکہ میں اسلامی نقطۂ نظر سے یہ بتاتا ہے کہ زمین میں انسان کی خلافت مطلق خلافت نہیں ہے بلکہ وہ خلافتِ تابعہ ہے۔ اس کی اساس ایمان باللہ ہے اور اس کی غایت یہ ہے کہ زمین پر اللہ کے امر ونہی کے مطابق اور اس کی منشاء سے اللہ کی عبادت کا مقصد پورا کیا جائے۔ یہ غرض اللہ کی پیدائش کے لحظۂ اول سے ہی اس کے ساتھ ہے۔ چنانچہ فرمایا: اور ہم نے جن وانس کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ (الذاریات:56) یوں سفر کی منزل اور نشانہ اللہ تعالیٰ ہے اور زمین پر صالح تہذیبی جدوجہد کی غایت بھی اللہ کی رضا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ کائنات میں انسان کی تہذیبی سرگرمی اور اجتماعی وطبعی طور پر اس کی تعمیر استخلاف ِالٰہی کی قدروں کے تابع ہو۔ جو انسان کو کلی وجامع تکریم کا فلسفہ دے گی اور کائنات اور فطرت کو انسانیت کی بھلائی کے لیے تسخیر کرنے کا نظریہ دے گی۔ اور یوں انسان مادیات سے آگے بڑھ کر تمام تصورات کو ان مطلق قدروں سے جوڑ سکے گا۔ جن کو شریعت نے متعین کیا ہے۔ اور جن کے التزام کا شرع نے تقاضا کیا ہے۔ اِس کا مطلب ہے کہ زمین کی ایمانی تعمیر کا رخ غیر ایمانی تعمیر کے اغراض ومقاصد سے بالکل ہی جدا ہوگا۔ چنانچہ ایمان والی تعمیر بس ''دنیا کی حد پر'' نہ رک جائے گی جیسا کہ

زندگی کے مادی فلسفہ کا حال ہے کہ وہ اجمالی طور پر زندگی اور وجود کے کسی بھی مقصد سے انکاری ہے ،اُس کا کہنا ہے کہ زندگی تو خود ایک مقصد ہے،اُس کے ماوراء کوئی غرض وغایت نہیں۔ بلکہ بعض کے نزدیک تو زندگی اپنے سفر میں ایک کھول کود کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ''تکنیکی عقل''کو پوری چھوٹ ملنی چاہیے۔اوراس کو کسی اخلاقی ،مقصدی قدر یا پابندی سے الگ رکھنا چاہیے۔اورخواہشوں کو پورا کرنے کے لیے پوری آزادی ملنی چاہیے۔ چنانچہ اشیاء کے ساتھ اپنے رویہ میں وہ توازن کھودیتے ہیں۔ چاہے معاملہ چھوٹے میدانِ عمل کا ہو جہاں باغ بغیچے اور پھل پھول ہیں یا اُس سے آگے بڑھ کر کائنات کا ہو جس میں سمندر، افلاک اور فطرت اور ہر چیز ہے۔ اور انجام کار اس کا نتیجہ ایک عالمگیر پس ماندگی (یہ وہ تصور جس کو مغرب کے ترقی کے تصور کے بالمقابل ڈاکٹر عبدالوہاب المسیری نے پیش کیا ہے، ترقی کا مغربی تصور سراسر مادی ہے اور اس میں وحی اور غیب وغیرہ کی کوئی جگہ نہیں، اُس میں سائنسی اور ٹیکنیکی ترقی ہی اصل ہے جو انسانی قدروں کا گلا گھونٹتی ہے اور جس نے کائنات زندگی اور انسان پر سلبی اثرات مرتب کیے ہیں، دیکھیں: حوارات مع الدکتور عبدالوہاب المسیری، الثقافة والمنہج تحریر: سوزان حرمی ص 327-314) کی صورت میں نکلے گا جو کہ جدیدیت کی فکر اور قدروں کا ایک فطری نتیجہ ہے کہ وہ وحی اور غیب کے سرچشموں سے کلی طور پر منقطع ہے۔ جہاں تک زمین میں اسلامی تصور کے مطابق تعمیر کی غرض وغایت ہے تو آخرت کا لحاظ رکھنے سے مشروط ہے اور ان قدروں کے تابع ہوتی ہے جو زندگی میں انسان کے ہر عمل وسعی کو منظم ومنضبط کرتی ہیں۔یعنی انسان زندگی کی تحریک اور تعمیرِ دنیا میں آخرت رخی ہوتا ہے۔

جیسا کہ فرمایا: وابتغ فیما آتاک الله : اور اللہ نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس سے آخرت کے طلب گار بنو، مگر دنیا سے اپنا حصہ لینا بھی مت بھولو اور احسان کرو جیسا کہ اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد نہ چاہو، بلاشبہ اللہ فساد پھیلانے والوں کو پسند نہیں کرتا (القصص:77) یعنی آخرت طلبی ہی مومن کے کاموں کا دائمی محرک ہے، جو کائنات میں مسئولیت امانت اور استخلافِ تمدنی کے سیاق میں ہوتے ہیں۔اس کے معنی یہ ہیں کہ مومنانہ تحریک وہ تحریک ہے جس میں آخرت اور دنیا دونوں کے راستے ملتے ہیں جس میں آخرت کی کامیابی کا راستہ ہی صلاحِ دنیا کا راستہ بھی ہے

۔اوراُس میں زمین کے اندر جو ایجاد، پروڈکشن اورخوش حالی آتی ہے، وہی ثوابِ آخرت کے لائق بھی اُس کو بناتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی سرگرمیوں میں مادہ کی قید سے آزاد ہوکر دنیوی زندگی کے تنزل سے بلند زندگی کی طرف اٹھتا ہے (اسلام کے ساتھ مغرب کی تہذیبی کشمکش کا سبب یہی ہے کیونکہ مغرب انتہاپسند مادیت کا علمبردار ہے اوراسلام اس کا روادار نہیں) کیونکہ شارع کے نزدیک دنیا کے سارے کام اخروی مصالح کے لحاظ سے ہی معتبر ہوتے ہیں (ابن خلدون، المقدمہ صفحہ 191-190)۔

جیسا کہ وہ ایسی غایتیں ہیں جن کا مقصد صرف یہ نہیں کہ انسان کی مادی ضرورتیں پوری کر لی جائیں یعنی کھانا، پینا، رہنا اور جنسی ضرورت، یوں کہ یہ انسان کی بنیادی ضرورتیں ہیں اوران کے علاوہ عقل اورروح کے جو مطالبات ہیں وہ ثانوی ہیں!! بلکہ زمین کی ایمانی تعمیر تو عقل وروح کے تقاضوں کو زیادہ اہم قرار دیتی ہے۔اور یہ سمجھتی ہے کہ ان سے غفلت برتنا جائز نہیں، نہ یہ جائز ہے کہ کوئی ایسا کام کیا جائے جس سے یہ تقاضے خراب ہوجائیں۔اس کی نظر میں یہ تقاضے بھی کھانے پینے، رہنے اور جنسی ضرورت کی طرح ہی بنیادی ہیں۔ یہ ایسی ضرورتیں ہیں جن میں دنیاوآخرت دونوں میں انسان کی بھلائی ہے۔ بلکہ یہ دوسرے تقاضے پہلے والوں سے اعلی ہیں کیونکہ پہلے والے تقاضوں میں توانسان اورحیوان برابر ہیں، دوسرے والوں میں انسان جانوروں سے ممتاز ہوتا ہے۔اورجن کو نظرانداز کردینے سے انسان، انسان نہیں حیوان بن جاتا ہے!! تو زمین کی آبادکاری، مادی وروحانی میں فرق نہیں کرتی بلکہ یہ کہتی ہے کہ دونوں ہی ضروری ہیں، جیسا کہ اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے: کہہ دو میری نماز، میری عبادت اور میرا مرنا اور جینا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہیں (الانعام:162) تو زمین کی ایمانی تعمیر کا یہ بُعد غایتِ حقِ دنیا اورحقِ آخرت میں گہرے رشتہ پر قائم ہے۔اس میں مادی ضرورتوں کو بھی پورا کیا جاتا ہے اورروحانی تقاضوں کو بھی۔اوراس سلسلہ میں سدِ بابِ ذریعہ اور فتحِ بابِ ذریعہ کے اصول کے مطالعہ کی ضرورت ہے (میں اِس اصول کو ''التدبروالاعتبار'' (غوروفکراورعبرت پذیری) کا نام دیتاہوں، جس میں یہ ضروری ہے کہ اشیاء کی حکمت اوران کے اسباب، ان کی اساسات اورنتائج سب کوایک ساتھ پڑھا جائے ۔چنانچہ افعال کے نتائج وثمرات کے اعتبار سے ہی فعل پر حکم لگایا جائے گا۔مثلاً اگر وسائل ناجائز مقاصد تک پہنچائیں گے تو وہ

بھی ناجائز ہوں گے، افعال کے نتیجوں اور مستقبل میں کسی حکم کے کیا نتیجے نکلیں گے اس پر بھی غور کرنا ہوتا ہے اسی اساس پر مصالح کا اندازہ اور احکام کی بناء رکھی جاتی ہے )۔

معلوم ہوا کہ زمین کی ایمانی تعمیر کے اصولوں میں سے یہ بھی ہے کہ ہر کام میں دنیا و آخرت، مادی تقاضوں اور روح کے مطالبات کو ایک ایسے سیاق میں جمع کر لیا جائے جسمیں یہ دونوں ملکر تصویر مکمل کرتے ہوں۔

جہاں ایک طرف اشیاء کے مقاصد اور ان پر حکومت کرنے والی قدروں کے مابین ربط ہو، اور دوسری جانب خلافت اور تعمیر و اصلاح کے لیے ان قدروں اور کائنات کی حرکت کے مابین ربط ہو۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ایسی تعمیر دنیا ہوگی جو ہر اعتبار سے اخروی نقطہ نظر کی حامل ہوگی جس میں پورے طور پر دنیا و آخرت کے درمیان تعلق ہوگا۔ اس پر دو امر مرتب ہوں گے۔

**اولا: زمین میں توازن اور اقامتِ عدل :** تو جو آدمی زندگی کی سرگرمیوں میں خلافت اور تعمیرِ ارضی کے لیے اللہ کے منہج اور اس کے احکام کے مطابق اور اس کی منشاء کو پورا کرتے ہوئے کام کرے گا۔ اس کے احکام کو جاری و نافذ کرے گا۔ اور اُسے یہ شعور ہوگا کہ اس کی زندگی کا ایک مقصد ہے اس کے وجود کے مستقبل میں کچھ معنی نکلیں گے۔ وہ اپنے حال کو اس طرح جیے گا کہ اسے معلوم ہوگا کہ دنیا میں وہ جو کچھ کرے گا اس کا بدلہ آخرت میں ابدی نعمتوں کی شکل میں ملے گا، جس کی زندگی کے اعمال ان چیزوں پر مبنی ہوں گے۔ س کے اندر مادہ اور روح کے عناصر توازن کے ساتھ ہوں گے اور وہ روح کی ترقی اور اس کو اونچا اٹھانے کے لیے کام کرے گا۔ ساتھ ہی وہ اپنی زندگی کی حفاظت و توسیع کے لیے کام کرے گا، اس کے اندر عقل و جذبہ اور احساس و شعور سب میں توازن پیدا ہو جائے گا۔ اس کے جذبات اور اشواق دونوں میں سے کسی میں بھی افراط و تفریط نہ ہوگی۔ جیسا کہ اس کے انفرادی و اجتماعی گوشوں میں بھی اعتدال و ہم آہنگی ہوگی۔ جس سے یہ ہوگا کہ دنیا کی تعمیر، نمو اور کائنات کی چیزوں کو تسخیر کرنے میں بھی اعتدال و توازن سے کام لے گا۔ چنانچہ وہ صَرف کے ان اوسط اعداد پر اعتماد نہ کرے گا۔ جن پر ترقی کا رائج مغربی تصور طاری ہے۔ جس کے مطابق

''وسائل حیات کم ہیں اورضروریاتِ زندگی لامحدود''۔ بلکہ اس کا اعتبارتواس چیز پر ہوگا کہ اسلامی قدریں پوری ہورہی ہیں یانہیں جن میں ہرچیز میں توازن پایاجاتا ہے۔اورجن کی دعوت یہ ہے کہ سب لوگوں میں عدل وانصاف قائم کیاجائے اورجس میں بنیادیہ اصول ہوکہ'' وسائل بےشمار ہیں اورضروریاتِ زندگی پرکنٹرول کرنے کی ضرورت ہے''۔اس تصور کےساتھ کوئی ایک نسل یاقوم یہ نہیں چاہےگی کہ دوسروں کوچھوڑکرکائنات کےسارےوسائل پراسی کا قبضہ ہوجائے اوراس کی اجارہ داری قائم ہوجائے بلکہ ہرنسل زیادہ سے زیادہ فرائض انجام دے گی تاکہ وہ دوسری نسلوں کاتحفظ بھی ہوسکے۔ یہ چیز امت کےمفہوم کے مطابق ہےجس کو اللہ نے عام مسلمانوں کے لیے رباطِ جامع بنایاہے۔ چاہے جوبھی زمان ومکان ہو،اس سے اسلامی تہذیب میں ایک شعوری تحریک کےعناصرکی نظریہ سازی ہوتی ہے۔جیسا کہ فرمایا: وان ھذہ: یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہےاور میں تمہارارب ہوں لہٰذا میرا تقوی اختیار کرو (المومنون: 52) توامت کے اندرکسی اجتماعیت کا وجود یوں نہیں ہوتا جیسے مزیدحقوق کےحصول کے لیےگروپ بندی کی جاتی ہے بلکہ یہ تووہ اجتماعیت ہےجس کودینی فرائض انجام دینے ہیں۔اورتزکیہ کی قدروں سے متصف ہونا ہے۔امت کی اس اجتماعیت میں مومن کا دوسرےمومن سےتعلق، چاہےاس کا ہم عصرہو یابعد کا ہو، باہمی رحمت اوراحسان کاتعلق ہونا چاہیے۔
(الامۃ اوراس کے خصائص اورافرادامت کے مابین تعلقات کے لیے دیکھیں منیٰ ابوالفضل ،الامۃ القطب ،نحوتاصیل منہاجی لمفہوم الامۃ فی الاسلام سلسلۃ قضایاالفکرالاسلامی نمبر ۱۴ (القاہرہ ،المعہد العالمی للفکرالاسلامی 1417ھ 1996 احمد حسن فرحات ،الامۃ فی دلالاتہا العربیہ والقرآنیہ (عمان، دارعمارللنشر والتوزیع 1983 اوردیکھیں: طٰہٰ عبدالرحمٰن ،روح الحداثۃ ص ۲۲۷) اوریہ اس کے بالکل برعکس ہوگا جواپنا حال آخرت سے کٹ کرگزاررہا ہو،اس کی ساری تگ ودوساری فکرروزانہ کی ضروریات پوری کرنے اوراپنی خواہشات پوری کرنے ہی پر منحصر نہ ہو۔اوروہ محرکات اس سے کھوجائیں جواُس کواپنے آپ سے یا اشیاء سے معاملہ کرنے میں توازن سکھائیں جیسا کہ آج کل کی زندگی کا حال ہے (گارودی اپنی کتاب: قبروں کے اکھاڑنے والےص ۲۳۲، ۲۴۲ میں کہتے ہیں:
''زمین کی کشتی جس میں ہم سب سوار ہیں، نے اپنا توازن کھودیا ہے،آج جبکہ مغرب کےغلبہ پر پانچ صدیاں گزرچکی ہیں، یہ

کشتی ڈوبنے کے خطرہ سے دوچار ہے، اگر ہم برابراسی راستہ پر چلتے رہے کیونکہ زمین کے اس سے بدتر کسی نظم کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ زمین کی کشتی ایک اہم اصطلاح ہے جس میں حدیث نبوی کا امتداد ہے، (دیکھیں حدیث السفینۃ) موجودہ تہذیبی رواج میں اس اصطلاح کو جگہ ملنی چاہیے۔ کیونکہ اس میں ایک ذمہ دارانہ تعلق کی بوباس ہے، محض مطلق تعلق کی نہیں جو کسی بھی مزاج کا اوراس کے کیسے بھی نتائج ہوں اس سے بے پروائی کو بتاتا ہے)۔

(ب) حیات طیبہ کا حصول: بلاشبہ زمین کی ایمانی تعمیر جو با مقصد ہو آخر میں ایک سعادت افروز زندگی تک پہنچاتی ہے۔اور یہ زندگی اللہ اُس کو دیتا ہے جو اللہ کی ہدایت کے زیرسایہ زندگی بسر کرلے جیسا کہ فرمایا: **من عمل صالحامن ذکر او انثی**: جوشخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور آخرت میں ایسے لوگوں کو ان کے اجر بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے (النحل:97) سعادت افروز زندگی سے مراد یہ نہیں کہ ایسی سوسائٹی وجود میں آئے جو''صارفیت والی ہو'' یا ایسے معاشرے بنیں جہاں پروڈکشن بہت زیادہ ہو'' یا جو''ضرورت سے زیادہ پیدا کریں'' جیسا کہ مادی نقطہ نظر سے خیال کیا جاتا ہے۔نہیں بلکہ وہ اسلامی نقطہ نظر سے ایسی زندگی ہوتی ہے جس میں فرد خوشی، کمال اورشادمانی اپنی روزانہ کی زندگی میں ہمیشہ محسوس کرتا ہے، جس میں حیرت، قلق، سرگشتگی اور گمراہی نہیں ہوتی۔ یہ زندگی اس تہذیبی عمل کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے جو''علم نافع''، کمال عقل اورابدی سعادت اورفرد کی خواہشات پر لگام لگانے اوراس کے اصلاحِ احوال پراوراشیاء سے توازن کے ساتھ فائدہ اٹھانے اورزندگی کے حالات اورامور اور نتائج سے عبرت حاصل کرنے پر مبنی ہوتا ہے۔

امام ابن قیمؒ کہتے ہیں: پاکیزہ زندگی وہ زندگی ہے جس میں دل مطمئن اورمسرور ہو اور وہ ایمان، معرفتِ الٰہی، محبتِ الٰہی، اس کی طرف انابت اوراس پر توکل سے خوش بخت ہو۔اس زندگی سے اچھی اورسروروالی کوئی زندگی نہیں اوراس نعمت سے اوپر بس جنت کی نعمت ہے۔بعض عارفین سے منقول ہے کہ: میرے اوپر کچھ ایسے اوقات گزرتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ اگر جنت والوں پر یہ احوال گزرتے ہوں تو وہ یقیناً خوش بخت ہیں''۔ایک اور سے منقول ہے کہ:''قلب پر بعض احوال ایسے آتے ہیں جس

میں وہ خوشی سے رقصاں ہوتا ہے''۔اور جب دل کی زندگی اچھی ہوتی ہے تو جوارح کی زندگی بھی ایسی ہی ہوتی ہے کیونکہ دل ہی جوارح پر حاکم ہے۔اِس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر سے اعراض کرنے والوں کو ''تنگ حالی کی زندگی'' دی ہے جو کہ پاکیزہ زندگی کی الٹی ہے(مدارج السالکین، 3/259)۔

تو ''اچھی زندگی'' اس مفہوم میں ایمان باللہ، اور تحریکِ حیات میں منہاج الٰہی اور اس کے امر و نہی سے مربوط ہے، زمین کی ایمانی تعمیر کی ہی غرض و غایت ہے، کہ اسی میں اللہ سے اتصال، اس پر بھروسہ، اور اس کی خبر گیری، رضامندی اور پردہ پوشی سے اطمینان ہے۔ساتھ ہی ساتھ اس میں صحت، سکون، رضا، برکت گھروں کی آبادی اور دلوں کی مودت ہے۔یہ اِسی فضا بناتی ہے کہ ان میں عمل صالح سے خوشی ہوتی ہے، ضمیر پر اور زندگی پر اس کا مثبت اثر پڑتا ہے۔تو ایسے وقت میں جب معاصر سیاسی ترقی کے نظریات یہ چاہتے ہیں کہ ایسا معاشرہ پیدا ہو جس میں کنزیومرازم اور صارفیت بہت زیادہ ہو جائے۔یا رفاہی ریاست کا قیام ہو جائے یہی ترقی اور ڈیولپمنٹ کی معراج ہے۔عین اسی وقت اسلام اس کے متبادل کے طور پر پاکیزہ زندگی کا تصور دیتا ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں میں اور حصول جنت کے لیے اللہ تعالیٰ کی مکمل عبادت کا نتیجہ ہوتی ہے۔

**ثالثًا:** اخلاقی بُعد: اخلاقی زاویہ سے ہماری مراد وہ تمام قدریں، مقاصد، معیارات اور وسائل ہیں جو اس ایمانی آبادکاری کا احاطہ کرتے ہیں۔چنانچہ مسلمان جو تہذیبی جدوجہد کرے گا اور زندگی کو حرکت دے گا، اُس میں وہ زندگی کے معنوی فہم اور اخلاقی شعور کا پابند ہوگا۔اس کی تمام حرکات وسکنات کو یہی قدریں منضبط کریں گی، جو مقاصد وہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے جو طریقے وہ اختیار کرتا ہے، ان سب میں وہ انہی کے تابع ہوگا۔کیونکہ وہ آزاد پنچھی نہیں بلکہ محکوم ہے۔لہٰذا اس سلسلہ میں وحی کے کنٹرول کی ضرورت ہے، ورنہ راستہ اور منزل دونوں کھوٹے ہو جائیں گے۔!!

---

(۲) نظریات التنمیۃ السیاسیہ المعاصرہ ص286

اور حلال وحرام اور ان کے درمیان جو نفلی، استحسان وکراہیت کے مراتب ہیں یہ اسلام میں ان

قدروں اوراصولوں کی بہترین تجسیم ہیں جو تعمیرِ ارضی اورحرکتِ حیات میں مسلمان کی زندگی کومنضبط کرتے ہیں۔ کیونکہ اسلام میں حلال وحرام کی کہانی تمام انسانی سرگرمیوں اوررویوں کومحیط ہے۔ حاکم ومحکوم کا رویہ، خریدار وفروخت کرنے والے کا رویہ، اجیر ومستاجر کا معاملہ، کام کرنے والے اور بے کام کا رویہ اورانسان کا اشیاء اورزندگی کے تمام مظاہر کے ساتھ رویہ یعنی انسانی معاملات کی ہر اکائی یاتو حلال ہے یاحرام یعنی یاتو عدل پر مبنی ہے یا ظلم پر تو اگر اسلام میں کسی ایک معین سلوک سے منع کیا گیا ہے۔ چاہے وہ سلبی ہو یا ایجابی تو یہ سلوک حرام ہوگا ورنہ وہ حلال ہے (محمد باقر الصدر، اقتصادنا، (بیروت: دارالتعارف صفحہ 383)۔

تو مسلمان زندگی میں جوبھی کام کرے اس سے مطالبہ یہ ہے کہ وہ حقوق کی حفاظت کرے اوراخلاق کا لحاظ رکھے۔ اس عام اسلامی اصول کے مطابق کہ ''ہر مخلوق کے کچھ حقوق ہیں جو اس کے ساتھ خاص ہیں''۔ اوران کو خالق تعالیٰ نے واجب کیا ہے، جس نے اس کائنات کو اپنی تمام اشیاء کے ساتھ اس کے لیے مسخر کیا ہے۔ یہیں سے اخلاقی ضوابط اورحکمراں اصول اللہ کی نازل کردہ شریعت اور شرعی عبادت بن جاتے ہیں۔ جن کی اتباع انسانی داخلی محرک اورجذبۂ اندرونی سے کرنی چاہیے۔ جو کہ انسان کو اس بات پر ابھارے گا کہ وہ زندگی کو اللہ کے منہج کے مطابق چلائے، اس کے امرونہی کو نافذ کرے اوراس کے اصولوں وقدروں کو اپنائے اوراس سب سے اس کو اللہ کی رضا اوراس کا قرب مطلوب ہو۔

یہ ضوابط اورحکمراں قدریں مجمل طور پر اللہ کے اس قول میں بیان کردی گئی ہیں: وابتغ فیما آتاک: اوراللہ نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس سے آخرت کے طلب گار بنو، مگر دنیا سے اپنا حصہ لینا بھی مت بھولو اوراحسان کرو جیسا کہ اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے اورزمین میں فساد نہ چاہو، بلاشبہ اللہ فساد پھیلانے والوں کو پسند نہیں کرتا (القصص: 77) یہ چار ضابطے ہیں جو مسلمان کی ساری سرگرمیوں کو منضبط کرتے ہیں: آخرت طلبی، دنیا سے اپنا حصہ لینا اور ہر کام کو کامل انداز میں کرنا، زمین میں فساد برپا نہ کرنا۔ ان اصولوں اورقدروں کو دو خانوں میں بانٹ سکتے ہیں کیونکہ ان میں بعض تو وہ

ہیں جو عمومی طور پر زمین میں انسان کی سرگرمیوں کو فریم دیتی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو اشیاء کو دیکھنے اور ان کے ساتھ انسان کے تعامل کو ضابطہ بند کرتی ہیں۔

(الف) اخلاقی قدریں جو عمومی طور پر انسان کے کاموں کو ضابطہ بند کرتی ہیں، وہ قدریں ہیں جن کو ہر مسلمان وراثت میں اخذ کرتا ہے اور اس کی روح اور نفس ان سے سرشار ہوتا ہے۔اس کی کوشش اور زندگی کی حرکت کی تجدید وہی کرتی ہیں، وہ اپنی ساری تگ ودو میں ان کے تابع رہتا ہے۔ اوران سے رہنمائی حاصل کرتا ہے، ان کو ہم دو جامع قدروں میں اجمالا یوں بیان کر سکتے ہیں۔

پہلی: علم نافع کا حصول اوراسی بنیاد پر عمل صالح'' اسلام میں یہ تصور نہیں کہ کسی بھی طرح کا علم حاصل کیا جائے، اور کسی بھی طرح سے عمل کرلیا جائے، کہ آدمی ظاہری چیزوں پر ریجھ جائے اور اپنی رغبتوں وخواہشوں کو پورا کرنے لگے بلکہ علم میں نفع بخش کی اور عمل میں صالح کی قیدلگانی ضروری ہے۔اسی سے رزق طیب ملے گا اور عمل مقبول ہوگا جیسا کہ حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب صبح کی نماز پڑھتے تو سلام پھیرتے وقت یہ دعا پڑھتے اللہم انی اسئلک علما نافعا، ورزقا طیبا وعملا متقبلا: اے اللہ میں تجھ سے علم نافع ،رزق طیب اور مقبول عمل کا سوال کرتا ہوں (سنن ابن ماجہ: 1/298 حدیث نمبر 925)۔

اس کے علاوہ قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں جس میں ایمان کو عمل صالح سے مربوط نہ کیا گیا ہو: فرمایا: اور جو ایمان لائے اورانہوں نے عمل صالح کیے وہی جنتی ہیں جو اس میں ہمیشہ رہیں گے (البقرۃ:82)۔

**علم نافع:** وہ ہے جو عمل صالح پر ابھارے، امرونہی میں اللہ کے منہج کے مطابق ہو، تو مسلمان علم کو برائے علم حاصل نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لیے حاصل کرتا ہے۔ وہ ظاہر اشیاء کے علم پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اشیاء کے باطن اور نتائج کو جانتا ہے اوراس کے ذریعہ ہی اپنی خواہشات کی تکمیل اوراصلاح احوال کی کوشش کرتا ہے ،جیسا کہ امام شاطبی کہتے ہیں: یہ علم وہ ہے جو عمل پر ابھارتا ہے اور آدمی کو خواہشات کے ساتھ دوڑنے نہیں دیتا، بلکہ اس کو اس کے تقاضے کے مطابق پابند

بنادیتاہے اور وہ طوعاوکرہااس کے قوانین پر عمل کراتا ہے (الموافقات 1/69) یعنی اس علم سے وجود کی حفاظت ہوتی ہے، اور زندگی کی صلاحیت، فعالیت اور تسلسل کی حفاظت ہوتی ہے۔اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ تہذیبی بے کاری کے علاوہ اور کیا ہے؟ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: رہے جھاگ تو وہ بے کار چلے جاتے ہیں اور جہاں تک نفع بخش چیز کی بات ہے تو اسی کو زمین میں بقاء ملتی ہے (الرعد:17)۔

عمل صالح وہ ہے جو حال میں انسانوں کے احوال درست کرے اور انجام کار ان کو کامیابی سے ہم کنار کرے۔اپنے تمام تکوینات اور رشتوں میں وہ انسان کے تمدن کو آگے بڑھانے اور تمام تہذیبی میدانوں میں زندگی کو ترقی دینے کا نشانہ رکھتا ہے۔یہ کئی چیزوں کے ذریعہ ہوگا (ملاحظہ ہو،طٰہٰ عبدالرحمٰن سؤال الاخلاق صفحہ 86 انہی کی کتاب روح الحداثۃ صفحہ 93 بھی ملاحظہ کریں) مثلاً کسی بھی کام کو کرنے سے پہلے اُس کے انجام پر غور کرنے سے: یعنی مقاصد پر نظر رکھنے سے اور اس کو دھیان میں رکھنے سے کہ اس کام سے مقاصد کہاں تک پورے ہوسکتے ہیں۔چنانچہ اگر اُس سے مقاصدِ شریعت حاصل ہوتے ہیں تو اُس پر عمل کیا جائے گا اور مقاصد کی مخالفت ہوتی ہو تو اُس پر عمل نہیں ہوگا۔کیونکہ ''مکلّف سے شریعت کو یہی مطلوب ہے کہ اس کا عمل شریعت کے موافق ہی ہو۔اپنے کاموں میں وہ اسی کے مدّنظر آگے بڑھے اور شارع کے خلاف نہ جائے (الموافقات،332-2/331)۔

کسی بھی کام کو کرنے سے پہلے اُس کے نتیجہ پر غور کرنے سے: کیونکہ شریعت میں مصالح کی تحصیل اور مفاسد کو دور کرنے کے لیے نتائج کو دیکھنا ضروری ہے (مرجع سابق 4/233) یعنی یہ دیکھنا کہ مستقبل میں اس کا کیا اثر مرتب ہوگا،تو اگر وہ مرتب ہونے والا اثر اچھا ہوگا تو اس کو کیا جائے گا اور اگر وہ اچھا نہیں ہوگا مثال کے طور پر کسی مفسدہٗ ظاہر تک پہنچائے یا اُس سے کسی مقصد شرعی کی مخالفت ہوتی ہو تو وہ سب کے اتفاق سے باطل ومردود ہوگا۔یہاں تک کہ اگر وہ بظاہر اور فی الحال فائدہ بھی محسوس ہوتا ہو۔کیونکہ ظاہر پوری حقیقت کی تعبیر نہیں ہوتا۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر آپ زمین کے اکثر لوگوں کی بات ماننے لگیں تو وہ آپ کو راستہ سے گمراہ کردیں، یہ تو بس وہم وگمان کی پیروی کرتے ہیں (الانعام:116) اور فرمایا: یہ لوگ دنیاوی زندگی کے ظاہر پر عمل کرتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں

(الروم:7) پھر اسلامی نظریہ اور اسلامی اصولوں کے مطابق کام کا درست ہونا بس اس بات پر منحصر نہیں کہ وہ دنیا میں کتنا فائدہ دیتا ہے بلکہ دنیا اور آخرت دونوں میں فائدہ پر منحصر ہے۔ اور اسی وجہ سے ظاہری اور دنیاوی نتائج کے اعتبار سے کسی کام کو اچھا نہیں کہہ سکتے ہیں جب تک اس کے اخروی نتائج کا پتہ نہ چلے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان کا ہر عمل چاہے معاشی ہی کیوں نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ اور اسی سے خلافت کا مطلب نکلتا ہے اسی وجہ سے امام قرافی کہتے ہیں: جو کچھ بھی حقِ عبد ہے اس میں بھی حق اللہ پایا جاتا ہے'' (الفروق وہوامشہ 1/256)۔

اور امام شاطبی نے بھی اس پر زور دیا ہے کہ بندے کے تمام کاموں میں اللہ کے احکام کی اطاعت کا جذبہ ہونا چاہیے، کیونکہ ''مکلّف سے مجموعی طور پر اعمال پر عمل تعبدی طور پر مطلوب ہے'' (الموافقات، 2/317)۔

چنانچہ افعال کے مصالح ومفاسد کا علم اور ان کا وزن اس حیثیت سے ہوگا کہ دنیا آخرت کے لیے برپا کی گئی ہے۔ نفس کی خواہشات اور آدمی کی اپنی مرضی سے نہیں ہوگا۔ علم نافع کے حصول کے وجوب عمل صالح اور زمین میں تہذیبی جدوجہد کے مابین جو تعلق ہے اس کو ابن القیم نے فقہ اسلامی میں واجب اور واقع کے مابین تعامل کو بیان کرتے ہوئے ایک دقیق عبارت میں بیان کیا ہے۔ اور بتایا کہ دونوں کا ساتھ ساتھ ہونا ضروری ہے یعنی علم نافع ہو اور عمل صالح، چنانچہ لکھا ہے:

''تو یہاں فقہ کی دو قسمیں ہیں جو دونوں ہی حاکم کے لیے ضروری ہیں۔ ایک فقہ ہے حوادثِ کلیہ کے احکام کی اور دوسری ہے نفس الواقع اور لوگوں کے احوال کی فقہ۔ جس میں جھوٹ، سچ، باطل اور حق کی تمیز ہوگی پھر دونوں کے درمیان مطابقت دی جائے گی۔ چنانچہ جو ہے اُسے اس کا واجبی حکم دیا جائے گا۔ اور پھر دونوں کے درمیان مطابقت دی جائے گی۔ ایسا نہ ہوگا کہ واجب کو موجود کے مخالف کردیں ورنہ واجب اور موجود دونوں ضائع ہوجائیں گے، کہ واجب چھوٹ جائے گا اور موجود اجنبی ہوکر رہ جائے گا (ابن القیم: الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ صفحہ ۵) اس سے واضح ہوتا ہے کہ علم نافع اور عمل صالح کے اصول کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہم سائنسی وتکنیکی اشیاء وایجادات کی طرف سرپٹ نہ

دوڑیں بلکہ یہ بھی لازمی ہے کہ ہم خود سائنسی تحقیق کے معنی ومفہوم پر بھی نظر ثانی کریں اوراس کوموجودہ ضرورتوں کا خادم بنائیں ایسا نہ کریں کہ خود سے نئی نئی ضرورتیں ایجاد کریں۔پھران کومقاصد ونتائج کے تابع بنائیں ،اسباب واحوال کی منطق کا تابع نہ بنائیں ۔کہ ہر جدید سائنسی چیز نفع بخش ہے اور نہ ہر ریسرچ جائز ہے۔

یہ نظر ثانی اشیاء میں اسباب کی تبعیت ثابت کرنے کے اندر بھی ہونی چاہیے جوان کے پیچھے حکمتوں کے تابع ہیں۔اوران نتائج کے تابع ہونی چاہیے جو ان سے نکلتے ہیں۔اور جب حکمتوں اور نتیجوں کی تبعیت متعین ہوجائے گی تواس وقت یہ ممکن ہوسکے گا کہ چیزوں کے مشینی اجراء کے بجائے ان کے مقصد پرنظر ہو(روح الحداثہ صفحہ 98-94)یعنی زندگی کی تعمیر اسلامی نقطہ نظر سے ایک ایسا عمل ہے جو اپنے آپ میں مقصود ہے اورجس کا رخ فائدہ پہنچانااور بھلا چاہنا ہے۔اسی لیے زندگی کو ان میدانوں میں لے جانا صحیح نہ ہوگا جوتمدن کے مقصد اصلی کے خلاف ہوں۔چنانچہ سرکشی ،فساد تخریب اورخلل جیسے عناصر سے زندگی کی تعمیر خالی ہوگی ۔اس کے علاوہ ان جیسے دیگرعواملِ فساد سے بھی جو اصول تمدن کوتوڑتے ہیں گرچہ وہ تیکنیکی ترقی اورسائنٹیفک ریسرچ کے بلند بانگ دعوی کے ساتھ ہی کیوں نہ سامنے آتے ہوں!!

دوسرااصول ہےاللہ تعالیٰ سے فضل چاہنا: کیونکہ مسلمان اپنی تہذیبی جدوجہد میں اس بناء پر سرگرم نہیں ہوتا کہ بازارعمل میں بلاکسی قید کے کام ،مسابقت بلاشرط ہےاور بے انتہا نفع اندوزی کے مواقع موجود ہیں۔اورمغربی نظریہ کے مطابق مادی مصلحت اصل ہے،نہیں ، بلکہ اُس کی حرکتِ حیات کی سعی اس بات سے مشروط ہے کہ اللہ سے فضل چاہا جائے ،جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب نماز ختم ہوجائے توزمین میں پھیل جاؤاوراللہ کا فضل تلاش کرو،اورزیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکرکروتا کہ تم کامیاب ہوجاؤ (الجمعۃ :10) اورفرمایا: وہی ہےجس نے سمندرکومسخر کیا تا کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤاوراس سے موتی نکال کرزیور بنا کر پہنو،اس میں تم کشتیوں کو چلتا ہوا دیکھوگے،اس لیے کہ تم اللہ کا فضل تلاش کرواورتا کہ تم شکرگزار بنو(النحل:14)۔

تو آیت مذکور کے مطابق 'فضل' تعمیر ارضی کی مطلق سعی نہیں جو اخلاقی پہلو سے خالی ہو، بلکہ یہ وہ کوشش ہے جو خیر واحسان سے مشروط ہو (ملاحظہ ہو: ابن فارس، معجم مقاییس اللغۃ 4/508) پھر وہ اللہ کا فضل ہے اور اس بات کی تنبیہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی مالک حقیقی ہے۔ لہٰذا انسان کی کوششوں میں بغاوت وسرکشی کا دخل نہ ہو، اور اپنی کوششوں میں انسان وہی کام کرے جو اس کو ربِ تعالیٰ سے قریب کر دے، جو اس پر اپنا فضل فرما رہا ہے۔ اور اس نے انسان کی جدوجہد کے لیے دو چیزوں کی ضمانت لی ہے۔ پہلی: توفیقِ الٰہی یعنی نفع بخش چیز کی طرف رہنمائی۔ اس سے یہ ہوگا کہ انسان کی کوششیں مقاصدِ شریعت کے مطابق ان کی رہنمائی میں ہوں، اور شرع سے مخالفت یا پہلوتہی نہ برتیں گی۔ دوسری: الٰہی مدد و تائید: اس تائید ربانی سے ہی اس کا پروڈکشن ہمیشہ رہے گا اور بڑھتا رہے گا۔ مادی ومعنوی دونوں لحاظ سے اس کا نفع زیادہ ہوگا۔ اس کی کوششوں میں زمان ومکان کے پھیلاؤ کے اعتبار سے برکت ہوگی۔ ان ساری صفتوں کے ساتھ حرکتِ حیات اور تعمیر ارضی کی بندے کی کوششیں عبادت شمار ہوں گی جیسا کہ روایات میں آتا ہے (جیسا کہ الموافقات 2/317 میں آیا ہے۔ اور دیکھیں الامام الزیلعی حنفی تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق (القاہرہ: دار الکتاب الاسلامی 1313ھ 4/226) یوں اس کی کوشش نتیجہ خیز، تیز اور تائید کردہ ہوگی۔

تو اس حالت میں "تجارت محض اشیاء کے تبادلہ کا نام نہ ہوگا جیسا کہ مارکیٹ میں مادی صارفیت کا حال ہے بلکہ وہ ان احسانات ونعمتوں کا تبادلہ ہوگا جو صارفین کو روحانی آفاق تک اٹھادیں، اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ اصول "فضل چاہنا" میں اقتصادی ترقی کے عمل کو بھی اخلاقی وروحانی قدروں کا حامل بنا دینا ہے کہ اس کے بغیر اقتصادی ترقی مفید مطلب اور تزکیہ کرنے والی نہ ہوگی اور اگر اخلاقی وروحانی مقصد کے برخلاف ہو تو اُس ترقی کو چھوڑ کر دوسرا ترقیاتی پروگرام اپنانا ہوگا، کیونکہ ترقی بذاتِ خود مطلوب نہیں بلکہ مزید اخلاقیت کا وسیلہ ہے (روح الحداثۃ صفحہ 92) البتہ تعمیرِ حیات کے سلسلہ میں یہ "فضل چاہنا" کئی امور کا متقاضی ہے جن کو اسلامی فقہ کے اندر "کمانے کے آداب" کہا جاتا ہے (اس سلسلہ میں دیکھیں: امام غزالی، احیاء علوم الدین، ربع العادات، کتاب، الکسب والمعیشۃ

،امام ابوطالب مکی ،قوت القلوب الفصل السابع والاربعون ،ذکر حکم المتسبب للمعاش وما یجب علی التاجر من شروط العلم ، یاد رہے کہ سلف صالح لوگوں کو یہ آداب سکھانے کے بہت زیادہ حریص تھے ،احیاء علوم الدین 2/64 ) وہ کسی بھی فعال جدوجہد کے لیے اساسی فوائد ہیں جن کا مقصد ظلم ،اجارہ داری ،حسابات میں ہیر پھیر ،کارخانوں کی دھوکہ دھڑی اور پروڈکشن کو جھوٹے پروپیگنڈے سے بیچنا ،ناپ تول میں کمی ،قیمتوں کے کھلواڑ ،غبن اور فساد کے دوسرے تمام ذرائع کو روکنا ہے (الشیخ عبدالسلام یاسین ،فی الاقتصاد الاسلامی ،البواعث الایمانیۃ والضوابط الشرعیۃ ص90)۔

ان آداب میں سب سے پہلے اور سب سے نمایاں ہے:

**ا۔طلب حلال:** کہ مسلمان اپنی حرکتِ حیات اور زندگی کی تمام تگ ودو میں حلال کی تلاش کرتا ہے ،کیونکہ حلال روزی بندہ کو اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب کرنے والی ہے۔جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ طیب ہے اور صرف طیب ہی کو قبول کرتا ہے۔اور اُس نے مومنین کو اسی چیز کا حکم دیا ہے جس کا حکم اس نے نبیوں کو دیا تھا اور فرمایا: یاایھا الرسل : اے پیغمبرو، کھاؤ پاک چیزیں اور عمل کرو صالح ،تم جو کچھ بھی کرتے ہو میں اس کو خوب جانتا ہوں (مومنون:51) **یاایھا الذین آمنوا کلوا من الطیبات**: اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انہیں بے تکلف کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو، اگر تم حقیقت میں اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو (البقرۃ:172) اس کے بعد آپؐ نے ایسے شخص کا تذکرہ فرمایا جو دور دراز کا سفر کرتا ہے، پریشان حال اور گرد وغبار سے اٹا ہوا، وہ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا ہے اور کہتا ہے اے میرے رب اے میرے رب! حالانکہ اس کا کھانا حرام، اس کا پینا حرام اور اس کا پہننا حرام۔وہ حرام کھا کھا کر پلا بڑھا تو اُس کی دعا کیسے قبول ہوگی؟ (صحیح مسلم کتاب الزکوۃ، باب قبول الصدقۃ من الکسب الطیب وتربیتھا، حدیث نمبر:1015) اور ہمارے علماء نے تصریح کی ہے کہ جس نے حرام کھایا اُس نے گویا اپنے آپ کو بھی قتل کیا اور اپنے بھائی کو بھی کہ اس کو بھی حرام کھلایا، اور یہ مومنین کا طریقہ نہیں ہے۔کیونکہ سچا دل جو اللہ کی طرف متوجہ ہو، اس کے امر ونہی کو تھامے ہوئے ہو وہ حلال طیب ہی کمائے گا، اُس کے اور حرام مال کے درمیان کوئی رشتہ نہ

ہوگا۔ ذرا ایسے مسلم معاشرہ کا تصور کیجئے جہاں مال کمانے، سرمایہ کاری کرنے اور مال لگانے کا سارا عمل اسی صالح اساس پر قائم ہو اور جہاں ثروت مند شبہات اور فساد کے چور دروازوں سے بھی بچتے ہوں اور کسب طیب پر ان کی حرکتِ مال کی بنیاد ہو وہ کیا ہی اچھا معاشرہ ہوگا!!! اسی وجہ سے نبی ﷺ نے طلبِ حلال میں تساہل کو آخری زمانہ کی نشانی قرار دیا ہے چنانچہ فرمایا: لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ آدمی یہ پروانہ کرے گا کہ جو لیا ہے وہ حلال طریقہ سے لیا ہے یا حرام طریقہ سے (صحیح البخاری کتاب البیوع، باب من لم یبال من حیث کسب المال حدیث نمبر: 1954)۔

**۲۔ اچھی طرح کوشش کرنا:** اس کے لیے صنعت میں مہارت، بہتری، تسلسل اور انتہائی درجہ تک اچھا اور مضبوط کام کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔ اس چیز کی اپنے آپ میں بڑی اہمیت ہے۔ اس معنی میں کہ اس تمدنی وفنی مہارت کو یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ دین کا مطالبہ نہیں ہے، کہ اس کی منفعت ظاہری اور وقتی ہے۔ نہیں، بلکہ یہ امر الٰہی کے تقاضوں میں شامل ہے۔ اس لیے کہ بندہ سے قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے کام کو حسن وخوبی کرنے سے متعلق جواب دہ ہوگا، جیسا کہ اللہ کے نبیؐ نے فرمایا کہ اللہ نے ہر چیز کو خوبی کے ساتھ کرنا لازم کر دیا ہے (اس کی تخریج گزر چکی ہے) اور فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ جب تم میں سے کوئی آدمی کوئی کام کرے تو اسے اعلی درجہ پر کرے (اس کی تخریج بیہقی نے شعب الایمان میں کی ہے، حدیث نمبر 53112 اور معجم الاوسط میں بھی آئی ہے۔ 1/275 حدیث نمبر: ۸۹۷۳) امام مناوی نے یتقنہ کا معنی بتایا ہے: ای یحکمہ یعنی اس کام کو بہتر طریقہ پر کرے۔ جیسا کہ دوسری روایت میں خود اس کی تصریح آئی ہے۔ اس لیے کہ اللہ کی نصرت ومدد کام کرنے والے پر اس کے کام کے اعتبار سے آتی ہے۔

تو جس کا کام بھی زیادہ بہتر اور زیادہ کامل ہوگا، اس کی نیکیاں زیادہ بڑھیں گے اور جس کی نیکیاں زیادہ ہوں گی، اُس سے اللہ تعالیٰ محبت کرے گا (التیسیر بشرح الجامع الصغیر 1/269) ایک جگہ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ: ''اس کاریگر پر جس کو اللہ تعالیٰ نے تصویریں، آلات اور ساز وسامان تیار کرنے پر لگایا ہے، لازم ہے کہ ہر کام بہتر طریقہ اور خوب تر طریقہ پر کرے، اور مخلوق خدا کو فائدہ

پہنچانے کی نیت رکھے جس نے اس کو کام پر لگایا۔ یہ نیت نہ رکھے کہ اگر وہ نہ کرے گا تو وہ ہوگا ہی نہیں یا جتنی اجرت مل رہی ہے بس اسی کے بقدر کرے گا۔نہیں، بلکہ کام کی مہارت کا جو تقاضا ہوا ُسے پورا کرے۔ کیونکہ اجرت کی کمی کی وجہ سے اگر کام کرنے والے نے اپنے کام میں کمی کر دی تو گویا اُس نے اللہ نے جو ہنر سکھایا اس کی ناقدری کی۔اس سے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی مہارت چھین لی جائے (فیض القدیر 287-2/286) حدیث کے مضمون میں زبردست تہذیبی سبق یہ ہے کہ کام کی بہتری اور اعلی درجہ پر کرنا خود خدائی تقاضا بھی ہے۔اس میں وقتی فائدہ سے اوپر اٹھ کر دیکھنا چاہیے۔عاصم بن کلیب الجرمی کہتے ہیں:

میرے والد نے بیان کیا کہ وہ اپنے والد کے ساتھ ایک جنازہ میں گئے جس میں رسول اللہ ﷺ بھی تھے،اور میں اس وقت بچہ تھا مگر سمجھ بوجھ نہ رکھتا تھا۔تو جنازہ کو قبر پر لایا گیا اور اچھی طرح نہیں اتارا گیا تو اللہ کے رسول نے فرمایا:اس کی لحد کو برابر کرو اس کی لحد کو برابر کرو،لوگوں نے سمجھا کہ لحد برابر کرنا سنت ہے،تو آپؐ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:لحد کو برابر کرنے سے نہ تو میت کو فائدہ ہوگا نہ نقصان۔مگر بات یہ ہے کہ اللہ کو یہ پسند ہے کہ کام کرنے والا کوئی بھی کام کرے تو اچھی طرح کرے'' (اس کی تخریج بیہقی نے شعب الایمان میں کی ہے،4/325 حدیث نمبر:1553 اسی کی مثل طبرانی نے معجم کبیر میں روایت کی ہے 199/19) کیونکہ اچھا اور بہتر کام ہی اس زندگی کو برپا کرسکتا ہے جو خالقِ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ یہ اعلی درجہ کا کام وہ دینی تفقہ ہے جس پر امت کی تربیت کی جانی چاہیے۔

**۳۔فیاضی اور صدقہ:** لہٰذا مسلمان کو اپنی تہذیبی جدوجہد اور تعمیرِ ارض کے کام میں دریادل ،سخی اور زیادہ سے زیادہ صدقہ کرنے والا ہونا چاہیے۔اس سے مُنعم تعالیٰ کا شکرادا ہوگا اور اس کے بندوں کے ساتھ رحمت کا معاملہ۔ساتھ ہی مومن کو بیدار مغز اور اپنے رب تعالی کی نعمتوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں شعور و بصیرت سے کام لینا چاہیے۔اس سے ان نعمتوں میں زیادتی ہوگی ان کا حسن بڑھے گا اور ان کی عطاء میں اضافہ ہوگا۔کارگاہ حیات میں یہ نہایت سنہری اصول ہے اور عمدہ رہنمائی ہے چنانچہ نبی ﷺ نے فرمایا: یہ مال شاداب اور میٹھا ہے۔پس مسلمان کا وہ ساتھی (مال) کیا ہی

اچھاہے جس میں سے وہ مسکین ،یتیم اور مسافر کو دیتا ہے۔اور فرمایا: جوشخص مال کو بغیر حق کے لیتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو کھاتا ہے مگر سیر نہیں ہوتا،اور قیامت میں وہ مال اس کے خلاف گواہی دے گا (متفق علیہ،الفاظ بخاری کے ہیں،صحیح البخاری، کتاب الزکوۃ باب الصدقہ علی الیتامی ۱۲ / ۲۲۵ حدیث نمبر 1396 مسلم کتاب الزکوۃ باب خوف مایخرج من زہرۃ الدنیا 2/728 حدیث نمبر 1052) اس سے پہلے والی حدیث میں مدح کا یہ جملہ کیا بڑا ہی معنی خیز ہے کہ: مسلمان کا وہ ساتھی (مال) کیا ہی اچھا ہے جس میں سے وہ مسکین ،یتیم اور مسافر کو دیتا ہے۔'' ظاہر ہے کہ اس کا الٹا یہ ہوگا کہ مسلمان کا وہ ساتھی (مال) کتنا برا ہے جس میں سے وہ مسکین ،یتیم اور مسافر کو نہیں دیتا۔یعنی مال گویا ایک دودھاری ہتھیار ہے،'' شیخ ابوحامد نے کہا: مال کی مثال اُس سانپ کی سی ہے جس میں فائدہ مند تریاق بھی ہے اور مہلک زہر بھی۔ اگر وہ کسی جانکار کے ہاتھ لگتا ہے جس کو یہ معلوم ہے کہ اس کے زہر سے کیسے بچا جائے اور اس کا تریاق کیسے نکالیں تو وہ اس کے لیے نعمت ہوگا اور اگر عام آدمی کو مل جائے جو بےوقوف ہے تو وہ اس کے لیے مہلک بلا بن جائے گا (عمدۃ القاری 9/41) اور ہمارے آج کے زمانہ میں زیادہ تر لوگ غبی اور عامی ہی ہیں۔'' جہاں یہ حدیث ہمیں سخاوت سکھاتی ہے تو اس کی تکمیلی حدیث بھی ہے جو ہمیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ لینے میں آدمی کس طرح دریادل بنے۔چنانچہ حکیم بن حزام سے روایت ہے۔وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے مال مانگا،آپ نے دیدیا، میں نے پھر مانگا آپ نے پھر دے دیا پھر فرمایا: اے حکیم یہ مال ہرا بھرا اور میٹھا ہے جو اِسے سخاوتِ نفس کے ساتھ لے گا اسے اس میں برکت دی جائے گی اور جو اس کو بڑا بول بولتے ہوئے لے گا تو اس کو برکت نہیں دی جائے گی۔اور وہ اس کی طرح ہوگا جو کھاتا ہے مگر سیر نہیں ہوتا،اونچا ہاتھ (دینے والا) نیچے ہاتھ (لینے والا) سے بہتر ہوتا ہے (بخاری کتاب الزکاۃ باب الاستعفاف فی المسئلہ 3/534 حدیث نمبر:1403) گویا کہ اس ارشاد نبوی مبارک میں ''سخاوت'' مال کے ساتھ ساتھ ہے۔دینے والے اور لینے والے دونوں کو بڑے دل کا ہونا چاہیے۔ جب ہم مال کو لینے اور دینے دونوں میں سخاوت برتیں گے یعنی مزید کی حاجت اور حرص نہ کریں گے تو وہ کتنا اچھا ساتھی ہوگا اور برکت کی جگہ ہوگی یہی معنی ہے 'بورک لہ فیہ' کا۔ ہمارے علماء نے کہا ہے کہ برکت اللہ کی مخلوقات

میں سے ایک مخلوق ہے (فتح الباری، 3/32، عمدۃ القاری 9/53) یعنی ایک حقیقت ہے جس میں ایک درہم ایک دینار کا کام کرتا ہے، اور بے برکتی کے حال میں ایک دینار بھی درہم کا کام نہیں کرتا۔

کلام نبوی میں برکت کو سخاوت سے جوڑا گیا ہے۔ مال میں سخاوت یوں آتی ہے کہ آدمی کا نفس سخی ہوتا ہے وہ زیادہ کی طرف نہ دیکھے اور اس کو اپنے دل میں جگہ نہ دے چنانچہ یہ ضروری ہے کہ امت کی کوششیں اور زندگی کی بھاگ دوڑ میں اور معاملات میں بلند نفسی اور معالیٔ اخلاق کو کام میں لایا جائے، جب آدمی جھگڑا چھوڑ دے، لوگوں سے چمٹ کر نہ مانگے اور ان سے عفو درگزر سے کام لے (فتح الباری 4/307)۔

یہ مقصد جیسا کہ علامہ طاہر بن عاشور کہتے ہیں کہ بڑے تشریعی مقاصد میں سے ہے۔ (التحریر والتنویر 3/45) اور اس میں اصابت رائے اور درستگی کے اعتبار سے قوموں کے عروج وزوال کا پتہ چلتا ہے۔ جب دونوں معاملے برابر ہوجائیں، یعنی ثروت کے ساتھ بہتر معاملہ کیا جائے جس سے نفع حاصل ہو اور نقصان کا ازالہ ہو۔ ساتھ ہی ''نفسیاتی احساسات پر کنٹرول'' ہو ان کو سرکش نہ ہونے دیا جائے۔ تاکہ اس کو دنیا کی چمک دمک خیرہ نہ کردے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ ثروت بڑھے گی اور ترقی کرے گی اور نفع بخش ہوگی اور اس ثروت کا استعمال یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے ساتھ نیکی کرنے میں ہوگا۔ اس لیے اسلام نے ہر اُس سعی و کوشش کو حرام کر دیا ہے جو ایک انسان کے دوسرے کے استحصال پر مبنی ہو۔ چنانچہ اس نے سود کو حرام کر دیا، اللہ کے رسول نے فرمایا: جب کسی بستی میں زنا اور ربا ظاہر ہوجائیں تو وہ اپنے لیے اللہ کے عذاب کو حلال کر لیتے ہیں (اس کی تخریج طبرانی نے معجم کبیر میں کی ہے 1/178 اور حاکم نے مستدرک میں کی ہے 2/43) امام مناوی اس کی تشریح میں کہتے ہیں: یعنی اللہ کے عذاب کے آنے کا سبب بن جاتے ہیں، صرف عذاب نہیں کہا بلکہ اللہ کا عذاب کہا جس سے خطرناکی اور ہولناکی میں اضافہ ہو، کیونکہ حکمتِ الٰہی جو نسبوں کو محفوظ کرنے اور پانیوں کو خلط ملط ہونے سے روکنا چاہتی ہے، اور نقد اور کھانے وغیرہ میں تمام برابر ہیں، کسی کے ساتھ خاص نہیں سوائے کسی عادلانہ معاملہ کے، اس حکمت کی مخالفت کرنے سے یہ عذاب ہوگا (التیسیر بشرح الجامع الصغیر 1/114)۔

☆اور اُس نے خرید وفروخت اور صنائع میں دھوکہ دھڑی کو حرام قرار دیا ہے۔ ہمارے علماء کہتے ہیں کہ جو زیادہ دھوکہ دے گا وہ فاسق ہو جاتا ہے کیونکہ اللہ کے رسول نے فرمایا: جو ہمیں دھوکہ دیتا ہے وہ ہم میں سے نہیں (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب قول النبیؐ من غشنا فلیس منا 1/99 حدیث نمبر 101) اور فرمایا: جس نے عیب دار مال بیچا اور اس عیب کو ظاہر نہیں کیا تو وہ اللہ کی ناراضگی میں رہتا ہے اور ملائکہ اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں (اس کی تخریج ابن ماجہ نے کی ہے 2/755 حدیث نمبر 2246) تو ہمارا زمین کو ایمانی طور پر آباد کرنا اُس میں دھوکہ جائز نہیں اور نہ جھوٹ جو آدمی کے اندر غلط شعور اور ان چیزوں کی طرف میلان پیدا کر دیتا ہے جن کی واقعی حاجت نہیں ہوتی اور جن سے کوئی فائدہ نہیں ملتا۔ لہٰذا غلط پروپیگنڈے کی کوئی جگہ نہیں۔ ابوطالب مکی کہتے ہیں: ''بیچنے والے کو اپنے سامان کی تعریف اور غلط طریقہ پر اُسے رائج کرنے سے بچنا چاہیے۔ اور خریدار کو اس سے بچنا چاہیے کہ جو عیب اورخرابی اس میں نہیں ہے دھوکہ دینے کے لیے وہ اس میں وہ عیب نکالے۔ اور اُس پر قسمیں کھانا تو معصیت اور کمائی کو ضائع کر دینے والی چیز ہے۔ سلف اس بارے میں بہت سختی سے کام لیتے تھے، ابوذرؓ کہتے ہیں: ہم باہم یہ بیان کیا کرتے تھے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نہیں دیکھے گا ان میں فاجر تاجر ہے اور ہم سامان کی جھوٹی تعریف کو فسق سمجھا کرتے تھے (قوت القلوب 2/228)۔

☆اسی طرح اس نے ذخیرہ اندوزی کو حرام کیا۔ جس کا معنی ہے کہ مارکیٹ میں مال نہ رہے اور آپشن کا دائرہ سکڑ جائے، سوسائٹی سرمایہ کی قوت کے تابع اور اس کے احکام کی پابند ہو کر رہ جائے۔ چنانچہ اسلام نے لوگوں کی ضرورتیں پوری ہونے سے روکنے کو اللہ کے راستہ سے روکنا قرار دیا ہے۔ اور حفظ النفس، حفظ عقل اور اس سے جڑی چیزوں اور مال اور اس کے متعلقات کی حفاظت کے منافی قرار دیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ سب مقاصد شریعت میں سے ہیں۔ اسی طرح ذخیرہ اندوزی کو مقاصد شریعت کی خلاف ورزی قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: اجارہ داری کرنے والا مجرم ہوتا ہے (صحیح مسلم کتاب المساقاۃ، باب تحریم الاحتکار فی الاقوات 3/1228 حدیث نمبر 1606) الیسع بن مغیرہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ

بازار میں ایک آدمی کے پاس سے گزرے جو بازار کی قیمت سے کم داموں میں مال بیچ رہا تھا۔آپ نے پوچھا تم ہمارے بازار میں ہمارے داموں سے بھی کم میں بیچ رہے ہو؟ کہا جی ہاں، پوچھا صبر اور ثواب کی نیت سے؟ کہا جی ہاں، آپ نے فرمایا: خوش خبری ہو ہمارے بازار میں مال لانے والا مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح ہے اور ہمارے بازار میں ذخیرہ اندوزی کرنے والا اللہ کی کتاب کی نافرمانی کرنے والا ہے (حاکم نے مستدرک میں اس کی تخریج کی ہے 2/15 حدیث نمبر: 2/67)۔

☆اسی طرح اُس نے یہ حرام قرار دیا ہے کہ لوگوں کو چیزیں کم دی جائیں جیسا کہ فرمایا: فاوفوا الکیل والمیزان: پس تم ناپ اور تول پوری کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے مت دو اور روئے زمین میں اس کے بعد کہ اس کی درستگی کردی گئی ہے فساد مت پھیلاؤ (الاعراف: ۵۸) قاضی ابوبکر بن العربی کہتے ہیں: بخس عربوں کی زبان میں عیب و نقص نکالنا، کم بتانا یا قیمت کے بارے میں دھوکہ دینے کو کہتے ہیں۔ یا ناپ تول میں کمی زیادتی کا جگاڑ کرنے کو کہتے ہیں (احکام القرآن 2/318) تو بخس بات سے بھی ہوتا ہے کہ مال میں کمی نکال دی اس کے نقص کی بات مشہور کردی، اور عمل سے بھی ہوتا ہے اور یہ دونوں ہی باطل کے ذریعہ لوگوں کا مال کھانا ہے۔

**۴۔قصد واعتدال:** یہ وہ چھاپ ہے جس سے اسلام دنیوی زندگی کی طیبات سے لطف اندوز ہونے کی ہر کوشش کو منضبط کرتا ہے ۔ یہ وہ معیار ہے جس سے تمام سرگرمیوں کی اصلاح ہوتی ہے۔اور یہ وہ فقہِ عمرانی ہے جس میں اسلامی تہذیب رخ پاتی ہے۔فرمایا: **یا ایھا الذین آمنوا لاتحرموا طیبات:** اے ایمان والو! اللہ تعالی نے جو پاکیزہ چیزیں تمہارے واسطے حلال کی ہیں ان کو حرام مت کرو اور حد سے آگے مت نکلو، بے شک اللہ تعالی حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتا (المائدہ: ۸۷) اور اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں کہ: آدمی کے تفقہ کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ اپنے رہن سہن میں سادگی سے کام لیتا ہے (اس کی تخریج امام احمد نے مسند میں کی ہے۔5/194 حدیث نمبر: 21742)۔مراد یہ ہے کہ ایک مسلمان سے اس کا مطالبہ ہے کہ جس طرح وہ طیبات سے استفادہ کرنے پر مامور ہے اسی

طرح وہ چیزوں سے تعامل میں زیادتی سے کام نہ لے چاہے فائدہ اٹھانے کا معاملہ ہو یا اُن کو ترقی دینے کا۔ یوں اس کی کوشش معتدل، اقتصاد پر مبنی اور اسراف وتبذیر سے دور ہوگی۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ مباح چیزوں کو استعمال کرے گا۔

تاکہ وہ امکانات جو ہمارے لیے خیر، قوت اور غلبہ کا ذریعہ بننے چاہییں وہ فساد اور فساد انگیزی کا سبب نہ بنیں، جس سے زمین کی برکتوں سے انسانیت محروم ہوجائے۔ یہ عجیب وغریب نکتہ ہے۔ اللہ تعالی نے فرمایا: یبنی آدم: اے اولاد آدم! تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو، اور خوب کھاؤ اور پیو اور حد سے مت نکلو، بے شک اللہ حد سے نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا (الاعراف: ۳۱) اتنا ہی نہیں بلکہ قرآن پاک میں اسراف وتبذیر کرنے والوں کو بھیانک انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اللہ نے ان کو شیطان سے ملا دیا ہے۔ اور ان کا بھائی بتایا ہے، چنانچہ فرمایا:

ان المبذرین کانوا: بیجا خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکرا ہے (الاسراء: ۲۷) اور از اس جملہ اللہ کے نبی ﷺ کا یہ قول ہے، کھاؤ پیو، پہنو اور صدقہ کردو، اسراف نہ کرو نہ اتراؤ۔ اور ابن عباسؓ نے فرمایا: جو چاہے کھاؤ جو چاہے پیو اور پہنو مگر دو برائیوں میں نہ پڑنا: فضول خرچی میں اور غرور میں مبتلا نہ ہونا (صحیح البخاری کتاب اللباس، 5/2181)۔ اسراف کی یہ ممانعت فرد اور سماج دونوں کو شامل ہے جیسا کہ ہر حاصل شدہ مال کو بھی شامل ہے۔ جس کا استعمال عقل وحکمت کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ورنہ وبال اور زیادہ مصیبت بن جائے گا، کیونکہ زیادہ خرچ اور خواہشات میں پیسہ لگانا زیادہ تر حالات میں نفس پر برے اثرات مرتب کرتا ہے، کہ اس کی توانائی بلا جواز کے ختم ہوجاتی ہے، یا اُس کو لالچ کی لت لگ جاتی ہے جس سے شوق کی آگ ٹھنڈی پڑ جاتی ہے، کام میں غفلت طاری ہوتی اور آدمی سستی وغفلت کا شکار ہوجاتا ہے۔ وہ شکوے شکایت کرتا اور رونے دھونے پر اتر آتا ہے۔ ہمیشہ روتا ہے، ہمیشہ بے زاری سے شکایتیں کرتا رہتا ہے۔ اس کا اخلاص ختم ہوجاتا ہے، ریا وتصنع کا دروازہ اس کے لیے کھل جاتا ہے، اس کی عزتِ نفس

ٹوٹ جاتی ہے اور وہ مانگنے کی ذلت پر اتر آتا ہے۔ جہاں تک میانہ روی کی بات ہے تو اس سے قناعت پیدا ہوتی ہے، قناعت عزت پیدا کرتی ہے، جیسا کہ وہ سعی وعمل پر بھی ابھارتی ہے اور محنت کرنے پر آدمی کو آمادہ کر دیتی ہے (بدیع الزمان سعید نورسی، کلیات رسائل النور، اللمعات، ترجمہ: احسان الصالحی استنبول: سوزلر للنشر 1993 صفحہ 222) جیسا کہ فضول خرچی حقِ غیر پر بھی زیادتی ہے کہ اس سے غیر کو فائدہ مند چیز سے محرومی ہوجاتی ہے، ہم عصر کو حال میں اور آنے والی نسلوں کو مستقبل میں۔

اس لیے حضرت امیر معاویہؓ نے فرمایا: جو بھی فضول خرچی ہوتی ہے تو اس کے مقابلہ میں کوئی نہ کوئی حق ضائع ہوتا ہے (ادب الدین والدنیا صفحہ 187) حضرت ابوبکرؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں ان لوگوں سے نفرت کرتا ہوں جو کئی دن کا رزق ایک دن میں کھا جاتے ہیں'۔ اور کہا گیا ہے کہ زیادہ ہو مگر اس میں فضول خرچی آجائے تو وہ ختم ہوجاتا ہے، اور تھوڑا ہو جس میں تدبیر سے کام لیا جائے تو وہ نتیجہ خیز ہوجاتا ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ: اگر آپ اپنا مال غیر حق میں دیدیں گے تو یہ ہوگا کہ جب حق آئے گا تو آپ کے پاس دینے کے لیے کچھ نہ ہوگا (ابوالقاسم الحسین بن محمد بن المفضل الاصفہانی، محاضرات الادباء ومحاورات الشعراء والبلغاء، شفیق عمر الطباع (بیروت دار القلم 1420ھ 1999 جلد اول صفحہ 579) اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ غربت اور محرومی فطرت کی پیداوار نہیں بلکہ غلط تقسیم کا نتیجہ ہے اور مالداروں وغریبوں کے درمیان جو اچھا رشتہ رہنا چاہیے، اُس سے انحراف کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ کسی نے صحیح کہا ہے کہ: متکبر لوگ اگر خوش حال ہوں گے تو اس کی قیمت لوگوں کو دینی پڑے گی (الشیخ عبدالسلام یاسین، فی الاقتصاد ص ۹۰۲) اور ''کوئی نادار اسی وقت بھوکا ہوتا ہے جب کوئی مالدار دینے سے انکار کرتا ہے۔

۵۔اصول تمدن اور جدوجہد کی ترجیحات والی فقہ: پس تعمیر زندگی میں مسلمان کی جدوجہد شعوری عمل پر مبنی ہونی چاہیے۔اس کے لیے زمان ومکان کے اقتضاء کے مطابق ایسی کوششیں ہوں جن سے امت کی اساسی ضروریات درجہ کفایت میں پوری ہوجائیں، اور ان میں مقاصد شریعت

کوملحوظ رکھا گیا ہو، یعنی دین کا تحفظ ہو جو کہ امت کے لیے سب سے بنیادی چیز ہے، اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کی حفاظت ہو، اور ہیومن رسورس اور تمدن انسان کو ترقی دینے کے لیے انسانی وجود کی حفاظت ہو اور مال کا تحفظ ہو اور اس پر ترقی وتمدن کی جو سرگرمیوں میں ہوتی ہیں ان کی حفاظت ہو۔ اور عقل کی حفاظت ہو اور ثقافتی وجود کے عناصر اور قدروں کے عناصر کا استحکام جو عقل پر موقوف ہے ،ان سب کی حفاظت ہو۔ اور جب تک اشیاء ضروریہ کا کم از کم درجہ اور قدرِ کفاف حاصل نہ ہو جائے، ان توانائیوں کو جو ان کو حاصل ہو سکتی ہیں کسی اور چیز میں لگانا جائز نہ ہوگا۔ تو اسلامی نقطہ نظر سے کام اور کائنات کی قوتوں کی تسخیر میں موجودہ صورت حال کی ترجیحات اور مقاصد شرع کی ترجیحات کو سامنے رکھا جائے گا۔ یوں کہ ضروریات کو واجبات سے مقدم رکھا جائے گا۔ ضروریات وہ ہیں جن کے بغیر فرد کی زندگی چل نہیں سکتی، ان کے بغیر اس کا وجود قائم نہیں رہ سکتا۔ ان کی عدم موجودگی میں مصالح دنیا ٹھیک نہیں رہیں گے بلکہ فاسد ہو جائیں گے اور زندگی فوت ہو جائے گی۔ حاجیات وہ تمام انسانی ضرورتیں ہیں جو بقدر سے اوپر ہوں اس کے بعد کمالیات کا نمبر ہے۔ یہ وہ چیزیں ہوتی ہیں جو تہذیب وتمدن میں کسی قدر خوشحالی لیے ہوتی ہیں جن سے اسراف اور فضول خرچی نہ ہو۔ کیونکہ ابن خلدون کے مطابق ضروری حاجیاتی وکمالی پر مقدم ہے کہ ضروری اصل ہے کمالی اس کی فرع ہے، اور اس لیے کہ انسان کی مطلوبات میں سب سے پہلے ضروری والی اشیاء آئیں گی اور کمال وخوشحالی بھی اس کے بغیر حاصل نہ ہو سکے گی (مقدمہ ابن خلدون صفحہ 122)۔

تو دنیا میں فائدہ اٹھانے اور اُسے مزید فائدہ مند بنانے کی جدوجہد واجب ہے۔ اولاً ان چیزوں میں جن سے امت کی بقا وتحفظ ہو، دوسرے ان میں جن سے امت کی سرگرمی اور فعالیت کی حفاظت ہو، تیسرے ان میں جن سے امت کی تخلیقیت اور کمال کی حفاظت ہو، یہی وہ چیز ہے کہ جس کو ہمارے علماء نے ثابت کیا ہے۔

جب انہوں نے اس حدیث نبوی کی شرح وتوضیح کی کہ: جو مسلمان بھی کوئی پودہ لگاتا ہے

یا بیج بوتا ہے، جس سے کہ کوئی انسان، کوئی پرندہ یا کوئی جانور کھائے تو وہ اس کے لیے صدقہ ہوگا''۔ یہاں علماء کا اختلاف اس بارے میں ہوا ہے کہ وہ کون سے اعمال ہیں جن میں زیادہ اجر ملے گا۔ تو امام عینی کہتے ہیں: اس میں جیسے جیسے لوگوں کی ضرورت ہوگی ویسے ہی حکم بدلے گا، تو جہاں لوگوں کو روزی کی ضرورت ہوگی وہاں لوگوں کی روزی کشادہ کرنے کے لیے زراعت زیادہ افضل ہوگی، جہاں تجارت کی زیادہ ضرورت ہوگی مثلاً راستہ منقطع ہو تو وہاں تجارت افضل ہوگی اور جہاں لوگ صنعتوں کے زیادہ محتاج ہوں گے وہاں صنعت زیادہ افضل ہوگی (عمدۃ القاری، 12/155)۔

یہ بلند فقہ ہے جس کی ہماری امت کو اپنی تہذیبی جدوجہد میں شدید ضرورت ہے کیونکہ امت کا سرمایہ، یہاں وہاں، بے فائدہ چیزوں میں لٹایا جا رہا ہے۔ اُس کی قوتیں ان چیزوں میں لگائی جا رہی ہیں جن کا اس کو کوئی حقیقی فائدہ نہیں ہوگا پھر وہ لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرتی ہے!! اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ''جدوجہد کی ترجیحات کی سمجھ'' فقہ تہذیبی کے اصولوں میں سے ہے۔ جن کا تقاضا کئی چیزیں کرتی ہیں اور جو لوازم کے ایک مجموعہ پر کھڑی ہیں جن میں تفکیر وتدبیر، ادراکِ واقع، اس کی حرکت کے فہم اور اس کے تاریخی اور مستقبلی توسیعات کے میدان آ جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ترجیحات کا ایک نقشہ طے کرنے کی قدرت ہو۔ جس کے اندر ان چیزوں کو مقدم رکھا جانا چاہیے، اس میں مقاصد کے مراتب یعنی پہلے ضروری پھر حاجیاتی اور پھر تحسینی کو رکھا جائے گا۔ یہ اس لیے ہوگا کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں میں تحسینات کو حاجیات پر اور حاجیات کو ضروریات پر مقدم کر دیا جائے۔ اسی طرح جہاں مقاصد میں ٹکراؤ ہوگا وہاں تقابل کیا جائے گا اور جو اولی اور زیادہ نفع بخش اور مصالح کی تکمیل کرنے والا ہوگا، مثال کے طور پر اگر کچھ صنعتیں ایسی ہیں جن سے بعض لوگوں کو خوشحالی ملے گی مگر ان سے فضاء میں آلودگی پھیلے گی اور زندگی کے وسائل برباد ہو جائیں گے تو اس صورت میں اسلامی نقطہ نظر سے ماحول کے تحفظ میں اور وسائل حیات کے تحفظ کو ترجیح دی جائے گی بلکہ اس کے منافی کوئی چیز کرنا حرام ہوگا جیسا کہ آگے آئے گا۔ یہ بعض کاموں کی اہمیت کو کم کرنا نہیں بلکہ ان کو وزن

دینا ہے۔اور زندگی کے مختلف میدانوں میں مختلف کاموں میں ترجیحات قائم کرنا ہے۔ کیونکہ ترجیح نہ قائم کی جائے گی تو اس سے وہ نہ صرف خبط ہوتے بلکہ ضائع ہوجاتے ہیں!! یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ ترجیحات میں خلل واقع ہونے سے تہذیبی جدوجہد میں خلل واقع ہوگا۔ کائنات کی تسخیر اور اس کی اشیاء کو اپنی ضرورتوں اور قدروں کے مطابق صرف کرنے میں کمزوری آئے گی، اِس سے یا تو کاموں اور سرگرمیوں میں انتشار پیدا ہوگا، کیونکہ امت زندگی کی پگڈنڈی پر غلط طریقہ پر چل رہی ہوگی یا ''غیر'' کی تقلید اور متابعت کرنی پڑے گی اور ہوگا یہ کہ جس کو آگے کرنا چاہیے اس کو پیچھے اور جس کو پیچھے کرنا چاہیے اس کو آگے کر دیا جائے گا، حالانکہ اس کی ضرورت نہ ہوگی لیکن ہم ایسا دوسروں کی متابعت میں کریں گے۔اور یا یہ ہوگا کہ آخرِ کار ہم غیر کے غلام بن جائیں اور امت تہذیبی جدوجہد میں دوسروں کا کام کرے گی۔ جو اس کے ارادہ پر مسلط ہوں، جو اس کے شعور کو زائل کر دیں اور اس کی تہذیبی فعالیت کو شل کر کے رکھ دیں۔نتیجہ یہ ہو کہ وہ ''فضل'' کی تلاش نہ کرے بلکہ جو غیر کے پاس ہے اس کو تلاش کرے جیسا کہ آج ہم اپنی تہذیبی سرگرمیوں میں پاتے ہیں۔ جہاں غلامی کو بھی آزادی کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جہاں لوگ اپنی ضرورتوں کی تحدید خود نہیں کر سکتے بلکہ یہ ضرورتیں پروڈکشن کے تقاضوں کے مطابق اور اس کی ذہنی فضاء کے بموجب اُن کے اوپر لا دی جاتی ہیں، جس کو ذرائع ابلاغ بناتے ہیں۔ جہاں کہ اب انسان کا مطلب ہے کام اور صرف اور صرف مکاری والی ذہانت، جس کی کوئی انتہاء نہیں، اسی کو بڑھوتری ، پیدا وار اور صرَف کی غایت قرار دیا جاتا ہے (رجاء گارودی ،حوار الحضارات، ترجمہ عادل العوا، طبع ۳ (بیروت ،منشورات عویدات 1986 ص ۲۴) اسلام ان قدروں اور آداب کے ساتھ زندگی کی تعمیر میں انسانی تہذیبی جدوجہد کا گلا نہیں گھونٹتا جیسا کہ گمان کیا جاتا ہے بلکہ وہ اس جدوجہد کی تہذیب کرتا، اس کو منضبط کرتا اور فساد و بربادی سے اس کی حفاظت کرتا ہے، اور اسے نرمی ورحمت کے تابع بناتا ہے کیونکہ '' وہ شخص مومن نہیں جو پیٹ بھر کر سوئے اور اس کا پڑوسی اس کے بغل میں بھوکا ہو (بیہقی نے شعب الایمان میں اس کی تخریج کی ہے۔ 5/31 حدیث نمبر 5660) اس حدیث کے علاوہ

ایک اورحدیث میں یوں آیا ہے: جس نے چالیس دن تک کھانے کا ذخیرہ کر کے رکھا تو وہ اللہ کے ذمہ سے بری ہوگیا اور اللہ اس سے برائت کرے گا اور جس بستی کے لوگ بھی ایسے ہوں کہ ان میں ایک شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ بھوکا ہو تو اللہ کی ذمہ داری اُس سے ختم ہوگئی (مسند احمد 2/33 حدیث نمبر:4880 مستدرک 2/14 حدیث نمبر:2165) تو اس طرح انسان اپنی کوشش میں انانیت وترجیح سے بالا ہو جائے گا اور اس میں اسلام کے اس بلند اصول کی مطابقت کرے گا کہ ''نہ کسی کو نقصان پہنچانا اور نہ نقصان اٹھانا'' جیسا کہ رسول اللہ نے فرمایا: (اس کی تخریج گزر چکی) مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے حقوق کا خیال رکھے گا تو اپنے کو نقصان نہ دے گا دوسروں کے حقوق کا خیال کرے گا اور ان کو نقصان نہ پہنچائے گا۔ تو یہ اہم اصول ہے جس کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے سامنے ضرر اور فساد کے تمام راستے بند کر دیے۔

جیسا کہ اس کے ذریعہ اسلام نے نفع کو بھی اس سے بہت زیادہ وسیع مفہوم دیا جتنا خالص مادی نظریات میں دیا جاتا ہے۔ جس پر مغربی انسان اپنی زندگی میں چلتا ہے ۔ اور اس کے علاوہ کوئی غایت اس کے سامنے نہیں ہے کہ اسلام میں نفع یا ثروت کی نمو پذیری اصل مطلوب نہیں اگر چہ مطلوب وہ بھی ہے۔ بلکہ اصل نشانہ اللہ کا قرب، اُس کی رضا کا حصول، اس کی جنت پانا اور اس کے فضل کو چاہنا ہے۔ اسی لیے کسی بھی عمل کو قبول کرنے کے لیے اخلاقیات کو اُس نے پہلا مقام دیا ہے۔ اسی ہدف کے باعث صدقہ، درگزر، احسان اور لوگوں پر سخاوت اور ان کا استحصال نہ کرنا وغیرہ جن کو غیر اسلامی نقطۂ نگاہ سے نقصان سمجھا جاتا ہے۔ اسلام میں ان کو عین نفع گردانا جاتا ہے اور ایسا فائدہ جانا جاتا ہے جس سے بڑا کوئی فائدہ نہیں۔ چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: یہ مال میٹھا اور سرسبز ہے، مسلمان کا وہ ساتھی (مال) کیا ہی اچھا ہے جس میں سے وہ مسکین، یتیم اور مسافر کو دے (صحیح البخاری کتاب الزکوۃ باب الصدقۃ علی الیتامی 2/532 حدیث نمبر 1396) اور مزید فرمایا: صدقہ سے کسی بندہ کا مال کم نہیں ہوتا (ترمذی نے اس کی تخریج اپنی سنن میں کی ہے: حدیث نمبر:2325 اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے) بلکہ اللہ تعالی دنیا میں اس کے ظاہری

نقصان کی تلافی فرما دیتا ہے اور آخرت میں اس کو اس پر ثواب دے گا جیسا کہ متفق علیہ حدیث میں آیا ہے (یہ الفاظ بخاری کے ہیں، کتاب الزکوۃ باب: لایقبل اللہ صدقۃ من غلول ولایقبل الامن کسب طیب 2/511 حدیث نمبر: 1344 اور مسلم نے اپنی صحیح میں کتاب الزکوۃ باب قبول الصدقۃ من الکسب الطیب وتربیتھا 2م 702 حدیث نمبر: 1014)

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے بھی حلال کمائی سے ایک کھجور کے برابر خرچ کیا ہو، اور اللہ حلال وطیب کے علاوہ کچھ قبول نہیں کرتا، تو اللہ تعالیٰ اُس کو اپنے دائیں ہاتھ سے قبول کرتا ہے پھر اسے صدقہ کرنے والے کے حق میں بڑھاتا رہتا ہے۔ جیسے تم میں سے کوئی اپنی چراہ گاہ کو بڑھاتا ہے یہاں تک کہ وہ پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔ اس کی تشریح میں علامہ ابن حجر لکھتے ہیں:

صدقہ عمل کا بچہ ہے اور بچہ کو افزائش کی ضرورت سب سے زیادہ اُس وقت ہوتی ہے جب وہ دودھ پیتا ہو، تو پھر اگر اس کی صحیح تربیت کی جائے تو وہ حدکمال کو پہنچتا ہے۔ یہی حال ابن آدم کا بھی ہے خاص طور پر صدقہ کا کہ جب بندہ حلال کمائی سے صدقہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی نظر کرم اس کو کمال عطا کرتی ہے اور اللہ تعالی اس کے اجر کو بڑھاتا رہتا ہے یہاں تک کہ صدقہ اور اس کے ثواب میں وہی نسبت ہو جاتی ہے جو کھجور کو پہاڑ سے ہوتی ہے (فتح الباری 3/372) اور انس بن مالک سے روایت ہے کہ دو بھائی نبی ﷺ کے زمانہ میں تھے، ان میں سے ایک آپ ﷺ کے پاس آیا کرتا اور دوسرا کماتا تھا، کمانے والے نے اپنے بھائی کی شکایت نبی ﷺ سے کی تو آپ نے کہا: شاید کہ تم کو اسی کی وجہ سے روزی مل رہی ہو (مرجع سابق حدیث نمبر: 2345 اور انہوں نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے)۔

اور جب حرکتِ حیات خلافت کے عقیدہ کے تحت انجام پائے اور اس کے تقاضوں یعنی تزکیہ نفس اور ''زمین کی ایمانی تعمیر'' کے مطابق ہو تو رب تعالیٰ سے قریب کرنے والی قید حقیقت میں قید نہیں رہتی بلکہ اسلامی اقداری نظام کے دائرہ میں اصلاحِ حال کا ضابطہ ہو جاتی ہے۔ جو منہجِ خداوندی کے مطابق خلافت کے کام کو انجام دیتی ہے وہ انجام کی کامیابی یعنی جنت اور اس کی نعمتوں کے راستہ کا

زاد بن جاتی ہے!! اس بنیاد پر نفع اور سرمایہ بھی باشعور و بیدار مغز آدمی کے نزدیک خسارہ بن جاتا ہے اگر وہ اللہ کی رضا اور اس کے تقرب کے راستہ میں حائل ہو۔ جیسا کہ نقصان ہی فی الحقیقت فائدہ معلوم پڑتا ہے جب وہ بندہ کو خدا سے قریب کر دے اور آخرت میں کام آئے۔

جہاں تک خالص مادی نقطۂ نظر کی بات ہے جس کے پاس دنیاوی فائدہ اور نقصان کا ہی پیمانہ ہوتا ہے، تو اس کو ہمیشہ فقر کا دھڑکا لگا رہتا ہے اور وہ ہمیشہ اپنی ملکیت کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان رہتا ہے اور انانیت اور زیادہ کی ہوڑ سے زیادہ وسیع مقاصد میں استعمال سے گھبراہٹ میں پڑ جاتا ہے۔ کیونکہ محتاجی کا سایہ اور نقصان کا بھوت اُسے اور ڈرا دیتا ہے۔ چنانچہ اس قسم کی تنگ مادی سوچ کو قرآن نے شیطان کی طرف منسوب کیا ہے۔ جب فرمایا: **الشیطان یعدکم الفقر**: شیطان تمہیں فقیری سے ڈراتا ہے اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ وسعت والا اور علم والا ہے (البقرۃ: 268)۔

## (ب) وہ اصول جو انسان کے اشیاء اور ماحول سے رشتہ کو منضبط کرتے ہیں:

اگر تہذیب انسان کی حرکتِ حیات اور عالم اشیاء کے مابین انٹرایکشن کا حاصل ہے تو وحی کے حقائق اس تہذیبی جدوجہد میں اُس کی کوششوں کو فریم دیتے ہیں۔ ان کی اصلاح و تہذیب کرتے ہیں اور انسان کے اس کے گرد پھیلی کائنات سے رویہ کی تحدید کرتے ہیں جس میں جاندار و غیر جاندار، مادی اور روحانی دکھائی دینے والی اور مستور از نظر اشیاء ہیں جن کو انسان کے لیے مسخر کیا گیا ہے۔ یوں اس کا اُس کے ساتھ رویہ ایک مثبت اور فعال رویہ ہو جاتا ہے جس میں تین مسلمات سے مطابقت ہوتی ہے۔ اور یہ تینوں ایک منفرد اسلامی اصول سازی اور ممتاز تہذیبی فقہ کے ترجمان ہیں۔ اور کائنات کے ساتھ استفادہ اور نفع بخشی میں انسان کے تعامل کی تشکیل کرتے ہیں۔

**اولا: انسان اور کائنات کی وحدت: یعنی دونوں کا وجودی تعلق** (اس کے لیے ملاحظہ ہو: ڈاکٹر عبدالمجید النجار، قضایا البیئۃ من منظور اسلامی صفحہ 70 اور اس کے بعد مطبوعہ وزارۃ الاوقاف قطر، 1999 اور ان کی کتاب الشھو د

الحضاری للامۃ الاسلامیۃ ،فقہ التحضر 1/128) یوں کہ انسان ایک وسیع کائناتی تناظر کا ایک حصہ ہے۔وہ تسبیح رب کرنے والے ایک بڑے قافلہ کا فرد ہے ومامن دابۃ فی الارض :اور جتنے قسم کے جاندار زمین پر چلنے والے ہیں اور جتنے قسم کے پرندجانور ہیں کہ اپنے دونوں بازؤں سے اڑتے ہیں ان میں کوئی قسم ایسی نہیں جو کہ تمہاری طرح کے گروہ نہ ہوں،ہم نے دفتر میں کوئی چیز نہیں چھوڑی پھر سب اپنے پروردگار کے پاس جمع کیے جائیں گے (الانعام:38) لہٰذا اسلام انسان اور اشیاء کائنات کے مابین جو رشتہ قائم کرتا ہے وہ وحدتِ اصل پر مبنی ہے (البتہ اس وحدت کے دائرہ میں انسان کو اپنی قدرں کے باعث امتیاز حاصل ہے) کیونکہ کائنات کی تمام چیزیں انسان اور زندگی کے تمام ظواہر سب اللہ کی مخلوق ہیں اور اس کی خبر گیری اور انتظام کے تحت آتے ہیں۔ولئن سائلتھم من خلق:اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو یقیناً ان کا جواب ہوگا کہ انہیں غالب ودانا (اللہ) نے پیدا کیا ہے، وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش (بچھونا) بنایا اور اس میں تمہارے لیے راستے کردیے تاکہ تم راہ پالیا کرو،اسی نے آسمان سے ایک اندازے کے مطابق پانی نازل فرمایا،پس ہم نے اس مردہ شہر کو زندہ کردیا،اسی طرح تم نکالے جاؤ گے،جس نے تمام چیزوں کے جوڑے بنائے اور تمہارے لیے کشتیاں بنائیں اور چوپائے جانور پیدا کیے جن پر تم سوار ہوتے ہو (الزخرف:12-9) اسی طرح انسان اور کائنات کے درمیان یہ وحدت کام کے اندر بھی ہے۔چنانچہ قرآن کریم کائنات کا وظیفہ مع اس کی ساری نیرنگیوں کے عبادتِ الٰہی کو قرار دیتا ہے: تسبح لہ السماوات : ساتوں آسمان اور زمین اور جو بھی ان میں ہے اسی کی تسبیح کررہے ہیں،ایسی کوئی چیز نہیں جو اسے پاکیزگی اور تعریف کے ساتھ یاد نہ کرتی ہو۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ تم اس کی تسبیح سمجھ نہیں سکتے،وہ بڑا بردبار اور بخشنے والا ہے (الاسراء:44) لہٰذا کائنات اور اس کی تمام مخلوقات،ہر کنکر پتھر،ہر دانہ اور ہر پتہ،ہر پھل اور پھول،ہر پودہ اور درخت،ہر کیڑا مکوڑا،ہر حیوان اور ہر انسان زمین پر چلنے والا ہر جانور اور پانی وہوا میں ہر تیرنے والا اور آسمان کے سب باسی سب کے سب اللہ کی تسبیح کرتے اور اس کی عظمت کے گن گاتے ہیں (فی ظلال القرآن 5/24)۔

انجام میں: چنانچہ اللہ کی ہی ہے ہر مخلوق اور سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔اس میں کائنات

کی تمام چیزوں کے ساتھ انسان بھی ساتھ ہے اگر چہ ذمہ داری اور حساب و کتاب میں پھر وہ سب سے جدا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: لاتدع مع الله الٰها: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارنا، بجز اللہ تعالی کے کوئی اور معبود نہیں، ہر چیز فنا ہونے والی ہے مگر اسی کا منہ (اور ذات)۔ اسی کے لیے فرمانروائی ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے (القصص:88)۔

اسی طرح محتاجگی میں: چنانچہ اللہ عزوجل نے وجود، حرکت اور انجام، خلق و تدبیر، غلبہ وحکومت ہر چیز میں ساری مخلوق کو اپنا محتاج پیدا کیا ہے، جس میں ہر چیز کو دوسری چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے کائنات میں کوئی بھی وجود جو بھی ہو نہ کسی چیز کو اپنے آپ سے دفع کرسکتا ہے نہ اپنے پاس لاسکتا ہے۔ یوں کائنات کے سب افراد ایک دوسرے کے محتاج ہیں، سب ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور اُسے اپنی بخششوں سے نوازتے ہیں۔ امام مناوی زکوۃ اور اس کے وجوب پر گفتگو کرتے ہوئے اس پر یوں تبصرہ کرتے ہیں: ''جان لو کہ زکوۃ کے ذریعہ کل وجود اللہ کی عبادت کرتا ہے، زمین کو دیکھیے جو آپ سے سب سے زیادہ قریب ہے، آپ دیکھیں گے کہ وہ سب سے قریبی مخلوق کو جو رات دن اس کے اوپر چلتی ہے اپنی ساری برکتیں دیتی ہے، اس کے پاس جو بھی کچھ ہے وہ کسی پر بخل نہیں کرتی۔ اسی طرح سے نباتات، حیوان، آسمان اور افلاک سب • کے سب ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہیں اور اللہ کی اطاعت میں کسی بھی چیز کو ذخیرہ کر کے نہیں رکھتے کیونکہ زندگی ایک دوسرے کی محتاج ہے، وہ فقر وفاقہ اور ضرورت میں بھی ایک دوسرے کے لیے ضروری ہے (فیض القدیر، 5/505)۔

اس سلسلہ میں یعنی وحدتِ انسان اور کائنات کو بنیاد بنا کر اسلامی نقطہ نظر سے انسان اور کائنات اور اشیاء کائنات کے مابین جو رشتہ ہوگا وہ وجدانی اور روحانی رشتہ ہوگا جو قربت اور اخوت کا رشتہ ہوگا جس میں محبت، الفت اور رحمت ورافت کے معانی ہوں گے اور عداوت، کشمکش، غلبہ وقہر کے تمام معنوں سے وہ خالی ہوں گے!! اور یوں لگے گا کہ اس کی روحانیت بھی کائنات کی روحانیت ہے۔ احد پہاڑ کے بارے میں اللہ کے رسول نے فرمایا جس میں احد پوری اشیاءِ عالم کے لیے ایک علامت کے طور پر استعمال کیا گیا کہ: یہ پہاڑ ہم سے محبت رکھتا ہے اور ہم اس سے محبت رکھتے ہیں (صحیح البخاری

،کتاب الزکوۃ باب خرص التمر 2/539 حدیث نمبر:1411) اور فرمایا: اپنی پھوپھی کا اکرام کرو کیونکہ وہ اس مٹی سے بنائی گئی ہے جو تمہارے باپ آدم کی تخلیق سے بچ گئی تھی (ابویعلی نے اپنی مسند میں سیدنا علیؓ کی حدیث کے طور پر نقل کی ہے 3531/ کشف الخفاء میں کہا: کہ اس کی سند میں ضعف اور انقطاع ہے 1/195)۔ اس وحدت سے باہر انسان اور کائنات کے درمیان جو بھی تعلق ہو جو قربت کے رشتوں سے دور ہو وہ بلاشبہ فساد کی طرف جائے گا، جیسا کہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ انسان اور کائنات کے مابین یہ رشتہ خراب ہو گیا ہے جس کی ابتدا اس رشتہ کے فلسفیانہ تصور سے ہوئی اور انتہاء یہ ہے کہ آج کائنات کے ساتھ جو معاملہ کیا جا رہا ہے وہ فطرت سے بعید ہے۔ اور وہ مجملا چیلنج اور کشمکش پر کھڑا ہے۔ اس میں pragmatism کے نقطہ نظر سے کائنات اور اس کی اشیاء پر غلبہ پانے کا سرکش جذبہ کام کر رہا ہے۔ جس میں زمین اور اس کے خزانوں کو چوس لینے اور ہر چیز کو بازاری بنادینے کا جذبہ کارفرما ہے جہاں ہدم وتخریب ہے اور شدید استحصالی طریقہ پیداوار کی بنیاد پر خواہشات کو پورا کیا جا رہا ہے۔ یہ وہ انتہا پسندی ہے جو تاریخ کی سب سے بڑی انسانی کمزوری کو بتا رہی ہے اور جس کے سبب آج کائنات کی دَین بس بند ہوا چاہتی ہے!! مغرب کے جن فلسفیوں اور مفکرین نے موجودہ ماحولیاتی بحران کو اسی تناظر میں لیا ہے کہ آج زمین کے سیارہ پر انسان کی سرکشی اور عالمِ اشیاء سے اس کی دشمنی نے ہی یہ گل کھلایا ہے۔ ان میں سابق امریکی نائب صدر ال گور سرفہرست ہیں (ال گور نے اپنی بات کو یوں پیش کیا ہے: ''جب ہم اپنے آپ کو سیارۂ ارضی سے الگ مان لیتے ہیں تو اُس کی قدر و قیمت کو گھٹانا ہمارے لیے آسان ہوجاتا ہے، جب ہم اپنے کو زمین سے الگ مان لیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے پاس زندگی کے فطری سفر سے ہم آہنگ ہونے کا کوئی خیال نہیں۔ اور نہ ہم فطرت میں جاری تبدیلیوں کو جانتے ہیں جن میں ہم بھی مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے تہذیبی سفر کی تحدیدیوں کرتے ہیں کہ اپنے آپ ہی کو واحد مرکزی نقطہ فرض کر لیتے ہیں تو پھر اگر ہم راستہ کھودیں اور تشویش وطمع کا شکار ہوجائیں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ اور اس میں بھی کوئی حیرت نہ ہونی چاہیے کہ بہت سے لوگ اپنی زندگی کو ضائع محسوس کریں۔ بات یہ ہے کہ نوع انسانی تبھی آگے بڑھے گی جب وہ زندگی سے مشترک اعتماد کی بنیاد پر رشتہ رکھے گی۔ لیکن ہم نے جنت سے نکلنے میں عافیت جانی اور اپنے آپ کو سیارۂ زمین سے الگ تھلگ فرض کر لیا تو جب تک ہمیں ایسا طریقہ نہیں مل جاتا جس سے ہم اپنی تہذیب کو بنیادی

طور پر بدل سکیں اور جب تک ہم زندگی اور سیارۂ ارضی کے مابین تعلق کے بارے میں اپنا طریقۂ فکر نہیں بدلتے تب تک ہماری اولادیں ایک تباہ حال زمین کی وارث ہوں گی''۔الارض فی میزان الایکولوجیا وروح الانسان صفحہ 167 اس سلسلہ میں مزید ملاحظہ کریں: جان ماری بیلیٹ کی کتاب جس کا ترجمہ سید محمد عثمان نے عودۃ الوفاق بین الانسان والطبیعہ کے نام سے کیا ہے: عالم المعرفۃ، المجلس الوطنی للثقافۃ والفنون والآداب، الکویت ع 189 اور رابرٹ ایم اگروس اور جارج این سٹانیسوجن کی کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر محمد کمال الدین خلایلی نے العلم فی منظورہ الجدید کے نام سے کیا ہے: عالم المعرفہ، المجلس الوطنی للثقافۃ والفنون والآداب، الکویت، ع 143)۔

جنہوں نے اپنی کتاب ''زمین میزان میں'' کے اندر بنیادی فکر یہی پیش کی ہے کہ آج ہم جس کائناتی بحران کا مشاہدہ کررہے ہیں دراصل اس کا سبب یہی انسان کا استحصالی رویہ ہے جو کائنات کو اپنے ارادوں کے تابع کرنا چاہتا ہے جس سے عالم اشیاء اور انسان کے مابین ایک کشاکش قائم ہوگئی ہے اور جدید تہذیب کی منطق یہی ہے۔

بیلیٹ نے نہایت مؤثر انداز میں کہا ہے: ''اگر انیسویں صدی نے خدا کو قتل کردیا تھا اور بیسویں صدی نے انسان کو، تو اکیسویں صدی فطرت کو قتل کردے گی!! (عودۃ الوفاق بین الانسان والطبیعۃ صفحہ 22) ظاہر ہے کہ اگر انسان کائنات اور انسانوں کے مابین اللہ کے پیدا کیے ہوئے رشتہ کو کاٹ دیں گے جس کے ذریعہ اور جس کے اندر وہ رہتے ہیں تو اس کا نتیجہ تو یہی ہونا ہے!!

ہاں، اگر انسان اور اس کے گرد کی اشیاء میں وہ قربت کا تعلق قائم ہوجائے جو اسلام کا طے کردہ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اور کائنات کے درمیان جو تصرف ہوگا وہ اخلاقی ہوگا جیسا کہ ایک انسان کا دوسرے انسان سے تعلق ہوتا ہے جس میں اس کو اسلامی اصول کے مطابق عدل ورحمت اور احسان پر عمل درامد ہوتا ہے کہ ''ہر مخلوق کے اپنے حقوق ہیں'' علماء اسلام نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے۔ جیسا کہ حدیث نبوی ''من لایرحم لایُرحم'' کی (اس کی تخریج گزرچکی) کی شرح میں گزرا کہ ابن حجر نے لکھا ہے کہ: ابن بطال کہتے ہیں کہ اس حدیث میں تمام خلقِ خدا کے لیے رحمت کے استعمال پر ابھارا گیا ہے جس میں مؤمن وکافر اور پالتو وغیر پالتو جانور سب آجاتے ہیں (فتح الباری 10/440) اسلامی

تہذیب کے نمایاں نقوش میں سے وہ ہے جس کو ''گم شدہ کتوں کا وقف'' کہا جاتا تھا۔ ''اس وقف کو ئی جگہوں پر خرچ کیا جاتا تھا، مثال کے طور پر ان کتوں کو کھلانے کے لیے جن

کا مالک نہ ہوتا، تاکہ وہ بھوکے نہ مریں، یا جب تک ان کو کوئی پال نہ لے (یوسف القرضاوی، تاریخنا المفتر ی علیہ، طبع دوم، دار الشروق 2006 صفحہ 142) اسی طرح ایک وقف پرندوں کے ان لشکروں کے لیے تھا جو تونس کی جامع زیتونہ کی محرابوں اور کناریوں میں رہتے تھے، اسی طرح کچھ وقف ان لوگوں کے لیے ہوتے تھے جو باضابطہ گشت لگاتے تھے اور نظامِ حسبہ کے تحت آتے تھے اور اسلامی شہروں و قصبوں میں جاکر یہ دیکھتے تھے کہ کہیں جانوروں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ تو نہیں ڈالا جارہا ہے یا ان کو بھوکا رکھ کر یا مار بجا کر زیادتی تو نہیں ہو رہی ہے (عبد المجید النجار، مراجعات فی الفکر الاسلامی، طبع اول، تونس، دار الغرب الاسلامی 2008 صفحہ 287) پھر یہ بھی ذہن میں رہے کہ یہ اوقاف سرکاری نہیں عوامی ہوتے تھے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے دورِ عروج میں مسلمانوں کا تہذیبی شعور کتنا بلند تھا۔ ہماری تہذیب میں یہ معاملہ اتنا آگے گیا کہ فقہ اسلامی نے انسان پر جانوروں اور چوپایوں کے حقوق متعین کیے!! العز بن عبد السلام اپنی کتاب قواعد الاحکام فی مصالح الانام (ملاحظہ ہو: جلد اول صفحہ 141) میں کہتے ہیں۔ ''انسان پر جانوروں اور چوپایوں کے حقوق یہ ہیں کہ ان کی ضرورت کے مطابق ان پر خرچ کیا جائے، اگر وہ بوڑھے ہوگئے ہوں یا ایسے بیمار ہوگئے ہوں کہ ان سے کوئی فائدہ نہ ہوتا ہو تو ان پر اتنا بوجھ نہ لادا جائے جو وہ سہار نہ سکیں، ان میں ایسا جانور نہ باندھا جائے جو ان میں سے ہو یا ان میں سے نہ ہو اور وہ ان کو سینگ مار کر، چوٹ پہنچا کر یا ان پر حملہ کر کے ان کو ایذاء دے۔ اور یہ کہ ذبح کرتے وقت ان کو اچھی طرح ذبح کرے، جان نکلنے اور ٹھنڈا ہونے سے پہلے ان کی کھال نہ اتارے نہ ہڈی توڑے۔ ان کے سامنے ان کے بچوں کو ذبح نہ کرے، نہ بچوں کو ان سے دور کرے۔ ان کے باڑے اور رہنے کی جگہیں ٹھیک رکھے اور جب جانوروں کو شہوت ہو تو نر و مادہ کو ملا دے، شکار کردہ جانور کو ٹھیکرا نہ مارے، نہ کوئی ایسی چیز مارے جس سے اس کی ہڈی ٹوٹ جائے نہ ایسی چیز سے ہلاک کرے جس سے ان کا گوشت حلال نہ ہوتا ہو''۔

تو مسلمان اور کائنات کے درمیان کبھی بھی سرکشی اور دشمنی یا جبر و تشدد کا رشتہ نہیں رہا بلکہ یہ رشتہ اخوت و محبت کا رشتہ تھا بلکہ یہ عبادت کی ہی ایک قسم تھی کہ دنیا و مافیہا اللہ تعالیٰ کی حسن تخلیق کا ایک خوش نما مظہر ہے۔قوانین فطرت اور کائنات کی جزئیات سب اللہ کی صناعی، کاریگری اور بہترین اندازہ کی گواہی دیتی ہیں جیسا کہ فرمایا: قل سیروا : کہہ دیجئے! کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو تو سہی کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ابتداء پیدائش کی۔ پھر اللہ تعالیٰ ہی دوسری نئی پیدائش کرے گا، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے (العنکبوت:20) اور فرمایا: قل انظروا: آپ کہہ دیجئے کہ تم غور کرو کہ کیا کیا چیزیں آسمانوں میں اور زمین میں ہیں اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کو نشانیاں اور دھمکیاں کچھ فائدہ نہیں پہنچاتیں (یونس:101) اور فرمایا: او لم ینظروا: اور کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا آسمانوں اور زمین کے عالم میں اور دوسری چیزوں میں جو اللہ نے پیدا کی ہیں اور اس بات میں کہ ممکن ہے کہ ان کی اجل قریب ہی آ پہنچی ہو، پھر قرآن کے بعد کون سی بات پر یہ لوگ ایمان لائیں گے؟ (الاعراف:150) اور ان کے علاوہ آیتیں جن میں اللہ کی صنعت و خلاقی و تدبیر کے بارے میں غور و فکر اور تدبر پر ابھارا گیا ہے۔ جو علماء اسلام کے لیے کائنات کے ساتھ حسن تعامل اور عالم اشیاء کی طرف بلیغ انداز میں کان لگانے کا باعث تھیں۔ جاحظ اپنی کتاب 'الحیوان' میں کتے پر کلام کرنے اور کتے اور مرغ کی گفتگو نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے: ''ہم نے یہ کلام اس وجہ سے نہیں کیا کہ ان کی گفتگو کو اہمیت دیتے ہیں، بلکہ ہمیں معلوم بھی نہیں کہ سونے اور چاندی میں ان کی کیا قیمت ہوگی یا لوگوں میں ان کی کیا قدر ہے، بلکہ ہم تو ان کے اندر اللہ تعالیٰ کی کاریگری، صناعی اور اس کے نظم عجیب اور حکمت لطیفہ کو دیکھتے ہیں (الحیوان، تحقیق عبدالسلام ہارون، (بیروت: دار الجیل 1416ھ، 1996، 2/109)۔

**ثانیاً: التسخیر** : (یعنی منصبی رشتہ) (تسخیر کا لغوی مفہوم ہے: غرض مختص کے لیے زبردستی کھینچنا، اور مسخر وہ ہوگا جس کے حوالہ یہ کام کیا گیا ہو، المفردات فی غریب القرآن، صفحہ 227۔ قرآن تسخیر کے ساتھ دو اصطلاحیں اور استعمال کرتا ہے اور وہ یہ ہیں: التذلیل: جیسا کہ فرمایا: ھوالذی جعل لکم الارض ذلولا: وہ ذات جس نے تمہارے لیے زمین کو پست و مسطح کر دیا تا کہ تم اس کی راہوں میں چلتے پھرتے رہو اور اللہ کی روزیاں کھاؤ (پیو) اسی کی طرف (تمہیں) جی کر اٹھ کھڑا ہونا ہے (الملک:15) اور تمکین: جیسا کہ فرمایا: ولقد مکنا کم فی الارض: اور بے شک ہم نے تم کو زمین پر رہنے کی جگہ دی

اور ہم نے تمہارے لیے اس میں سامان رزق پیدا کیا،تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو(الاعراف:10) کائنات اور انسان کے مابین رشتہ میں یہ اصل ثانی ہے۔تو اگر اسلامی نقطۂ نظر سے اصل، غایت اور انجام کار میں انسان اور کائنات کے درمیان وحدت ہوگی تو اس وحدت کے دائرہ میں انسان کو ایک خاص قدر والا امتیاز عطا ہوا ہے۔ جو اللہ کا کائنات کو انسان کے فائدہ کے لیے مسخر کرنا ہے۔اِس طور پر کہ وہ زمین کا خلیفہ ہے اور کائنات کا فرض یہ ہے کہ انسان کے لیے مسخر ہو جائے تا کہ انسان کائنات میں اپنا تہذیبی فرض ادا کر سکے جس کے لیے اس کا اسٹیج سجایا گیا ہے۔اور وہ اللہ کے امر و نہی کے اور اس کے قوانین ثابتہ اور سنت کے مطابق تعمیر ارضی ہے۔جیسا کہ فرمایا:اللہ الذی خلق السماوات: اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور آسمانوں سے بارش برسا کر اس کے ذریعہ سے تمہاری روزی کے لیے پھل نکالے ہیں اور کشتیوں کو تمہارے بس میں کر دیا ہے کہ دریاؤں میں اس کے حکم سے چلیں پھریں، اسی نے ندیاں اور نہریں تمہارے اختیار میں کر دی ہیں (ابراہیم:32) تو یہ آیت کریمہ اور اس جیسی دوسری آیات یہ بتاتی ہیں کہ پوری کائنات مع اپنی اشیاء کے اہم ہے اور اس صانع تعالیٰ نے اس کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ جتنا انسان کے لیے ضروری ہے اس کے مطابق اس کے لیے مسخر ہے اور جتنی انسان اپنی طاقتیں اور صلاحیتیں اس میں لگاتا ہے اتنی ہی وہ اسے نوازتی ہے۔'' چنانچہ آسمانوں کے سورج، چاند، ستارے اور بادل اور زمین کے جانور، چوپائے اور شجر و حجر اور پانی اور سمندر اور کشتیاں سب منافع تمہارے فائدوں، مصالح، غذاء اور روزی اور مسکن کے لیے مہیا ہیں۔ان میں سے بعض کے تم مالک بنتے ہو اور سب سے فائدہ اٹھاتے ہو' (تفسیر الطبری 78-1/77) تسخیر کا یہ اصول انسان اور کائنات کے رشتہ کو مضبوط کرتا ہے اور اپنی اساس میں تین باتوں کو ظاہر کرتا ہے:

☆ یہ کہ فی الحقیقت کائنات میں انسان کسی چیز کا مالک نہیں ہے وہ اس کا امین اور اللہ کی طرف سے اس کا وکیل ہے جو کہ کل کائنات کا مالک حقیقی ہے۔یہی اللہ کے قول: وللہ ملک السماوات: آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے (آل عمران:189) اور آمنوا باللہ: اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ اور اس مال میں سے خرچ

کروجس میں اللہ نے تمہیں (دوسروں کا) جانشین بنایا ہے پس تم میں سے جو ایمان لائیں اور خیرات کریں انہیں بہت بڑا ثواب ملے گا (الحدید:7) سے ثابت ہوتا ہے یعنی کائنات میں ہونے والا ہر انفاق اس چیز میں انفاق ہے جو اللہ نے بندہ کو دی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اس کائنات کا مالک نہیں بلکہ کائنات کے اندر اسے سرداری ملی ہے اور یہ سرداری اللہ کی ایک نعمت ہے جو کائنات کے مالک حقیقی نے اس کو دی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے۔ اور یہ اللہ کا انسان کے ساتھ فضل ہے جو تہذیبی جدوجہد میں مدد کر کے اس کی تکریم اور تعمیرِ کائنات کے لیے استخلاف کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے لائق بناتا ہے اور خالق کائنات کی عبودیت کا سزاوار بناتا ہے۔ اس لیے اسلام پورے اطمینان واعتماد سے مغربی اندازِ نظر کے انسان اور کائنات کے رشتہ کی نفی کرتا ہے، جس کی اساس یہ ہے کہ انسان اس کا مالک ہے اور فطرت انسان کی غلام ہے نہ کہ اس کی ماں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زمین مرنے لگی ہے!! کیونکہ زندگی میں اس کی ترکتاز یا تو فطرت پر حملہ اور غلبہ پانے کی کوشش بن گئی یا زمین پر بے لگام مادیت کے پیچھے بھاگنے کی صورت میں نکلا (عودة الوفاق بین الانسان والطبیعۃ ص105) اللہ کا زمین کو مسخر کرنا انسان کے لیے مفت کا سودا نہیں کہ انسان بغیر کسی کوشش اور جدوجہد کے کائنات کی اشیاء اور عطیات سے فائدہ اٹھالے بلکہ وہ اسی تسخیر سے جو زیادہ تر انسان کی اپنی حرکت وسعی سے مربوط ہے کہ وہ زمین کے ساتھ کسی طرح کا معاملہ کرتا ہے، تو جیسی کوشش وہ کرے گا ویسا ہی بدلہ پائے گا۔ اس لیے ان اصولوں میں سے جس پر مسلمان کی پرورش ہوئی کہ زمین کی اللہ کے منہج کے مطابق تعمیر وبناء ایک مسلمان کے لیے عبادت واجبہ ہے۔ جس کا کرنا اس کے لیے ضروری ہے اور جس پر اس کو اجر ملے گا اور جس کے ترک کرنے پر وہ گنہ گار ہوگا۔ یہی اس استخلاف کا مفہوم ہے جو بیان ہوا ہے: ھوالذی جعل لکم الارض: وہ ذات جس نے تمہارے لیے زمین کو پست و مسطح کر دیا تا کہ تم اس کی راہوں میں چلتے پھرتے رہو اور اللہ کی روزیاں کھاؤ (پیو) اسی کی طرف (تمہیں) جی کر اٹھ کھڑا ہونا ہے (الملک: 15) میں۔ تو اللہ کا یہ قول فامشوافی منا کبہا: (تم اس کی راہوں میں چلتے پھرتے رہو) ایک مسلسل کام کی دعوت

ہےاورزمین کےخزانوں اورعطیات سے استفادہ کی ایک دائمی جدجہد کی دعوت ہے۔

اس تصور کے مطابق جوانسان زمین کےخزانوں کودریافت نہ کرے اوراس کی توانائیوں کا استعمال نہ کرے وہ اللہ کا نافرمان سمجھا جائے گا۔اوراُس وظیفہ سے پہلوتہی کرنے والاجس کے لیے اللہ نے اسے پیدا کیااوراللہ نے انسان کوجوروزی دی ہےجس کے بارے میں قیامت میں اُس سے پوچھ گچھ ہوگی اُس کومعطل کرنے والا سمجھا جائے گا۔چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ قیامت میں بندے کولایا جائے گاتواللہ تعالیٰ اُس سے پوچھے گا کہ کیا میں نے تجھ کوکان آنکھ مال اوراولادنہیں دی تھی اور تیرے لیے چوپائے اورکھیت مسخرنہیں کیے تھےاور تجھے چھوڑا کہ ملکیت رکھتااورغنیمت میں حصہ دار بنتا تھا۔کیاتو یہ سمجھتا تھا کہ آج کے دن مجھ سے ملاقات نہیں کرے گا؟وہ کہے گانہیں،تواللہ فرمائے گا:تو آج میں تجھ کوبھول جاؤں گاجس طرح تو مجھے بھول گیا تھا(ترمذی 4/619حدیث نمبر2428 انہوں نے کہا کہ یہ حدیث صحیح غریب ہے۔اس میں لفظ ربع کا مطلب ہےغنیمت کا چوتھائی کہ جاہلیت میں بادشاہ چوتھائی لے لیا کرتا تھاجس کو مرباع کہتے تھے۔ایک روایت میں ترتع کالفظ آیاہےجس کامفہوم ہوگاتنعم(عیش کرنا)اس سےملتی جلتی روایت امام مسلم نے بیان کی ہے،کتاب الزہد والرقائق 4/2279حدیث نمبر2968)اس میں اس کا اشارہ ہے کہ جوچیزیں اللہ نے مسخر کی ہیں ان سے فائدہ اٹھانے میں کوتاہی کرنا بھی لقائے ربی کی تکذیب ہےاوراس کی وحدانیت کی راہ نہ پانا ہے!!اسی وجہ سےتوعمر بن الخطابؓ کہتے ہیں:”تم میں کوئی آدمی روزی کی طلب سے غافل نہ بیٹھے اور پھر یہ دعا کرے اے اللہ مجھے روزی عطا فرما،کہ تم جانتے ہوکہ آسمان سے سونے چاندی کی بارش نہیں ہوا کرتی(احیاءعلوم الدین 2/62)اس سلسلہ میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ:عبادت یہ نہیں کہ تم نماز کے لیے کھڑے ہوجاؤاورکوئی دوسراتمہارے لیے روزی کمائے،نہیں پہلے اپنی روزی کا انتظام کروپھرعبادت کرو(وہی مصدر)۔

☆یہ تسخیر مطلق نہیں ہے کہ کائنات میں انسان کا ہاتھ بغیرکسی ضابطہ کےآزادہو،بلکہ یہ ایسی تسخیر ہے جوواجبات سے مقید ہے اورانسان کواس بات کا پابند بناتی ہے کہ وہ زندگی کی تعمیر کرے۔اورکائنات میں فائدہ اٹھانے اورفائدہ پہنچانے کے لیے سرگرم ہو،اللہ نے اس کے لیے جوچیزیں

مسخر کردی ہیں ان کو امر خلافت کی انجام دہی کے لیے استعمال کرے۔ کائنات میں مسخر کردہ چیزوں کو اللہ کے منہاج کے مطابق استعمال نہ کرنے کا نتیجہ اتلاف اور فساد ہے، خدا کی نافرمانی اور مسخرات کو غصب کرنا شمار ہوگا!! یعنی تسخیر اس مفہوم میں خود ایک اصول ہے جو انسان کے کائنات کے ساتھ رشتہ وتعامل کو منضبط کرتا ہے اور اسے پابند بناتا ہے کہ اس میں اس کو اگر چاہے تو کسی بھی لحہ انسان سے چھین سکتا ہے۔

**ولله مافی السماوات:** آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے، تم سے پہلے جن کو ہم نے کتاب دی تھی انہیں بھی یہی ہدایت کی تھی اور اب تم کو بھی یہی ہدایت کرتے ہیں کہ خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو، لیکن اگر تم نہیں مانتے تو نہ مانو، آسمان وزمین کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہی ہے اور وہ بے نیاز ہے، ہر تعریف کا مستحق۔ ہاں اللہ ہی مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اور کارسازی کے لیے بس وہی کافی ہے، اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو ہٹا کر تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے، اور وہ اس کی پوری قدرت رکھتا ہے جو شخص محض ثوابِ دنیا کا طالب ہو اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے پاس ثوابِ دنیا بھی ہے اور ثواب آخرت بھی اور اللہ سمیع وبصیر ہے (النساء:133-131) تو انسان پر واجب ہے کہ وہ اشیاء کائنات کے ساتھ معاملہ کرنے میں اللہ کے منہج کا التزام کرے اور وہ یوں ہوسکتا ہے کہ ''تصورات کے اس نظام پر عمل پیرا ہو جو ماحول اور اشیاء سے تعامل کے لیے ضابطہ ہے اور ان سے کیفیت استفادہ کو بتاتا ہے۔ یہ نظام فکر کئی تصورات کو شامل ہے مثال کے طور پر توحید، خلافت، امانت، حلال وحرام اور عدل واعتدال کو۔ اور وہ اس ایمان کے ساتھ ہوگا کہ یہ مسخرات اللہ کی مخلوقات ہیں، اللہ کی تسبیح بیان کرتی اور اس کی عبادت کرتی ہیں اور انسانی قوتوں کی طرح ان کی بھی قومیں ہیں۔ اسی وجہ سے انسان کو ان کے حقوق کا بھی خیال رکھنا ہے۔ یہ ایک پہلو سے اخلاقی حکم ہے تو دوسرے پہلو سے شرعی حکم (نصر محمد عارف: نظریات التنمية السياسية المعاصرة ص40) ثالثا: کائنات ایک امانت ہے یعنی انسان اور کائنات میں استفادہ کا رشتہ ہے (لغویوں کی اصطلاح میں ارتفاق کے دو معنی ہیں رفق اور انتفاع جیسا کہ لسان العرب میں مادہ رف ق کے تحت ہے۔ اور مقاييس اللغة لابن فارس 2/418 میں ہے کہ یہ مادہ اصل واحد ہے جو موافقت اور آسانی سے مان لینے پر دلالت کرتا ہے۔ یوں ارتفاقی رشتہ وہ ضابطہ

بنتا ہے جس کی رو سے انسان کائنات کے ساتھ اسلامی نقطۂ نظر سے تعامل کرے گا کہ اس کی توانائیوں سے فائدہ اٹھائے اور اشیاء کائنات کے نرمی برتتے اور ان کو فاسد نہ ہونے دے۔ دیکھیں: الشہود الحضاری للامۃ الاسلامیہ، فقہ التحضر ،1/127)

یہ جامع اصلِ اصول ہے جو مسلمان کی ہرتگ ودو اور زندگی و زندوں سے اس کے تعامل میں کارفرما ہوتا ہے اور اسلامی نقطہ نظر سے انسان اور انسان کے رشتہ کو منضبط کرتا ہے، کہ اللہ نے کائنات کو اس کے لیے مسخر کیا ہے۔ اس کو اس کا خلیفہ اور امین بنایا ہے۔ یوں تسخیر اور خلافت کے تصور کے مطابق انسان اور کائنات میں جوہری رشتہ مالک و مملوک کا نہیں بلکہ امین اور امانت کا رشتہ ہے۔

اور کائنات کو امانت جاننا ایسا تصور ہے جس کے وحی یعنی قرآن وسنت پر مبنی اپنے معانی ومضمرات ہیں۔ اور مادی واخلاقی طور پر کائنات کی اشیاء وموجودات کے بارے میں انسان کو بعض چیزوں کا التزام کرنا ہوتا ہے۔ اور حرکتِ حیات میں یہ تصور ایک تہذیبی شعور کا اضافہ کرتا ہے۔ جس کی رو سے مسلمان سے صرف یہی مطلوب نہیں ہے کہ وہ اپنے نظریہ اور اسکیم میں کائنات کا نگراں بنے بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ حال و مستقبل میں کائنات کی امانت کا فریضہ انجام دے۔ اور غالبا وہ حدیث جس میں کہا گیا ہے کہ ''اگر قیامت آجائے اور تم میں کسی کے ہاتھ میں پودہ ہو تو جلد سے جلد اس کو لگا دے (اس کی تخریج گزر چکی ہے) اس بات کی بہترین دلیل ہے کہ کائنات کے مستقبل کی باگیں انسان کے ہاتھ میں دے دی گئی ہیں۔

امام مناوی اس حدیث کی شرح میں یہ ذکر کرنے کے بعد کہ بعض بڑے ائمہ پر اس کی حکمت مخفی رہ گئی لکھتے ہیں:

''حاصل اس کا یہ ہے کہ اس بڑی شدت وتاکید سے شجرکاری اور نہریں کھودنے پر ابھارا گیا ہے۔ تاکہ زمین اپنی اس آخری مدت تک شاد وآباد رہے جو خالق ارض وسما کو معلوم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح تم نے اپنے سے پہلوؤں کے بونے سے فائدہ اٹھایا تم بھی اپنے سے بعد والوں کے لیے بو کر جاؤ اگر دنیا میں بہت معمولی چیز رہ جائے تب بھی (حدیث میں لفظ صبابۃ آیا ہے جس کا مفہوم ہے بہت معمولی جس پر کوئی نظر بھی نہ ڈالے، فیض القدیر 2/3)۔

کائنات کی امانت کا تصور اپنی اسلامی اساس میں جس میں حفظ حقوق اور پاس داریٔ اخلاق ہوگی تین اہم اور بنیادی ابعاد رکھتا ہے۔ یہ تینوں ایسے اصولوں کی ترجمانی کرتے ہیں جو اس عالم کے لیے زیبا ہیں جو اللہ کی طرف سے آیا، اُس کی منزل بھی اللہ ہے اور آخر کار اسی کی طرف اسے لوٹنا ہے۔ یہ ابعاد درج ذیل ہیں:

☆ کائنات کی چیزوں اور اشیاء کے ساتھ مثبت معاملہ: یعنی ایسا معاملہ جس میں اخلاقی قدروں کا حصہ کافی بڑا ہوگا جو انسان کو اس کی امانت میں دی گئی کائنات اور اس کی اشیاء سے تعامل کے لیے انسان کی رہنمائی کریں گی کہ وہ ان کے ساتھ نرمی برتے اور فساد سے ان کو بچائے۔ اور قہر و کشمکش کے ہر ایک زاویہ سے دور ہو' ۔ اس طرح کہ بے حرمتی اور لاپروائی کا شائبہ بھی نہ پایا جائے۔ اسی طرح انانیت، ترجیح، بغض و تسلط اور حقارت جیسی چیزیں بھی نہ ہوں (عبدالمجید النجار، قضایا البیئۃ من منظور اسلامی ص197)۔

یہ ایجابی تعامل تقاضا کرتا ہے "نفع بخش نتیجہ خیزی کا اور بہتر عمل کا جو کہ اسلام میں تمام تر تہذیبی سرگرمیوں کی بنیاد بنتے ہیں اور اس بارے میں اسلام کا قاعدہ کلیہ فرمان الٰہی: **ولاتفسدوا فی الارض**: اور دنیا میں اس کے بعد کہ اس کی درستگی کر دی گئی ہے فساد مت پھیلاؤ اور تم اللہ کی عبادت کرو اس سے ڈرتے ہوئے اور امیدوار رہتے ہوئے، بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک کام کرنے والوں کے نزدیک ہے (الاعراف: 56) ہے اور اس کا قول **واصلح ولاتتبع**: میرے بعد ان کا انتظام رکھنا اور اصلاح کرتے رہنا اور بدنظم لوگوں کی رائے پر عمل مت کرنا (الاعراف:142) ہے۔ اور کائنات کی چیزوں اور اشیاء کے ساتھ مثبت معاملہ کے سیاق میں:

☆ اسلام نے اس کو ممنوع قرار دیا ہے کہ کائنات کے کسی بھی سرمایہ کو معطل کیا جائے اور اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے، ان سرمایوں کے معطل کرنے یا ان سے اہمال برتنے کو اسلام نے کفرانِ نعمت شمار کیا ہے، چنانچہ اہل جاہلیت نے جو لباس اور کھانے حرام کر لیے تھے ان کے زعم باطل کا ابطال کرتے ہوئے فرمایا: **قل من حرم زینة الله**: آپ فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے اسباب زینت کو، جن کو اس نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہے اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس نے حرام

کیا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ یہ اشیاء اس طور پر کہ قیامت کے روز خالص ہوں گی اہل ایمان کے لیے ، دنیوی زندگی میں مومنوں کے لیے بھی ہیں ، ہم اسی طرح تمام آیات کو سمجھ داروں کے واسطے صاف صاف بیان کرتے ہیں (الاعراف:32)۔

☆اسلام نے زمین کا مالک اس کو بنایا جو اس میں کھیتی کرے اور اس کو منفعت بخش بنائے ۔اسی کو فقہ اسلامی میں ''احیاء الموات'' کہا جاتا ہے ۔یعنی زمین کی خدمت اور اس کی تعمیر ، صحیح بخاری میں آیا ہے : باب من احیا ارضا مواتا۔حضرت علیؓ نے کوفہ میں غیر آباد پڑی زمین کو موات قرار دیا۔اور عمرؓ نے فرمایا: جس نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا تو وہ اسی کی ہوگی ، یہ قول بروایت عمرو بن عوف نبی ﷺ سے بھی مروی ہے (صحیح البخاری ،2/823) ابن حجر کہتے ہیں: موات وہ زمین ہے جس کو آباد نہیں کیا گیا ، عمارۃ کو یہاں زندگی سے تشبیہ دی گئی ہے۔اور اس کے معطل کرنے کو فقدان حیات سے اور احیاء موات یہ ہے کہ ایسی زمین جس پر کسی کی ملکیت نہ ہو اُس کو کوئی زندہ کرے یعنی اس کو سیراب کرے ، کھیتی کرے ، اس میں پودے لگائے یا اس میں تعمیر کرے اور وہ اس کی ملکیت بن جائے ، چاہے وہ آبادی سے قریب ہو یا دور ہو۔اور چاہے امام نے اس کو اجازت دی ہو یا نہ دی ہو۔یہی جمہور کا قول ہے (فتح الباری 2/822) اس بارے میں امام ابن حزم کہتے ہیں: جس زمین کا مالک نہ ہو اور نہ یہ پتہ چلے کہ اسلام میں اس کو آباد کیا گیا تھا تو وہ اس شخص کی ہوگی جو اس کی طرف سبقت کرے گا اور اسے زندہ کرے گا (المحلی (بیروت ، دار الآفاق الجدیدۃ 8/233)۔

☆زمین کے خزانوں کو معطل رکھنے یا اہمال برتنے پر اسلام نے جائز قرار دیا کہ زمین اس کے مالک سے لے لی جائے ، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جس کے پاس زمین ہے تو وہ اس کو بوئے اور اگر نہیں بوتا ہے تو اس کا بھائی اسے بوئے گا (متفق علیہ الفاظ مسلم کے ہیں ، کتاب البیوع باب کراء الارض ، 3/1176 حدیث نمبر :1536 اور صحیح البخاری ، کتاب الھبہ باب فضل المنیحۃ 2/927 حدیث نمبر :2489) یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت بلال بن الحارث کو ایک زمین دی تھی ، انہوں نے اس پر قبضہ

توکرلیا مگر اس کو آباد نہیں کیا جب حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ آیا تو انہوں نے بلالؓ کو بلا کر کہا کہ تم نے رسول اللہ ﷺ سے ایک لمبی چوڑی زمین کی فرمائش کی تھی جو آپؐ نے تم کو دیدی تھی کہ رسول اللہ کسی چیز سے انکار نہیں فرماتے تھے۔ لیکن تم اسی کی طاقت نہیں رکھتے، بلال نے کہا جی ہاں، ایسا ہی ہے۔ عمرؓ نے کہا: تو دیکھو اس میں سے جتنی تم کر سکتے ہو وہ روک لو باقی ہمیں دیدو، ہم اس کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیں گے۔ انہوں نے کہا نہیں، میں تو نہیں کروں گا وہ زمین تو مجھے اللہ کے رسول نے دی ہے۔ عمرؓ نے کہا نہیں، تمہیں کرنا پڑے گا چنانچہ اس زمین میں سے جتنی وہ آباد نہیں کر پا رہے تھے وہ ان سے لے کر مسلمانوں میں تقسیم کر دی (یحی بن آدم القرشی، الخراج، طبع اول، لاہور پاکستان: المکتبۃ العلمیہ 1974 ص 110)۔

☆ اور اس وجہ سے اسلام نے ''حمی'' بنانے سے منع کیا یعنی زمین کو قوت کے ذریعہ حاصل کرنا اور اُسے جمع کر کے رکھنا مگر اس کے احیا اور ثمر خیز بنانے کی کوئی جدوجہد نہ کرنا۔ چنانچہ اللہ کے رسول سے حمی کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: حمی صرف اللہ ورسول کے لیے ہے (مسند احمد 2/24 حدیث نمبر: 4769) ایک حدیث میں بڑے مؤثر انداز میں ہر اس کام سے روکا گیا ہے جس سے زمین کی نمو رکے اور اس کے خزانے معطل ہو جائیں۔ عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے گھوڑوں اور جانوروں کو خصی کرنے سے روکا ہے۔ ابن عمرؓ کہتے ہیں خصی نہ کرنے سے مخلوق میں بڑھوتری ہوتی ہے (مسلم کتاب الاضاحی باب جواز استتباعہ غیرہ الی دار من یثق برضاہ بذلک 3/1609 حدیث نمبر: 2038) اسی وجہ سے آپؐ نے اپنے میزبان انصاری سے فرمایا تھا جو جانور کو ذبح کرنے جا رہے تھے کہ: خبردار دودھ دینے والی بکری ذبح نہ کرنا (محمد باقر صدر، اقتصادنا صفحہ 655 عبدالمجید النجار، مقاصد الشریعہ بابعاد جدیدۃ، طبع اول بیروت دار الغرب الاسلامی، 2006 ص 231 یوسف القرضاوی، دور القیم والاخلاق فی الاقتصاد الاسلامی، (القاہرہ، مکتبہ وہبہ 1415ھ 1995 ص 161) کیونکہ دودھ کے انقطاع سے نقصان ہوگا حالانکہ دودھ نہ دینے والی بکری اس کی جگہ لے سکتی ہے۔'' اس سب میں یہ دلیل ہے کہ کائنات کی اشیاء کے ایجابی کردار کو معطل کرنا جائز نہیں۔ بلکہ ان اشیاء کو ایک قوی عامل بنانا چاہیے جس سے انسان کی نگاہ و زندگی کی آسانیاں جاری رہیں۔ تو اگر حق خاص اس کردار کو ادا نہ کرنے دے تو الغاء کرنا ہوگا جس سے

اس کی پیداوار بڑھے۔

## ☆نگرانی اوراس کی انسان کے لیے تسخیر کردہ کائنات سے رشتہ کی تنظیم کے لیے ضرورت

امانت کائنات کے تصور میں یہ دوسرا بُعد ہے کہ انسان کا کائنات اور عالم اشیاء کے ساتھ جو تعلق ہے وہ قوامہ ( نگہ بانی ) کا تصور ہے ۔قوامہ وہ اسلامی تصور ہے جو اپنی بنا میں ایسے آداب پر دلالت کرتا ہے جو نگہ بانی وذمہ داری ،تحفظ واصلاح اور ہدم وتخریب کے عناصر سے بچاؤ پر مبنی ہیں (لسان العرب،مادہ قوم) اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: الرجال قوامون علی النساء: مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں اس وجہ سے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں (النساء:34) جس کی تفسیر میں ابن عطیہ کہتے ہیں: قوّام بروزن فعال قیام سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور جس کا مفہوم ہے کسی چیز کی نگہ بانی ،اس پر غور وفکر اور کوشش کے ذریعہ اس کی حفاظت (المحرر الوجیز 2/47) قوامہ کے اس مفہوم کے ساتھ مسلمان کائنات کا قیّم ہونے کی حیثیت سے ان اصولوں وقدروں سے بندھا ہوا ہے جو انسانی فطرت سے مشتق ہیں۔ اور اس کے خیر ہونے کو بتاتی ہیں۔اور اس کی درج ذیل طریقوں سے تحدید ہوتی ہے۔

☆**رفق ورحمت:** کہ اسلامی نقطۂ نظر سے باہمی رحمت صرف انسان اور انسان کے درمیان نہیں ہوتی بلکہ انسانوں اور اشیاء کے مابین بھی ہوتی ہے۔ بایں طور کہ انسان کا اخلاقی تعامل کائنات کے ساتھ غایت رحمت کے ساتھ ہو،ایسی رحمت جو انسان دوسرے انسان کے ساتھ برتتا ہے۔ اور جو اپنی نوعیت و قیمت میں صرف وجود کی قدر و قیمت اور وحدتِ اصل کے احترام کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ اس لیے بھی ہے کہ کائنات ہمیں برابر ہی رحمت دیتی ہے اور اس نے اپنی عطاء وبخشش سے ہمیں ڈھانپ رکھا ہے!!

اور اسی بارے میں اسلام کا قاعدہ کلیہ اللہ کے نبی ﷺ کا یہ قول ہے کہ ''رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے تم زمین کی مخلوقات پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا (اس کی تخریج گزر چکی)

علامہ مناوی کہتے ہیں: یہ قول صیغہ عموم کے ساتھ تمام تر مخلوقات کو شامل ہے جن میں نیک و بد، ناطق غیر ناطق، جانور اور پرندے سب آ جاتے ہیں (فیض القدیر 1/473) اسی سیاق میں وہ حدیث آتی ہے جس میں عبدالرحمٰن بن عبداللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں جو کہتے ہیں کہ: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے، آپؐ کسی ضرورت سے نکلے ہم نے ایک پرندہ کو دیکھا جس کے ساتھ دو بچے تھے تو ہم نے اس کے بچوں کو لے لیا وہ چڑیا آئی اور زمین میں لوٹنے لگی، آپؐ نے پوچھا کس نے اس کے بچوں کے بارے میں اسے تکلیف دی؟ اس کے بچوں کو اسے لوٹا دو۔ اور آپؐ نے چونٹیوں کے گھروں کو دیکھا جن کو ہم نے جلا دیا تھا تو پوچھا کہ کس نے ان کو جلا دیا ہے؟ ہم نے بتایا کہ ہم نے جلایا ہے، تو فرمایا: آگ سے صرف آگ کے رب کو ہی سزا دینے کا حق ہے (سنن ابی داؤد 3/55 حدیث نمبر: 2675) اسی لیے ہمارے علماء کہتے ہیں کہ جانوروں کے ساتھ سواری اور بوجھ لادنے میں رحم کا برتاؤ کرنا چاہیے اور یہی چیز دوسرے جانوروں کے ساتھ بھی واجب ہے۔ جزا و سزا کے اعتبار سے یہ اہم مسئلہ ہے کہ جانوروں پر ان کی استطاعت سے زیادہ بوجھ لادنے وغیرہ چیزوں میں دلوں سے رحم نکل جاتا ہے (الشیخ عبدالحی الکتانی، التراتیب الاداریہ لنظام الحکومۃ النبویۃ 153-3/152)۔

☆ حفاظت وحمایت: کائنات میں انسان کی قوامت کا اقتضاء یہ ہے کہ کائنات کی اشیاء کو بڑھانے، اس کے منافع کو عام کرنے، اس کی حفاظت اور کائنات کی اشیاء کو نقصان دینے والی ہر چیز اور اس کی توانائیوں کی بے حرمتی اور اس کے منافع کو ختم کرنے والے عناصر سے بچانے کی پوری کوشش کی جائے۔ اسی وجہ سے علماء اسلام کہتے ہیں کہ: شریعت کے مقاصد میں سے یہ بھی ہے کہ نظامِ عالم کی حفاظت ہو اور اس میں لوگوں کے تصرف کو اس اسلوب میں منضبط کیا جائے کہ فساد و ہلاکت سے بچا رہے (الشیخ طاہر بن عاشور، مقاصد الشریعہ الاسلامیہ ص230) اسی وجہ سے اسلام نے کائنات ترقی دینے اور اس میں اپنا حصہ ڈالنے کو بہت بڑی عبادت قرار دیا ہے۔ جس سے انسان کو اس وقت بھی دست بردار نہ ہونا چاہیے جب قیامت قائم ہو رہی ہو جیسا کہ فرمایا: اگر قیامت کھڑی ہو رہی ہو اور تم ہی سے کسی کے ہاتھ میں کوئی پودہ ہو جس کو وہ لگانے جا رہا ہے۔ تو جلد از جلد اسے لگا دے (اس کی تخریج گزر چکی ہے) اسی

طرح اسلام نے راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹانے کو صدقہ اور عبادت اور ایمان کا ایک شعبہ قرار دیا ہے (کتاب الایمان، باب بیان شعب الایمان 1/63 حدیث نمبر:35) جیسا کہ مسلم کی روایت ہے جو ابوہریرہؓ سے مروی ہے: ایمان کے ستر سے زائد شعبے ہیں ان میں سب سے افضل لا الٰہ کہنا ہے اور سب سے کم تر درجہ یہ ہے کہ راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹا دیا جائے۔ یہ حدیثیں اس فقہ کی بنیاد بنتی ہیں جو اللہ کی نعمتوں کے ساتھ بہتر معاملہ اور ان کی حفاظت کی حریص ہو اور اس بارہ میں بہترین رہنمائی کرنے والی وہ حدیث بھی جوام المومنین عائشہؓ سے مروی ہے (طبرانی المعجم الاوسط، 6/293 حدیث نمبر:6457 اس حدیث کے اور طرق بھی ہیں جن کو امام عجلونی نے کشف الخفاء 1/280 میں ذکر کیا ہے) کہ انہوں نے کہا: ایک دن رسول اللہ ﷺ آئے، آپ نے روٹی کا ایک ٹکڑا زمین پر پڑا دیکھا، آپ اس کی طرف گئے اس کو اٹھا کر صاف کیا پھر اس کو تناول کیا اور فرمایا: اے عائشہؓ اللہ کی نعمتوں کی قدردانی کرو کیونکہ اگر وہ کسی خاندان سے منہ پھیر لیتی ہیں تو کم ہی اس کی طرف آتی ہیں۔ اور آپؐ نے ارشاد فرمایا جیسا کہ کہ حضرت انسؓ کہتے ہیں: اگر تم میں سے کسی کا لقمہ نیچے گر جائے تو اُس سے گندگی کو ہٹا کر کھالے اور اُسے شیطان کے لیے نہ چھوڑ دے اور آپ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم پیالہ کو اچھی طرح صاف کیا کریں اور فرمایا: تم نہیں جانتے کہ کس لقمہ میں برکت ہے: (صحیح مسلم کتاب الاشربہ، حدیث نمبر:2033) تو یہ اور ان جیسی احادیث بتاتی ہیں کہ اللہ کی نعمتوں کی قدردانی، ان کی تنظیم، ان پر خوب شکر ادا کرنا اور چھوٹا سمجھ کر ان کو نہ پھینکنا واجب ہے کیونکہ یوں ہی پھینکنا کفرانِ نعمت ہے اور کفرانِ نعمت نہایت ناپسندیدہ ہے اور اس سے نعمتیں چھین لی جاتی ہیں۔ یعنی نعمتیں شکر کرنے سے جاری رہتی اور کفران نعمت سے زائل ہو جاتی ہیں اور ان کی عظمت کرے گا تو وہ ان کا شکر ادا کرے گا اور جو ان کی تحقیر کرے گا اس سے وہ زائل ہو جائیں گی (الحکیم الترمذی نوادر الاصول فی احادیث الرسول، تحقیق: عبدالرحمٰن عمیرہ، بیروت: دار الجیل 1992، 2/264)۔

کائنات اور اس کی اشیاء کی حفاظت اس عظیم اصلاحی اصول کے مطابق ہے جو لا ضرر ولا ضرار (نہ نقصان پہنچاؤ اور نہ خود نقصان اٹھاؤ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور جس سے متفرع ہونے والے قاعدے یہ ہیں:

۱۔جتنا ممکن ہوگا ضرر کا ازالہ کیا جائے گا۔

۲۔ضرر عام کے دفعیہ کے لیے ضرر خاص کو برداشت کرلیا جائے گا۔

۳۔مصالح کے حصول پر مفاسد کو دور کرنا مقدم ہے۔

۴۔ضرر کا ازالہ ضرر سے نہیں کیا جائے گا۔

۵۔دوضرروں میں جو زیادہ ہلکا ہوگا اس کا ارتکاب کرلیا جائے گا۔

۶۔اور جو چیز کسی عذر کی وجہ سے جائز ہو جائے وہ عذر کے زائل ہونے کے بعد ناجائز ہو جائیگی۔

یہ اصول زندگی میں مسلمان کی تمام سرگرمیوں کو منضبط کرتا ہے اور تمام تنوعوں وتوسیعوں میں کام آتا ہے۔کوئی بھی میدان اس سے مستثنیٰ نہیں بچتا۔اور کائنات کے ساتھ تعامل میں ان سے وہ اصول وقواعد نکلتے ہیں جن کی پابندی اور عمل درامد کرنا کائنات میں انسان کی زندگی کو مؤثر، بامعنی اور بابصیرت بنانے کے لیے ضروری ہوتا ہے اور ان میں سے یہ ہے کہ:

☆اسلام نے مال کو ضائع کرنے سے روکا ہے۔کہ اضاعتِ مال اشیاء کائنات سے غفلت برتنا اور ان کا تحفظ نہ کرنے پر دلالت کرتی ہے۔چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے تمہارے اوپر ماؤوں کی نافرمانی ،لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا اور نشیبی زمینوں کو روکنا اور قیل وقال اور کثرتِ سوال سے اور اضاعتِ مال کو حرام کردیا ہے (صحیح البخاری کتاب الادب باب عقوق الوالدین 20/848 حدیث نمبر:2277) اضاعتِ مال کی تفسیر میں سب سے واضح بات یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی کی ملکیت میں جو مال ہو وہ اس کی اچھی دیکھ بھال نہ کرے اور وہ ضائع ہوجائے یا وہ اُسے چھوڑ دے تو وہ خراب ہوجائے یا اس کو غلط جگہ میں رکھ دے (ملاحظہ ہو:الامام العینی،عمدۃ القاری،9/61) اور حضرت عمرؓ ہمیشہ توجہ دلاتے جس کو فقہِ تہذیبی کا زریں اصول کہ سکتے ہیں کہ: اصلاح کے ساتھ کوئی چیز کم نہیں ہوتی اور فساد کے ساتھ کوئی چیز باقی نہیں رہتی (ابن رشد،البیان والتحصیل:17/598) امام الطاہر بن عاشور امت کے مالوں کی حفاظت اور کھلواڑ سے اسے بچانے کے وجوب کی حکمت یہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مقصد شرعی یہ ہے کہ امت کے اموال اس کا سامان ہوں، اس کی بزرگی کی تعمیر کے لیے قوت ہوں، اس کے مقام و مرتبہ کی حفاظت کا ذریعہ بنیں۔ تاکہ اس کا رعب و اعتبار قائم ہو، اور وہ ان قوتوں کی محتاج نہ رہے جو اس کا استحصال کرتی ہوں اور اس کے منافع پر قابض ہوں اور اُسے اپنے اقتدار کے تحت کرلیں (التحریر والتنویر 15/79 اسی حکمت کا لحاظ رکھتے ہوئے شریعت نے ایسے شخص کو جو شعور نہ رکھتا ہو، اپنے مال کی حفاظت نہ کرتا ہو اور اسراف کرتا ہو، مالی تصرفات سے منع کر دیا ہے تاکہ اس کی مصلحت کی حفاظت ہو اور دوسروں کے نقصان سے اُسے بچایا جائے۔ دیکھیں عزالدین بن زغیبہ، مقاصد الشریعہ الخاصہ بالترفات المالیۃ طبع اول دبی: مرکز جمعۃ الماجد للثقافۃ والتراث ۱۴۲۲ھ/2001 صفحہ 153) جیسا کہ اسلام نے اس سے بھی منع کیا ہے کہ کائنات کی چیزوں کو غیر مناسب جگہوں میں لگایا جائے، جن سے ان کے منافع معطل ہوں، اور غلط جگہوں میں اس کی توانائیاں ختم ہو جائیں۔ چنانچہ ایک حدیث سے اسلام کے اس تہذیبی اصول کی جامع ترجمانی ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ایک بار ایک آدمی نے گائے (بیل) کی سواری کی تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوکر بولی میں اس کام لیے نہیں بنی میری تخلیق تو ہل چلانے کے لیے ہوئی ہے (بخاری کتاب المزاعۃ باب استعمال البقر للحراثۃ 2/817 حدیث نمبر:2199)۔

ایک اور روایت میں یہ ہے کہ ایک آدمی نے گائے پر سامان لادھا تو وہ اس سے مخاطب ہوکر بولی کہ میں اس کے لیے پیدا نہیں کی گئی،، میری تخلیق تو جوتنے کے لیے ہوئی ہے (بخاری کتاب الانبیاء: باب ماذکرعن بنی اسرائیل حدیث نمبر:3463) یہ اسلام کے تہذیبی اصولوں میں سے ہے کہ وہ کائنات کی چیزوں سے ان کی فطرت کے مطابق فائدہ اٹھانے کا حکم دیتا ہے۔ علامہ ابن حجر کہتے ہیں: اس سے یہ دلیل ملتی ہے کہ جانوروں کو مالوف طریقوں پر ہی استعمال کیا جائے گا (فتح الباری، 6/518) کہ اگر چیزوں سے غیر مالوف طریقہ پر کام لیا جائے تو وہ مفید نہیں بلکہ بعض اوقات مضر ہوں گی اور جہاں سے فائدہ کی توقع تھی الٹا نقصان ہوگا۔

☆ اسی طرح اسلام نے ہر اُس کام سے بھی منع کیا ہے جس سے غلط طریقہ پر کائنات کی توانائیاں ضائع ہوتی ہوں، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جس کسی نے چڑیا یا کسی اور بڑے پرندے

کو بلا کسی حق کے قتل کر دیا تو اس کے بارے میں قیامت میں اس سے پوچھ گچھ ہوگی۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا: اس کا حق یہ ہے کہ تم اُسے کھانے کے لیے ذبح کرو، اس کے سر کو کاٹ کر نہ پھینکو، اور حدیث میں ہے کہ ''جس نے کسی چڑیا کو یونہی قتل کر دیا تو قیامت میں وہ خون آلود اللہ کے حضور آئے گی اور اس کی شکایت کرتے ہوئے کہے گی، اے میرے رب فلاں فلاں آدمی نے مجھے بے سبب قتل کیا تھا اور اپنے کسی فائدہ کے لیے نہیں کیا تھا (سنن النسائی الکبری 3/73 حدیث نمبر: 4535-4534) اور سنن ابوداؤد میں ہے کہ: جس نے بیری کا درخت کاٹا اللہ اس کے سر کو دوزخ میں ڈال دے گا، کیونکہ ابن القیم کی تعبیر کے مطابق شارع مفاسد کے سارے راستے ہر ممکن طریقہ سے بند کر دینا چاہتا ہے (اعلام الموقعین عن رب العالمین 3/159)۔

☆**زہد کائناتی یا کائناتی ایثار:** یہاں زہد سلبی معنی میں نہیں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی سے راہ فرار اختیار کی جائے اور کائنات کی تعمیر سے گریزاں ہو کر دور بیٹھا جائے، کہ ایسا رویہ خلافت ارضی اور زمین کی ایمانی تعمیر کے خلاف ہے۔ بلکہ مراد وہ ایجابی زہد ہے جو وسائل اور اشیاء کائنات کے ساتھ تعامل میں اعتدال اور ان کے کم خرچ پر مبنی ہے۔ جس میں معاملہ کرنے والا نگراں اور نگہبان ہوتا ہے۔ جو شارع کے مقاصد کا پابند ہے اور آزادانہ، خواہش پرستانہ اور بے قید اور شہوتوں کے پیچھے بھاگنے والا نہیں ہے اور یوں وہ وسائل اور اشیاء کائنات سے اس کے مطابق استفادہ کرتا ہے۔ جس کا تقاضا اس کا منصب خلافت کرتا ہے، اور دوسری طرف کائنات کی قوتیں اس کو سہار بھی سکیں۔ اور اس نقطۂ نظر کی پابندی کے ساتھ جس کے لحاظ سے یہ زندگی ہمیشہ رہنے والی نہیں اور ایک دن وجود یہاں فنا ہو جائے گا، اور جو کچھ انسان دنیا میں کرے گا نہ ہی وہ باقی رہنے والا ہے۔ بلکہ اس کے بعد ایک اور زندگی آئے گی جو اُس سے بڑھ کر مرتبہ والی ہوگی اور جس کے سبب کائنات کی قوتوں، عطاءات اور اس کے سفر کی بقاء وثمر خیزی کی ضمانت ملتی رہے گی۔

یعنی اسلامی نظام فکر کا زہد یا کائناتی ایثار مغربی فکر کے لامتناہی اور مسلسل ترقی کے تصور کے خلاف ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے وسائل کو بے دردی سے نچوڑ لیا جائے اور زمین کے

خزانوں کو بے رحمی سے لوٹا جائے اور یوں بے محابا ان کو لٹایا جائے کہ جس کی تلافی نہ ہو سکے۔ اور اس کے محرکات صرف یہ ہوں کہ انانیت، اپنے آپ کو ترجیح دینا اور اپنی ذات کی عظمت اور اس سے بھی آگے بڑھ کر غیر محدود پروڈکشن اور بے قابو کنزیومرازم اس کا محرک ہو جن کے مقاصد بھی لامحدود ہیں اور جس میں یہ بھی نہیں سوچا جاتا کہ انسانیت کا فائدہ اس میں ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ تک نہیں دیکھا جاتا کہ کائنات کے وسائل میں اس سب کو سہارنے کی قوت بھی ہے یا نہیں۔ درحقیقت اس کنزیو مرازم کا ماننا یہ ہے کہ یہ زندگی ہی کل زندگی ہے۔ اور اس کے ختم ہونے سے وجود انسانی اور وجود انسانی کا ہر نقش ختم ہو جائے گا۔ اس نظریہ کے مطابق کائنات اور اشیاء کائنات انسان کا تعلق زیادہ سے زیادہ صرَف کرنے والے کا ہے جسے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے جتنا چاہے خرچ کرنے کا حق ہے۔ یہی مغربی ماڈل ہے جو آج زندگی پر مسلط ہے اور اس ماڈل کو گویا اپنی سرگرانی میں اور بے محابا اشیاء اور کائنات کی توانائیوں کو لوٹنے کی لت لگ گئی ہے (الگور کہتے ہیں: میرا خیال ہے کہ ہماری جدید تہذیب کو دراصل خود زمین کو ہڑپ لینے کی لت لگ گئی ہے اور کائنات کو ہڑپ کر جانے پر مبنی ہمارا راستہ ہمیں یہ احساس بھی نہیں ہونے دیتا کہ ہم سے کیا کچھ کھو گیا ہے۔ سطحیت اور کنزیومرازم جو صنعتی تہذیب کی نمایاں خصوصیات ہیں وحشت کے ہمارے احساس کو لپیٹ دیتے ہیں کیونکہ دنیا سے ہمارا رشتہ کمزور پڑ گیا ہے...... ہماری تہذیب ان طریقوں سے کام لے رہی ہے جو کوئلہ، تیل، صاف ہوا، پانی، درخت اور مٹی کی اوپری سطح کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو کھا جائیں اور ان ہزاروں مادوں کو تلف کر ڈالیں جنکو ہم زمین کے اندر سے کھینچ لیتے ہیں۔ تاکہ ان سب کو اپنی ضرورتوں میں اور اپنے ٹھکانے فراہم کرنے میں لگا لیں۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ زمین اور اس کے خزانوں کو غیر ضروری چیزیں بنانے میں بھی بہت بڑی تعداد میں لگایا جا رہا ہے جن کی تشہیر پر اربوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں اور جن کے باعث آلودگی میں زبردست اضافہ ہوتا ہے اور اس تشہیر کے ذریعہ ہم خود کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ ہم کو ان کی ضرورت ہے۔ بظاہر یوں لگتا ہے کہ ذوق نہ رہنے کی وجہ سے کلچر، سوسائٹی، ٹیکنالوجی، ذرائع ابلاغ اور پروڈکشن اور صرَف کی اسکیموں اور ان کی مختلف شکلوں میں ہمارا شغف بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ہم اس کی جو قیمت دے رہے ہیں وہ زندگی کا ضیاع ہے...... زمین سے ہمارے رشتہ میں آئے

انحراف کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم زمین کے خزانوں اور وسائل کو زیادہ سے زیادہ غتر بود کر ڈالنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اور زمین پر پیش آنے والے بحران بانگ دہل اس کا اعلان کر رہے ہیں اور جو چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ ہماری تہذیب اور عالمِ فطرت میں تصادم برپا ہے (الارض فی المیزان ص225-223) تو یہ 'زہد یا ایثار کائناتی' ایک اسلامی تہذیبی تصور ہے جس کی عالمی انتہاپسندانہ مادی تہذیب اسلامی تہذیب سے کم محتاج نہیں ہے۔ کیونکہ کتنی ہی آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ دنیا میں زندگی کی توانائیاں اس طرح ختم ہو رہی ہیں کہ بہت ممکن ہے کہ مستقبل کے لیے کچھ نہ بچے۔ اسی وجہ سے آج دنیا کو اس سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں کہ یہ تصور زندہ ہو اور انسان اپنی تہذیبی کوشش میں کائنات کے مالک کی عبودیت کے حقوق ادا کرے۔ اور اس طرح کائنات سے استفادہ الوہی منہج کے مطابق ہو سکے گا۔ اسلامی نظام فکر اس بارے میں اس صارفیت اور مادیت کی شدید دوڑ کے خلاف کھڑے ہونے کا نقطہ آغاز بن جائے گا جو کہ دنیا کو بربادی کی طرف لے جا رہا ہے!! اس بارے میں اسلام کی تعلیمات دو چیزوں پر مرکوز ہیں جو کمیت اور کیفیت کو منضبط کرتی ہیں اور وہ یہ ہیں:

**اولا:** کائنات کی اشیاء سے ضرورت کے مطابق ہی فائدہ اٹھانے کی دعوت جس میں اعتدال اور کم خرچی کا خیال رکھا جائے گا اور زندگی کو پالنے میں کائنات کے توازن کو برقرار رکھا جائے (انتفاع کی اصطلاح یہ بتاتی ہے کہ کائنات کی توانائیوں اور اشیاء کے ساتھ انسان کا کیا رشتہ ہے۔ یہ قرآنی تصور ہے اور نفع سے ماخوذ ہے۔ امام راغب (المفردات :502) میں کہتے ہیں: نفع وہ چیز ہے جس کے ذریعہ اچھائیوں تک پہنچا جائے اور جو چیز اچھائیوں تک پہنچائے وہ خود اچھی ہوتی ہے۔ یعنی یہ وہ تصور ہے جو بنیادی طور پر کائنات میں جو اچھی چیزوں سے طلب پر اور ان کو نقصان نہ دینے اور ان سے نفع اٹھانے پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے برخلاف صارفیت ہے جس کو استہلاک کہتے ہیں جو ہلک اور استہلک الشیئ سے ماخوذ ہے۔ یعنی اس کو خرچ کر دینا اور اتلاف کر دینا (لسان العرب، مادہ ہلک) وہ ایسا تصور ہے کہ جو مخالفِ فطرت ہے۔ اور کائنات و مافیہا سے جس طرح تعامل ہونا چاہیے اس کے خلافِ ہے یعنی کائنات کے خزانوں سے استفادہ کرنا چاہیے ان کو تلف اور ضائع نہ کرنا چاہیے۔ یہ تو ایک پہلو ہوا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ اصطلاح دھوکہ میں ڈالنے والی ہے جیسا کہ الگور نے (الارض فی المیزان ص151) میں کہا ہے۔ جس کی رو سے مفروضہ یہ ہے کہ جو سامان استعمال میں آ گیا وہ ختم ہوا اس کے اثرات

کی کوئی پروانہیں کی جائے گی۔حالانکہ بات یوں نہیں ہے بلکہ اس پر مختلف طرح کے اثرات مرتب ہوں گے۔فضلات نکلیں گے ،جن پر پہلے زیادہ غور نہیں کیا گیا مگر جب وہ عمومی طور پر صنعتی تہذیب کے بحران کا بنیادی حصہ بن گئے ہیں تب ان کی طرف بھی توجہ مبذول ہوئی )۔

اللہ تعالی کے رحمٰن کے بندوں کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور نہ کمی کرتے ہیں بلکہ معتدل راہ اپناتے ہیں (الفرقان:67) قِوام کا مطلب ہے کہ خرچ کرنے میں اعتدال کرنے والا۔تو اس سلسلہ میں شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان نہ افراط برتے کہ دوسروں کا یا اپنے اہل وعیال کا حق ضائع کردے اور نہ تنگی سے کام لے کہ اس کے بخل کے باعث اہل وعیال مرنے لگیں۔اس بارے میں بہتر چیز اعتدال ہے۔اور اپنے اہل وعیال، ان کی حاجت، اپنی ذمہ داری اور صبر وتحمل اور اپنی کمائی کے لحاظ سے یا ان خصلتوں کے الٹے کے لحاظ سے اعتدال بہرحال برتا جانا چاہیے۔کہ معاملات میں سب سے اچھے امور وہ ہوتے ہیں جو درمیانی ہوں (المحرر الوجیز:4/220)۔

یعنی اللہ کے قول و لاتجعل یدک مغلولۃ: اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھول دے کہ پھر ملامت کیا ہوا در ماندہ بیٹھ جائے (الاسراء:29) کا تقاضا ہے اور اسی سلسلہ میں اللہ کے رسول کا یہ قول بھی ہے: پیٹ کے گھڑے سے زیادہ بڑا گھڑا آدمی نے کبھی نہیں بھرا، آدمی کو چند لقمے کافی ہیں جن سے وہ کمر مضبوط رکھ سکے اور اگر آدمی پر نفس غالب ہو، تو پھر یوں کرے کہ پیٹ میں ایک تہائی جگہ کھانے کے لیے، ایک تہائی جگہ پانی کے لیے اور ایک تہائی سانس کے لیے چھوڑ دے (ترمذی باب ماجاء فی کراہیۃ کثرۃ الاکل 5904 حدیث نمبر:2380 اور کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے اس کی تخریج ابن ماجہ نے بھی کی ہے) اسی وجہ سے آپؐ کی دعا ہوا کرتی تھی: اے اللہ آل محمد کو اتنا رزق دے جس سے ضرورت پوری ہوجائے (متفق علیہ) اور آپ یہ بھی فرمایا کرتے: جو آدمی اسلام لایا وہ کامیاب ہوگیا اور جس کو بقدر کفاف روزی ملی اور جسے اللہ تعالیٰ نے جتنا دیا ہے اس پر قناعت ملی وہ بھی کامیاب ہے (صحیح مسلم کتاب الزکوۃ باب فی الکفاف والقناعۃ 2/30 حدیث نمبر:1054) ابن حجر کہتے ہیں: قدر کفاف وہ ہے جس میں نہ

کمی ہو نہ زیادتی اور قرطبی کہتے ہیں جو حاجت وضرورت پوری کرے مگر عیش میں نہ ڈالے تو حدیث کا مطلب ہوا کہ جس کو یہ چیزیں مل گئیں اُسے وآخرت میں اس کا مطلوب مل گیا، اسی لیے دعا فرمائی کہ اے اللہ آل محمد کو اتنی روزی عنایت کر جس میں مانگنے کی ذلت نہ برداشت کرنی پڑے مگر اُس میں وہ فاضل چیز نہ جس سے دنیا کی آسائش وآرام نہ ملے (فتح الباری 11/275) اور نبی ﷺ نے بیان کیا ہے کہ امن، عافیت اور کفایت دنیا میں بس یہی چاہیے چنانچہ فرمایا: تم میں سے جس شخص نے اپنے ٹھکانے میں امن کے ساتھ صبح کی ، اپنے جسم میں آرام پایا، اس کے پاس اُس دن کی روزی ہو تو گویا اُسے ساری دنیا مل گئی (اس کی تخریج بخاری نے ادب المفرد میں کی ہے: حدیث نمبر: 4300 اور ترمذی نے بھی اس کی روایت کی ہے ،الفاظ انہیں کے ہیں، حدیث نمبر: 2346 اور کہا کہ یہ حدیث حسن غریب ہے ،اور ابن ماجہ نے اپنی سنن میں کی ہے، 2/1387 حدیث نمبر: 4141)۔

**ثانیا: اسراف وتبذیر کی ممانعت** (اسراف وتبذیر جمہور لغویوں کے نزدیک دو مترادف لفظ ہیں، جن کا معنی ہوتا ہے حد سے آگے بڑھ جانا (تاج العروس، 22/428) ماوردی نے دونوں میں فرق کرنے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے: جان لو کہ کبھی اسراف وتبذیر کے معنی میں فرق ہوتا ہے، تو اسراف یہ ہے کہ حقوق کی مقدار ہی معلوم نہ ہو، اور تبذیر یہ ہے کہ حقوق کے مواقع معلوم نہ ہوں، پھر ان دونوں میں تبذیر زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ مسرف زیادتی میں غلطی کرسکتا ہے، مبذر نہ جاننے میں خطا کرسکتا ہے اور جس کو اپنے مال میں حقوق کے مواقع ومقدار نہ معلوم ہوں اور وہ غلطی کرے تو وہ ایسا ہی ہے جیسے عملا ان کو نہ جانے اور غلطی کرے۔ اور اپنی تبذیر سے جس طرح وہ کبھی شیئ کو غیر محل میں رکھ سکتا ہے اسی طرح وہ اُسے مناسب جگہ سے ہٹا بھی سکتا ہے''۔ ادب الدین والدنیا صفحہ 187) چنانچہ اگر مسلمان سے کائنات کا امین ہونے اور اس کی توانائیوں سے مستفید ہونے میں وسطیت واعتدال کا مطالبہ ہے تو اس سے اِس اعتدال کے دائرہ میں اس بات کا بھی مطالبہ ہے کہ وہ کائنات کی اشیاء کے ساتھ رویہ میں اسراف وتبذیر سے کام نہ لے۔ اس طور پر کہ بے وجہ کی چیزیں نہ کرے، غیر مناسب جگہوں میں اس کا استعمال نہ کرے اور اپنی کسی واقعی ضرورت کے بغیر کہیں اور ان کو خرچ نہ کرے بلکہ اشیاءِ کائنات سے استفادہ کے مواقع کو تنگ کردے ۔ اور ایسا مقاصد شرع کے مطابق کرے اور ان نعمتوں کو یوں سمجھے کہ ان کو ضائع کرنا جائز نہیں۔ اسی سے

انسانی ضروریات کی تحدید کرے اور اشیاء سے تلذذ اوران کے حد سے بڑھے ہوئے استعمال پر پابندی لگائے ۔اس سے یہ ہوگا کہ انسان کی ضروریات کے بے انتہاء ہونے کا خیال کمزور پڑے گا جس کا ذرائع ابلاغ وتشہیر نے ڈھنڈورا پیٹ رکھا ہے اور اتنا پروپیگنڈا کیا ہے کہ انسان بس صارف بن کر رہ گیا ہے۔

اور صارفیت اس کا مقصدِ زندگی بن گئی ہے۔حالانکہ بہت ممکن ہے کہ انسان کو ان کی ضرورت نہ ہو(منیر شفیق الاسلام،الاسلام فی معرکۃ الحضارۃ طبع اول (بیروت: دار الکلمۃ للنشر ، 1982 صفحہ 66) یہ ساری چیزیں اسلام کے اس قاعدۂ کلیہ کے تحت ہوں گی جس کو یہ آیت بیان کرتی ہے: وکلوا واشربوا :اے اولاد آدم! تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو،اور خوب کھاؤ اور پیو اور حد سے مت نکلو، بے شک اللہ حد سے جانے والوں کو پسند نہیں کرتا(الاعراف:31)۔امام الطاہر بن عاشور نے اسراف وتبذیر کی ممانعت کی حکمت یوں بیان کی ہے کہ قصد واعتدال سے اکثر حالات میں اہل کفاف کے لیے ان کی روزی کافی ہوگی اور جہاں تک مالداروں کی بات ہے تو اصل میں ایک آدمی کی مالداری دوسرے کی غربت کو مستلزم ہے۔کیونکہ مال محدود ہیں،اس لیے جو ثروت ہے اس کی حفاظت اس لیے ضروری ہوگی کہ اس سے ناداروں اور اہل

حاجت کی ضرورت پوری ہوسکے گی ،اور مالداروں کے مال کے مقابلہ میں ناداروں کی تعداد کہیں زیادہ ہوتی ہے۔اس طرح مال کو خاندان ،قبیلہ اور نتیجۃً امت کے مصالح کے لیے محفوظ رکھا جاسکے گا(التحریر والتنویر15/79)اس وجہ سے تہذیبِ نفس اور اعتدال وکم خرچ کا اس کو عادی بنانا اور کھانے ، پینے ،لباس اور مکان میں اور دوسرے تمام مطالباتِ زندگی میں عدم تبذیر اور عدم فضول خرچی اسلام کی تہذیبی فقہ کا ایک اصول ہے۔اور زندگی کے تمام مظاہر میں تحریکِ حیات کی شرط ہے۔اسلام نے اسراف وتبذیر سے جو منع کیا ہے،اُس کی غالبا سب سے بڑی دلیل وہ حدیث ہے جس کو ابن ماجہ نے انس بن مالک سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: اسراف میں سے یہ بھی ہے کہ تم ہر وہ چیز کھالو جس کا دل چاہے‘‘(سنن ابن ماجہ 2/1112 حدیث نمبر:3352)اسی طرح وہ حدیث ہے جس کو عبداللہ

بن عمروؓ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سعدؓ کے پاس سے گزرے جو وضو کر رہے تھے تو آپؐ نے فرمایا: سعدؓ یہ فضول خرچی کیوں؟ انہوں نے پوچھا کیا پانی میں بھی اسراف ہے؟ فرمایا: ہاں اگرچہ تم کسی بہتی ندی کے کنارہ پر ہی کیوں نہ بیٹھے ہو (مرجع سابق 1/147 حدیث نمبر:147) آپ کے اس قول میں کہ ''کسی بہتی ندی کے کنارہ پر ہی کیوں نہ بیٹھے ہو'' یہ دلیل ہے کہ اسلام میں زندگی کے تمام پہلوؤں میں اسراف ممنوع ہے۔ اور اس میں اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس چیز کی معاشرہ میں کثرت ہے یا قلت یا وہ مال ہے یا غیر مال بلکہ زندگی کے ہر حال میں مال ہو یا غیر مال، کم ہو یا زیادہ سب میں اسراف کی ممانعت ہے اور اس کا واحد معیار قدر کفاف ہے، یعنی اتنا جس سے انسانی زندگی کی تعمیر کا فرض پورا کیا جا سکے۔ یہ اعتدال والی حد ہے، اور اس سے جو خرچ بھی متجاوز ہوگا وہ اسراف کہلائے گا جس سے نہی اور ممانعت میں شدت برتی گئی ہے (عبدالمجید النجار، مقاصد الشریعہ بابعاد جدیدۃ، صفحہ 225)۔

اور اس طرح قوامہ (نگہ بانی) کا اسلامی تصور مبنی ہے رفق ورحمت، محافظت وحمایت، زہد وایثارِ کائناتی پر، اور وہ انسان کے کائنات اور اس کی اشیاء سے معاملہ کو ایک نیا بُعد دیتا ہے۔ جس کی رو سے کائنات کے توازن کی حفاظت کی جائے گی اور آئندہ کی نسلوں کے لیے ان کی عطا باقی رہے گی جس سے انسان کو اس سے بہت کچھ ملتا رہے گا۔

(عالمی تہذیب جس کی ساخت مادیت پر ہے کو اس سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں جتنی ضرورت اس چیز کی ہے کہ قوت کی منطق کے مقابلہ میں جس کو آج کل کائنات سے مقابلہ کرنے میں استعمال کیا جا رہا ہے، قوامہ کا یہ تصور اس کے ہاں بھی راسخ ہو جائے۔ کیونکہ کائنات پر اپنی شہنشاہیت قائم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے جو زیادہ تر صرف مغربی انسان کو فائدہ پہنچاتی ہے گرچہ اس کے نتائج سے زمین کے سبھی باسی متاثر ہوتے ہیں۔!! طاقت کی یہ منطق آج جنگلوں، سمندروں، اوزون، میٹھے پانیوں پر اور بارش اور خود زندگی کی بوقلمونیوں پر اثر انداز ہو رہی ہے (الارض فی المیزان ، ص 281)۔ لہٰذا آج انسانیت کو یہ سبق پڑھنے کی ضرورت ہے کہ وہ کائنات کی نگہ بانی کا فرض کس طرح سے انجام دے۔ جس سے اُس کی حرمت کا تحفظ ہو سکے۔ تا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے اردگرد کی کائنات کو ہلاکت

میں نہ ڈالے اور بے وقوفی، اخلاقی حدوں کو پار کرنے اور صَرف کے پیچھے سرپٹ دوڑنے سے بچے جس سے کہ زندگی، ماحول اور زمین کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔اسی کی طرف الگور نے مغربی تہذیب کے پیدا کرہ ماحولیاتی بحران کے تجزیاتی مطالعہ میں اشارہ کیا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کا فلسفہ زمین سے علیحدگی پر مبنی ہے۔الگور کہتے ہیں:'' انسانی تہذیب کا مستقبل ماحول کی نگہ بانی اور اسی درجہ میں آزادی کی نگہ بانی پر موقوف ہے، وہ سرکش قوتیں جو اس نگہ بانی کی مخالف ہیں، دو حالتوں میں سے ایک ہیں یا تو وہ مادی بھوک اور شخصی مفادات کا اہتمام کرتی ہیں اور یا شارٹ ٹرم میں استحصال پر مرکوز ہیں جس کا بھگتان لمبی مدت میں خود ماحولیاتی نظام کی سلامتی کو کرنا پڑتا ہے (مرجع سابق ص183)۔

**مسئولیت اور محاسبہ:** یہ وہ تیسرا بُعد ہے جو اساس ہے کائناتی امانت کے تصور کی، بلکہ یہ زندگی کو حرکت دینے میں اسلام کے منہج کی مرکزی قدروں میں سے ہے۔کیونکہ اسلامی نقطہ نظر کے مطابق انسان ایک آوارہ منش جانور نہیں بلکہ اُس کو اپنے انجام اور کائنات کے انجام کا ذمہ دار بنایا گیا ہے ،جس کا وہ امانت دار ہے۔اس پر ذمہ داری ہے کہ کائنات کی اشیاء وصلاحیتوں سے کام لے۔اور ذمہ داری کے اس احساس کی تو شان ہی یہ ہے کہ وہ سب لوگوں کو کائنات سے استفادہ اور خرابی سے سے بچانے کے لیے اس کا تحفظ کرنے پر ابھارے گا۔یہی معنیٰ اللہ کے قول: **یومئذ یصدر الناس اشتاتا** (الزلزال) اس روز لوگ مختلف جماعتیں ہو کر (واپس) لوٹیں گے تا کہ انہیں ان کے اعمال دکھا دیے جائیں پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا8-6) سے مستفاد ہوتا ہے، جیسا کہ وہ ان تمام آثار سے بھی مستفاد ہوتا ہے جو ہم نے اوپر بیان کیے اور جن میں ایسی ہر سرگرمی سے روکا گیا ہے جن سے بغیر کسی حق کے کائنات کی توانائیاں ضائع ہوتی ہوں۔مثال کے طور پر اللہ کے رسول کا قول: جس نے کسی چڑیا اور اُس سے بڑے پرندے کو بغیر اس کے حق کے قتل کیا تو اللہ اُس کے بارے میں قیامت میں پوچھ گچھ کرے گا۔کہا گیا یا رسول اللہ اس کا حق کیا ہے؟ کہا اُس کا حق یہ ہے کہ تم اس کو ذبح کر کے کھاؤ، اس کا سر کاٹ کر نہ پھینکو اور ایک روایت میں ہے کہ جس نے کسی چڑیا کو یونہی مار ڈالا تو وہ قیامت میں خون آلود آئے

گی اور کہے گی یارب! فلاں نے مجھ کو بغیر کسی فائدہ کے یونہی قتل کر دیا تھا (اس کی تخریج گزر چکی ہے)۔

اور آپ کا ارشاد ہے کہ ایک عورت کو ایک بلی کے سلسلہ میں عذاب دیا گیا جس کو اُس نے قید کر دیا تھا اور وہ بھوک سے مر گئی تھی تو وہ اس سبب سے دوزخ میں داخل ہوئی (ایضا)۔

پھر یہ مسئولیت کائنات کی چیزوں اور اشیاء کے استعمال اور ان کو بروئے کار لانے اور ان کے ذریعہ منہج خداوندی کے مطابق کائنات کی تعمیر کے سلسلہ میں حساب دینے کا تقاضا بھی کرتی ہے کہ اللہ کے نظام میں نفع بخش سے فائدہ اٹھانا اور بعض نافع چیزوں میں جو نقصان ہے اس کو زائل کرنا اور نقصان دہ چیزوں سے اجتناب یا ان کی تہذیب یا ازالہ واجب ہے۔ تو اگر اِس نظام کو پلٹ دیا گیا کہ صالح کو فساد آلود کر دیا جائے یا نقصان دہ کو باوجود نقصان کے بروئے کار لایا جائے یا اس کے ضرر کو دور نہ کیا جائے حالانکہ دور کیا جا سکتا ہے، تو یہ اصلاح کے بعد فساد مچانا ہوگا (التحریر والتنویر 174-8/173) جس کی ذمہ داری انسان کو لینی ہوگی اور اس کا اس پر حساب ہوگا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ابن آدم کو بس تین چیزوں کا حق ہے، اتنا کھانا جس سے اس کی کمر سیدھی رہے، اتنا کپڑا جس سے اس کی شرم گاہ ڈھک جائے، وہ گھر جو اُس کو پناہ دے دے، اُس سے زیادہ جو ہو تو اس پر حساب دینا ہوگا (امام عراقی احیاء علوم الدین کی احادیث کی تخریج میں کہتے ہیں: اس کی تخریج ترمذی نے بروایت عثمان بن عفان کی ہے۔ اور طعام یقیم صلبہ کی جگہ کہا ہے وجلف الخبز والماء اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ احیاء علوم الدین 4/2009 ترمذی کی روایت یوں ہے: ابن آدم کو صرف ان تین چیزوں کا حق ہے، ایک گھر جس میں وہ رہے، ایک کپڑا جس سے اس کی شرمگاہ ڈھک جائے اور پانی و روٹی کا ٹکڑا، سنن الترمذی 4/57 حدیث نمبر: 2341 اور کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے) مطلب یہ ہے کہ اگر انسان ان تین چیزوں میں سے بقدر ضرورت لے لے تو اس کو ثواب ملے گا اور اس سے زیادہ لے گا تو اگر گناہ نہیں کرتا تو حساب دینا ہوگا اور اگر معصیت کا مرتکب ہوگیا تو پھر اس پر سزا پائے گا (احیاء علوم الدین، 4/209) اور نہ صرف آخرت میں بلکہ دنیا میں بھی اپنے فساد کا مزہ اُسے چکھنا پڑے گا۔

مسلمہ چیزوں میں سے یہ بھی ہے کہ یہ مسئولیت اور اس پر مرتب ہونے والا محاسبہ فرد و جماعت دونوں سے برابر متعلق ہے کیونکہ کائنات کی اشیاء کی حفاظت اور ان کے استعمال میں نرمی

برتنے کا حساب صرف فرد پر نہیں بلکہ جماعت تک ممتد ہوگا۔ کیونکہ فرد و جماعت دونوں کا الگ الگ ریکارڈ رکھا گیا ہے۔ جماعت کے ریکارڈ کے بارے میں فرمایا: وتری کل امۃ جاثیۃ: اور آپ دیکھیں گے کہ ہر امت گھٹنوں کے بل گری ہوئی ہوگی ۔ ہر گروہ کو اپنے نامۂ اعمال کی طرف بلایا جائے گا، آج تمہیں اپنے کیے کا بدلہ دیا جائے گا، یہ ہے ہماری کتاب جو تمہارے بارے میں سچ سچ بول رہی ہے، ہم تمہارے اعمال لکھواتے جاتے تھے (الجاثیۃ:29-28) اور فرد کے حساب کے بارے میں فرمایا: **وکل انسان الزمناہ**: ہم نے ہر انسان کی برائی بھلائی کو اس کے گلے لگا دیا ہے اور بروز قیامت ہم اس کے سامنے اس کا نامۂ اعمال نکالیں گے جسے وہ اپنے اوپر کھلا ہوا پائے گا، لے! خود ہی اپنی کتاب پڑھ لے، آج تو تو آپ ہی اپنا

خود حساب لینے کو کافی ہے (الاسراء:14-13) تو یہ ہر فرد کا اعمال نامہ ہے اور وہ ہر جماعت کا اعمال نامہ ہے۔ دونوں اعمال ناموں میں زبردست فرق ہے۔ اس تصور سے کائنات اور اشیاءِ کائنات کو برتنے کو اور ان کی حفاظت وصیانت کو بہت بڑی قیمت اور ویلیو مل جاتی ہے۔ یوں فرد امت بلکہ پوری انسانیت کے سامنے اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہوگا، جیسا کہ امت اس کی مسئول ہوگی فرد اور پوری انسانیت کے سامنے!!

کائنات جس کی امانت انسان کو دی گئی ہے کے بارے میں مسئولیت اور محاسبہ کا یہ تصور جس پر وحی نے مسلمان کی پرورش کی ہے ان اقدار میں سے ہے جن کا دنیا میں پھیلنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس کے بالمقابل عدم جواب دہی کا احساس، جو پہلے کبھی نہیں تھا اور جس نے آج ایک دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، اسی وجہ سے انسان آج کائنات اور اس کی چیزوں کے ساتھ اس بے نظیر غرور و استکبار کے ساتھ پیش آ رہا ہے (الگور نے اپنی کتاب الارض فی المیزان میں لکھا ہے (صفحہ 174): ہم دیکھ رہے ہیں کہ خطرناک بحرانوں کے مقابلہ میں احساس مسئولیت بالکل ہے ہی نہیں جس سے ہمیں زبردست حیرانی ہوتی ہے اور بجائے اس کے کہ ذمہ داری ہم اپنی پسند سے لیں، ہم بڑی سادگی سے قرضوں کے انبار لگا رہے ہیں اور آلودگی کے اسباب آنے والی نسلوں کے حوالہ کر کے جا رہے ہیں''۔ اس کے بعد انہوں نے مزید کہا ہے: ''تہذیب کی حیثیت سے ہماری امید اس

پر منحصر ہے کہ ہم اپنے لیے صحت مندانہ احساس کے ساتھ چلیں، کہ ہم واقعتہً ایک عالمی تہذیب کی تشکیل کریں، ایسی تہذیب جس میں ذمہ داری کا پختہ احساس ہو اور جو ہمارے اور زمین کے مابین ایک نیا اور نتیجہ خیز رشتہ استوار کرے'' ۔صفحہ 216) کیونکہ یہ قدر انسان کو اس کے کاموں کی نگرانی اور اسکے آثار و عواقب پر غور کے قابل بناتی ہے۔ وہ اپنے نفس کا احتساب کرتا ہے، اور انسانوں اور اشیاء کے تئیں اپنی ذمہ داریاں مناسب طریقہ پر اٹھاتا ہے۔ اس کے حقوق ادا کرتا ہے اس سے کائنات کا وجود محفوظ ہوتا ہے اور وہ مسلسل عطاو بخشش کرتی ہے جس سے بعد میں آنے والی نسلیں استفادہ کرتی ہیں۔تو وہ اپنا ہر کام اس شعور کے ساتھ کرتا ہے کہ اس کے کام کے اثرات اور اس کی ذمہ داری محض اس کی نسل وذریت تک محدود نہیں رہے گی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر صرف اس کے بعد کی نسلوں تک ہی نہیں بلکہ ابدی مستقبل تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے وہ جانے گا کہ اگر وہ کائنات کے حقوق کے تحفظ میں کوتاہی کرے گا تو وہ اولا اپنے حقوق کی ادائیگی میں پھر غیر کے حقوق میں کوتاہی کرے گا کیونکہ وہ جو کام اس وقت کرے گا اس کے اثر آنے والی انسانی نسلوں اور چھپے ہوئے عالمِ اشیاء کے حق میں لامحدود ہوں گے (ماحولیات کے تحفظ کے عالمی فنڈ نے اپنی 2006 کی رپورٹ میں جس کا عنوان ہے'' زندہ سیارہ'' اشارہ کیا ہے کہ قدرتی وسائل میں سے انسان جتنا خرچ کرتا ہے وہ اس سے 30 فیصد زائد ہے جتنے کی قدرت تجدید کر سکتی ہے اور اگر یہی حال رہا تو 2050 میں دنیا کے باشندے جن کی تعداد 9 ارب ہو جائے گی ان کو زمین جتنی پیداوار کر سکتی ہے اس کے دو گنے کی ضرورت پڑ جائے گی!! اس سے زمین کی قوتِ پیداوار کو بھی خطرہ ہے اور ساتھ ہی آنے والی نسلوں کے مستقبل کے لیے بھی خطرہ ہے کیونکہ ان کی زندگی وبقاء خطرہ میں پڑ جائے گی)۔

اور یوں اسلام ان اصول ثلاثہ سے جو انسان کے کائنات سے رشتہ کو منضبط کرتے ہیں یعنی کائنات کے ساتھ انسان کی وحدت، تسخیر اور کائناتی امانت اور ان سے جو اقدار پیدا ہوتی ہیں، اس فقہ کی بنیاد رکھتا ہے جو'' حیات دنیوی کی طیبات سے لطف اندوزی'' کے اصول وضع کرتی ہے۔ جیسا کہ وہ مسلمان کو زندگی کو حرکت دینے والے منہج میں اوپر اٹھاتی ہے اور ہمارے یہاں اطراف کی دنیا اور عالمِ اشیاء کے ساتھ تعامل سکھاتی ہے کہ کس طرح اس سے فائدہ اٹھائیں اور مزید ترقی دیں۔ یہ سب اصول ایک ایسی دنیا کی تخلیق کرتے ہیں جہاں زندوں اور اشیاء کے ساتھ رشتے ایسے ہوں جیسے رشتے قرابت

داروں کے درمیان ہوتے ہیں اور جو رشتے ان کے اور اللہ کے درمیان ہوتے ہیں جو ان پر اپنی تجلی فرماتا ہے، قہر کی نہیں رحمت کی تجلی۔ اور یوں انسانوں کا تعامل ان اشیاء سے قوامہ اور تراحم کا تعامل ہوتا ہے دشمنی اور باہم دگر پچھاڑنے کا نہیں۔ اور انسان ان کے حقوق اس طرح ادا کرتا ہے جس طرح رشتہ دار اپنے رشتہ دار کے حقوق ادا کرتا ہے (ملاحظہ کریں: طٰہٰ عبدالرحمٰن، روح الحداثہ ص 253)۔

اس کے ساتھ نرمی برتنے اور اُسے مزید نتیجہ خیز بنانے میں تلطف برتتے ہوئے اور اس کے تحفظ اور اس کی چیزوں کی حفاظت میں اور وہ یوں کہ اسلامی اصول ''تمام مخلوقات اپنے فرقِ مراتب کے ساتھ ایک دوسرے سے قریب ہیں'' اور ''ہر مخلوق کے لیے حق یا حقوق ہیں جو ان کے ساتھ خاص ہیں''۔ پر عمل کرتے ہوئے سب سے پہلے تو ان کو فساد سے بچایا جائے، دوسرے ان کے خزانوں سے استفادہ میں اعتدال برتا جائے اور تیسرے ان کو ترقی دی جائے۔ تو اس طرح ان کے ساتھ انسان کا تہذیبی عمل دو چیزوں پر مبنی ہوگا۔ ایک یہ طریقے درست اور مشروع ہوں اور دوسرے یہ کہ انجام بہتر ہو۔

☆☆☆

# رابعا: سنن الٰہیہ والا بُعد

## زمین کی ایمانی تعمیر اقدار حاکمہ، اور فیصلہ کن سنتوں کے درمیان

سنۃ لغوی معانی میں ''باضابطہ معاملہ'' دائمی طریقہ اور قانون ثابت کو کہتے ہیں (ابن فارس کہتے ہیں (معجم مقاییس اللغۃ 3/60): کہ سنن اور سنۃ ایک باضابطہ اصل واحد ہے جس کا مفہوم ہوتا ہے 'سہولت سے کسی شیئ کا جاری رہنا اور باقاعدہ ہونا) سنن الٰہیہ والے بُعد سے مراد وہ بُعد ہے جس میں زندگی میں کارفرما اللہ کے قوانین ثابتہ اور اس کی عاداتِ مالوفہ کا لحاظ رکھا جاتا ہو، ان کا اعتبار کیا جاتا اور ان کے ساتھ ہم آہنگی ہوتی ہو۔ کیونکہ جو سنن الٰہیہ ماضی میں ہو چکیں وہی حال میں ہوں گی اور مستقبل میں بھی ان کے وقوع کی امید ہوتی ہے۔ اگر احوال ووقائع یکساں ہوں (بلاشبہ یہاں مراد تاریخی یا اجتماعی قوانین ہیں جو تمدنی احوال وظواہر میں کارفرما ہوتے ہیں، اور قوموں کی زندگی کے عروج وزوال اور اتار چڑھاؤ سے مربوط ہوا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر نصرت کی سنت، دفعیہ کی سنت اور فکر اسلامی میں یہ مفہوم زیادہ تر سنن الٰہیہ کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس کے برعکس قوانین فطرت ہیں جن کے احوال یا شرائط یا وقوع پر انسان کو کوئی قدرت نہیں ہوتی۔ وہ تو ہو کر ہی رہتے ہیں، انسان چاہے یا نہ چاہے جیسے زندگی اور موت۔ اور انسان اپنی جدوجہد کے مطابق اور دنیا کی تسخیر کے مطابق ہی فائدہ اٹھاتا ہے) تو معاملات لوگوں میں یونہی نہیں چلتے، زندگی کی گاڑی عبث نہیں چلتی بلکہ کچھ قوانین ثابتہ ہیں جن میں کوئی تبدیلی اور تغیر نہیں ہو سکتا۔ قرآن اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے اور لوگوں کو سکھاتا ہے، تاکہ وہ وقائع کو الگ الگ کر کے نہ دیکھیں، اور زندگی نوامیس فطرت سے غافل ہو کر نہ گزاریں، کہ زمانہ کے ایک محدود وقفہ میں محصور ہو جائیں اور کسی محدود دائرہ میں سکڑ جائیں اور زندگی کے ارتباطات اور سنن وجود سے متعلق ان کے تصور کو اٹھا کر وہ ان کو ہمیشہ سنن ثابتہ اور قوانین فطرت کے ضابط بند ہونے کی طرف رہنمائی

کرتا ہے۔اور ان کی نگاہوں کو ماضی کی نسلوں میں

اس کے مصداق کی طرف ملتفت کرتا ہے اور بتا تا ہے کہ ان کا ماضی سنن الٰہیہ اور نوامیس فطرت کے وقوع پر کس طرح دلالت کرتا ہے (فی ظلال القرآن، 6/708) جیسا کہ اللہ نے فرمایا: **یریداللہ بکم** : اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے خوب کھول کر بیان کرے اور تمہیں تم سے پہلے کے (نیک) لوگوں کی راہ پر چلائے اور تمہاری توبہ قبول کرے، اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے (النساء:26)۔

اس تصور کے مطابق سنن الٰہیہ حرکتِ حیات کی ایمانی تحلیل ہیں اور وہ اقدار ہیں جو باضابطہ زندگی کے تمام کاموں میں فیصلہ کن ہوتی ہیں۔اسی طرح تہذیبی سرگرمیوں کو سمجھنے کے لیے فقہ تہذیبی کے اہم ابواب میں سے ہیں۔وہ سرگرمیاں کتنی ہی متنوع، متداخل اور باہم دگر اثر پذیر کیوں نہ ہوں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ حرکتِ استخلاف اور انسانی تمدن کی راہوں کے اصول پیش کرتی ہیں۔اور یوں ہم کو اس پر قدرت دیتی ہیں کہ ہم : امت کی یادداشت کو بحال کریں، اس میں ہونے والے واقعات وحادثات کو جانیں اور ان کی تشریح کرسکیں نیز عواقب وانجام کی فقہ کو جانیں۔جہاں خلل پایا جائے اس کو درست کرسکیں اور غلطیوں سے بچ جائیں کیونکہ ان سنن الٰہیہ کے مطالعہ اور ان کی بصیرت کے ذریعہ سے ہی مسلمان کی عقل میں زبردست وسعت آئے گی، ان کے تجربوں میں اضافہ ہوگا اور اس طرح اس کی اپنی عمر میں بہت سی عمریں جمع ہوجائیں گی، اُسے سابقہ امتوں کو لاحق ہوجانے والی علتوں کی بصیرت حاصل ہوگی، ممکنہ بیماریوں سے وہ بچ سکے گا اور تہذیب کے اس قاعدہ کے مطابق کہ " ہر بشری تمدن کے کچھ معروف طبائع ہوتے ہیں" اگر ہم ان کو جان لیں تو اس کے انجام اور مآل کا ہم اندازہ کرسکیں گے" اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قد خلت: تم سے پہلے بہت سی مثالیں گزر چکی ہیں تو زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ کیا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا، یہ بیان ہے لوگوں کے لیے اور ہدایت ونصیحت ہے ڈرنے والوں کے لیے (آل عمران:-138137)۔

☆سنن الٰہیہ کے راستہ سے امت کے مستقبل کا مطالعہ : کیونکہ ماضی سے عبرت پذیری حال کی تعمیر میں درستگی تک لے جائے گی اور یوں ماضی وحال سے گزر کر اچھے مستقبل کا دیکھنا ممکن

بنائے گی پھراس مستقبل کی تشکیل کی قوت دے گی ۔اوراس طریقہ پر کہ جس میں زمانہ کے حلقے مل جائیں اورتفکیر واعتبار کے مناہج یہاں آکر باہم دگرتعامل کریں۔ان سنن الٰہیہ پر قرآن کریم نے جوگفتگوکی ہے اس پر غوروفکر کرنے سے کئی حقائق معلوم ہوتے ہیں جن کی زمین کی ایمانی تعمیر میں اورتہذیبی بنامیں اپنی بڑی اہمیت ہے (ملاحظہ ہو،محمد باقرالصدر،المدرسۃ القرآنیۃ صفحہ 47-41)۔

**پہلی حقیقت:** یہ سنن الٰہیہ باضابطہ ہیں،بے قاعدہ نہیں اورنہ ہی یہ ٹل سکتی ہیں،ان میں باقاعدگی ہے،چنانچہ جوتمدنی وتہذیبی عمل ہے چھوٹا ہو یابڑااس میں ان سنن الٰہیہ کی کارفرمائی ہےاوریہی اس میں فیصلہ کن ہوتی ہیں۔اِن میں کوئی نسخ اورتبدیلی نہیں ہوسکتی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:سنـــــة مـــــن: جیسا کہ ان رسولوں کے بارے میں ہماراطریقہ رہا ہےجن کوہم نےتم سے پہلے بھیجا تھااورتم ہمارےطریقے میں تبدیلی نہ پاؤگے(الاسراء:77)اورفرمایا: یہ اللہ کا دستور ہے ان لوگوں کے بارے میں جو پہلے گزرچکے ہیں،اورتم اللہ کے دستورمیں کوئی تبدیلی نہ پاؤگے(الاحزاب:62)زندگی اورزندگی رکھنے والوں کی حرکت میں اللہ کی ان حکمراں سنتوں میں ثبات وانضباط مسلمان کے اندر ایک شعوربصیرت پیدا کرتا ہے،وہ ان سنتوں کے مطالعہ سے بے پروائی جیسی حماقت کا شکارنہیں ہوتاوہ بصیرت رکھتا ہے۔اور جانتا ہے کہ سنن الٰہیہ کا قوموں کو بنانے بگاڑنے اورترقی وتنزل میں اورعروج وزوال میں اہم کردارہوتا ہے۔وہ جانتا ہے کہ ماضی میں امت کس راستہ پرچلی اورکس انجام سے دو چارہوئی اورمستقبل کی تاریخ میں ان کا ایجابی اثر کیا ہوگا۔وہ واقعات کے اسباب وعلل کوجانے گااوراس وہم میں ہرگزنہ پڑے گا کہ واقعات یونہی،اچانک اورقدرت کے جبر سے ہوتے ہیں۔نہ ہی اُسےخرافات واساطیر اپنا شکار بنا سکیں گے۔نہ وہ تاریخ کے خاتمہ،اور''مابعدتاریخ''کےتصورات پرایمان لائے گا جوآج مغربی دنیامیں گونج رہے ہیں۔

خاص طورپرتاریخ کے خاتمہ کا جوتصورفرانسس فوکویامانے پیش کیا ہے۔جس سے اس کی مراد یہ ہے کہ مغربی ماڈل ہی آخری اورحتمی ماڈل ہےاورانسان کو چارنا چاراسی کواختیار کرنا پڑے گا۔

کیونکہ سنن الٰہیہ والے بُعد میں اس قسم کی جبری حتمیت کی کوئی جگہ نہیں۔جس کے نظریہ سازوں نے انسانوں کو اس کا یوں تابع بنانے کی کوشش کی ہے، جیسے کہ مادہ کو مسخر کرلیا جاتا ہے، لہٰذا انسان کی حرکت اور اس کی فعالیت سنن الٰہیہ اور ان کی اثر پذیری کے تابع رہے گی۔دوسری حقیقت یہ ہے کہ یہ سنن الٰہیہ ربانی ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے مربوط ہیں چنانچہ قوانین حیات میں سے ہر قانون اللہ کا کلمہ اور اس کا فیصلہ ہے۔جیسا کہ فرمایا: وان تصبھم: اور اگر ان کو کوئی برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تمہارے سبب سے ہے، کہ دو کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے، تو ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات سمجھتے ہی نہیں (النساء:78)۔

جب مسلمان دنیا کے مختلف وسائل سے مدد لیتا ہے اور کائنات کی اشیاء سے استفادہ کرتا ہے تو یہ چیز ایک طرح سے اس کو بتاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے الگ نہیں ہے۔کیونکہ اللہ کی قدرت اِنہیں سنن کونیہ کے ذریعہ متجلی ہوتی ہے جو اس کی حکمت اور تدبیر کائنات کی ترجمانی کرتی ہیں، یوں انسان ہمیشہ اور دائمی طور پر اللہ سے بندھا ہوا رہتا ہے۔اس کی حرکات چست و درست رہتی ہیں اور دوسری جانب سے ان سنتوں کا ''ربانی ہونا'' انسان کو سرکشی وتکبر سے روکتا ہے جو انسانیت کے لیے چیلنج ہیں، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر اللہ کائنات کو اس میں ودیعت کردہ قوانین ثابتہ کے ذریعہ تسخیر نہ کرتا اور ان کے مطابق اسے نہ چلاتا تو وہ ایجاد واختراع کے اپنے امکانات سے فیضیاب نہ ہوسکتا تھا۔اسی طرح یہ چیز انسان کو ''میں سب کچھ جانتا ہوں'' کی سرکشی سے بھی بچاتی ہے کہ یہ نعرہ بھی مارنا الوہیت کے لیے چیلنج ہے۔کیونکہ وہ جانتا ہے کہ زندگی اور انسانوں کی حرکات میں اللہ کے قوانین ثابتہ کی حکمرانی ہوتی ہے، لہٰذا خدا کے مقابلہ میں آنے کی سرکشی سے بچ جاتا ہے۔اور اس قسم کی مہلک سرکشی سے بچنے کا انسان کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کہ وہ اِن سنتوں کو آیات الٰہی سمجھے جن پر اللہ کی مشیت حکمراں ہے۔جن میں وہ قدریں ہیں جو اللہ پر ایمان کو واجب کرتی ہیں۔جس کا علم محیط ہے اور جو بھی اس کے علم کو چیلنج دیتا ہے اس کو وہ ختم کر دیتا ہے۔

## تیسری حقیقت:

تیسری حقیقت یہ ہے کہ سنن الٰہیہ انسان کے اوپر سے نہیں چلتیں بلکہ اس کے نیچے سے اور اس کے ارادہ واختیار سے چلتی ہیں کہ سنن الٰہیہ کی دَین پر عدل الٰہی کی حکمرانی ہوتی ہے۔ جوتاثیر وتغییر کی سنتوں کووجودوعدم میں اپنی شرطوں کی پابند بنادیتا ہے۔لٰہذا بعض لوگوں کا یہ واہمہ بالکل غلط ہے کہ انسان کی حریت،اختیاراوراللہ کی سنتوں اوراس کی کائنات میں نافذ تقدیروں کے درمیان تناقض ہے ،لہٰذا یاتو ہم یہ کہیں کہ زندگی کے اپنے قوانین وسنتیں ہیں اور یا یہ مان لیں کہ انسان آزادوبااختیار ہے۔ اس وہم سے قرآن نے تعرض کیا ہےاور بتایا ہے کہ یہ قوانین اورسنن الٰہیہ ربانی ہیں،اللہ کی وحی نے ان کو مقرر کیا ہےاوراس کی کتاب حکیم کی آیات میں یہ بکھری ہوئی ہیں۔اوران کامحورانسانی ارادہ ہےتوانسان کےاختیارکااپنامقام ہےجس میں یہ آیت اہم ہے:اولما اصابتکم :اورجب تم کوایساضرر پہنچا جس کا دوگناضررتم پہنچا چکے ہوتوتم بول اٹھے کہ یہ کہاں سے آ گیا،کہو یہ تمہارے اپنے پاس سے ہے بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے(آل عمران:165)اور یہ ارشاد باری: یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ اس انعام کوجووہ کسی قوم پر کرتا ہےاس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اس کو بدل نہ دیں جوان کے نفسوں میں ہے بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے(الانفال:53)اورارشاد باری: بیشک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اس کونہ بدل ڈالیں جوان کے جی میں ہے۔(الرعد:11)اس کامعنی یہ ہے کہ سنن الٰہیہ ربانیہ سلبی وایجابی، قوت وتمکین اور ذلت وخواری دونوں حالتوں میں انسان کے تہذیبی عمل کے ساتھ ہی جاری ہوتی ہیں چونکہ یہ الٰہی قوانین ہیں اس لیے ہوکررہتے ہیں مگر ساتھ ہی یہ اختیاری بھی ہیں کہ انسان کے ارادہ وعمل سے مربوط ہیں لہٰذابالعموم قرآن میں قضیہ شرطیہ کے بطور ہی بیان کیاجاتا ہے کہ دویادو سے زائد باتوں میں یہ شرط ہوتی ہے کہ ایسا ہوگا یاایسا ہوتا تو جواب یوں اور یوں ہوا یا ہوتا۔اسی سے انسان کے ارادہٗ واختیارکاپتہ چلتا ہے کہ جواب کےحصول کے لیے معنیٔ شرط سے اس کافعل مربوط ہے مثال کے طور پر اللہ کا ارشاد: جوشخص نیک عمل کرے گا تو اپنے ہی لیے کرے گا اور جوشخص برائی کرے گا تو اس کا

وبال اسی پر آئے گا اور تیرا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں (فصلت :46) اور فرمایا: یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے، اور اللہ اپنے بندوں کے ساتھ ناانصافی کرنے والا نہیں (آل عمران:182) اور فرمایا: یہ بدلہ ہے اس کا جو تم نے اپنے ہاتھوں آگے بھیجا تھا اور اللہ ہرگز بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں (الانفال:51)
سنن الٰہیہ کے اس پہلو کا ثمرہ دو چیزوں میں ظاہر ہوتا ہے جو زمین کی تعمیر ایمانی میں اہم اصولوں کی ترجمانی کرتی ہیں، پہلی چیز ہے:

**اولا: تذکر و تدبر کا اصول اور ایام اللہ سے عبرت پکڑنے کا اصول جس کو فقہ الواقع الکونی کہہ** سکتے ہیں (یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق ہے کہ: اور ان کو اللہ کے ایام سے نصیحت کیجئے، اس میں ہر صبر کرنے والے اور شکر کرنے والے کے لیے یقیناً نشانیاں ہیں۔ (ابراہیم: ۵) (یعنی کائنات کی صورتِ حال کی سمجھ)۔ یہ امر الٰہی جس میں بتکرار سیر فی الارض (زمین میں سیر کرنا) پر، گزشتہ قوموں کے واقعات، ان کے انجام یعنی مکذبین کے انجام اور متقیوں کے انجام کو سمجھنے اور آفاق و انفس میں اللہ کی سنتوں کو جاننے پر اور اسرار حیات، ان کی منطقیت، حرکت اور محرکات کے ادراک پر ابھارا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ گزشتہ متمدن قوموں میں جو انقلاب حال ہوا، ان کی عزت و شان و شوکت ذلت و ادبار میں بدل دی گئی تو اس میں پائے جانے والے قوانین الٰہیہ کو جانیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حرکتِ حیات کائنات میں پائے جانے والے قوانین ثابتہ کے تابع ہے۔ اور انسان کی دوڑ دھوپ کو فریم ورک دیتی ہے۔ پھر یہ سنن الٰہیہ محض واقعات ہی نہیں ہیں بلکہ یہ اللہ کی وہ نشانیاں بھی ہیں جو قدروں سے متصل ہیں جن پر غور و فکر اور عبرت حاصل کرنی ضروری ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے عبرت حاصل کرنے کا حکم دیا ہے: لقد کان فی قصصہم عبرۃ: ان کے قصوں میں سمجھ دار لوگوں کے لیے بڑی عبرت ہے، یہ کوئی گھڑی ہوئی بات نہیں۔ بلکہ تصدیق ہے اس چیز کی جو اس سے پہلے موجود ہے۔ اور تفصیل ہے ہر چیز کی اور ہدایت و رحمت ہے ایمان والوں کے لیے (یوسف:111) تو خلافت ارضی، تزکیہ، اور زمین کی ایمانی تعمیر جیسے اسلامی تہذیبی قدریں سنن الٰہیہ کے راستہ سے ہی متحقق ہو سکتی ہیں اور تبھی ہو سکتی ہیں جب ان پر اور ان کے لیے عمل کیا جائے۔ اس میں

یہ اضافہ اور کرلیں کہ تذکر وتدبر میں ان کے جوہر اور اصول کو بھی سمجھا جائے۔ چونکہ حرکتِ حیات کی زندہ کوششوں کے عناصر، اور حیات طیبہ کے نتائج کا مقدمہ بھی یہی اصول ہوں گے اور یہی اصول نظام تمدن اور بہتر احوال معاش کے قیام میں بصیرت کی اساس بنیں گے اور یہی انسانوں کے کاموں کی کسوٹی ہوں گے جو ان کے کھرے کھوٹے کو الگ کر کے بتائیں گے۔ کہ اِس سے حقیقی و مؤثر عناصر کی اصول سازی ہوتی ہے۔ یہ محض آرزوؤں کی تعبیر نہیں ہے۔ اس وجہ سے اگر ہم یہ کہیں کہ امت مسلمہ کا تہذیبی اسٹیج سے غائب ہوجانا یا اس کی تہذیبی پسپائی جس وہ آج دوچار ہے اُس کے بڑے اسباب میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے سنن الٰہیہ پر غور فکر چھوڑ دیا ہے اس کے پس منظر، تاثیر وتفاعل سے عبرت لینی بند کردی اور زندگی کی تشکیل میں الٰہی نظم وتدبیر'' کے فہم واستخلاص یا ان سنن کو نیہ کو غفلت کے باعث اور ان کے غلط تصور کے سیاق میں پڑنے سے پہلوتہی کرنا شروع کردیا کہ یا تو اِن صورت بگاڑ دی، اِن کو خالی سمجھا یا ان سے دھوکہ میں پڑ گئی۔ درحقیقت یہ سنن الٰہیہ ایسے'' کلیات'' ہیں جو سبھی لوگوں کی تمدنی تگ ودو کو گوَرن کرتے ہیں اور مسلمان وکافر سب پر یکساں صادق آتے ہیں، اور اپنے ساتھ تعامل میں کسی کی جنبہ داری نہیں کرتے۔ ان میں کسی وہم یا جھوٹے دعوے کو راہ نہیں ملتی جو تہذیبوں کے قیام، ترقی یا ان کے سقوط وزوال کی تشریح میں رنگ ونسل کو کوئی کردار دیتے ہوں اور ان کی روشنی میں تبدیلی وترقی کے قوانین کو مربوط کرتے ہوں (سیف الدین عبدالفتاح، مدخل القیم صفحہ:192)۔

یوں مسلمان کو وہ معیار مل جاتا ہے جس سے وہ توضیح وتقویم میں اپنی تمدنی حرکت کی تقویم کرتے ہیں اور اپنے تہذیبی کاموں کو سنن الٰہیہ کے معیار پر جانچتے اور ان کے ذریعہ ایجابی فروغ کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں کے ذریعہ فعالیت وغلبہ کے عناصر کو حاصل کرتے ہیں۔ تو اگر آج کی امت اور سابقہ امتوں کے احوال میں تشابہ ہے تو ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ جو سنن الٰہیہ ان پر صادق آئی تھیں وہ اِس پر بھی آئیں گی۔ زیاد بن لبید کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے کہا نبی ﷺ نے کسی چیز کا تذکرہ کیا اور اس کے بعد فرمایا: یہ اس وقت ہوگا جب علم اٹھ جائے گا، زیاد کہتے ہیں تو ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! جب ہم قرآن پڑھ رہے ہوں گے، اُسے اپنے بیٹوں کو سکھائیں گے اور وہ اپنے بیٹوں کو سکھائیں

گے اور قیامت تک یونہی چلتا رہے گا،توعلم کیسے اٹھ جائے گا؟ فرمایا: اے ام لبید کے بیٹے ،خدا تیرا بھلا کرے! میں تو یہ سمجھتا تھا کہ تم اہل مدینہ میں سب سے زیادہ سمجھ بوجھ والے ہو، کیا یہ یہودی اورعیسائی تورات وانجیل نہیں پڑھتے ہیں کیاان کوان سے کچھ بھی فائدہ ہوتا ہے؟(امام احمد نے مسند میں اس کی تخریج کی ہے 4/160 حدیث نمبر:17508 اور حاکم نے مستدرک میں روایت کی ہے ۔ 3/681 حدیث نمبر: 6500 اور کہا کہ یہ حدیث صحیح اور شیخین کی شرطوں پر ہے مگر انہوں نے اس کی تخریج نہیں کی ) یعنی اللہ کے رسول کا یہ قول کہ ''یہ یہودی اورعیسائی تورات وانجیل نہیں پڑھتے ہیں کیاان کوان سے کچھ بھی فائدہ ہوتا ہے؟'' یہ مستقبل کے واقعات کی تفسیر تھی۔اور یہ اس کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ مستقبل کوان سنن الٰہیہ کے ذریعہ دیکھتے تھے جو سبھی کو عام ہیں۔یعنی جو گزشتہ امتوں پر منطبق ہوا وہ امتِ قرآن پر بھی منطبق ہوگا اگر وہ انہیں جیسے کام کرے گی (جودت سعید،حتی یغیر وامابانفسہم ،بحث فی سنن التغیر للنفس والمجتمع (دمشق، ۱۳۹۷ھ 1977 صفحہ 120) اس سے سنن کونیہ کو اسلامی نقطہ نظر تہذیبی فقہ کے اصولوں میں اہم طریقہ کا مقام حاصل ہوجاتا ہے۔اور وہ ایک بہترین علمی معیار کی نمائندہ ہوجاتی ہے جو منضبط ہے۔

اور اپنی خصوصیات ومشابہتوں میں انسانی مظہر کے عناصر کی تفہیم کرتا ہے جیسا کہ وہ اس وحی اور کائنات دونوں کے مطالعہ کے لیے علمیاتی اصول بنادیتا ہے کیونکہ زمین کی ایمانی تعمیر میں سنن کونیہ کا راستہ فہم وتطبیق میں وحی کی قرأت کو عالمِ دنیا اور اس کے موجود سے مربوط کردیتا ہے، کہ وہ ، جتنے بھی تہذیبی کام ہیں، سب کو محیط ہے، جیسا کہ وہ کائنات کی قرأت کو جائزہ وتقویم عمل ونتیجہ ہر طرح سے وحی اور اس کے ضوابط سے مربوط کردیتا ہے۔یہی چیز اللہ کے قول **افلایتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا**: کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں (محمد:24 ) سے سمجھ میں آتی ہے۔

اس قرأت کے ذریعہ ہی جو وحی اور ضوابط وحی اور کائنات اور اس کے واقعات کی جامع ہے ،ہم ان سنن الٰہیہ کو جان سکتے ہیں جو تہذیبی عمل کو گورن کرنے والا پورا نظام بناتے ہیں، جیسا کہ وہ داخل وخارج اور خود اور غیر کے درمیان رشتہ کے عناصر کو بھی گورن کرتے ہیں۔درج ذیل طریقہ پر ہم

ان میں سے اہم سنن کونیہ کی طرف اشارہ کریں گے (ان قوانین الٰہیہ اوران کی تعداد کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو: عبدالکریم زیدان السنن الالٰہیہ فی الامم والجماعات والافراد فی الشریعۃ الاسلامیۃ ،ابراہیم الوزیر،علی مشارف القرن الخامس عشر الہجری ،دراسۃ للسنن الالٰہیہ والمسلم المعاصر،الطیب برغوث ،مدخل الی سنن الصیر ورۃ الاستخلافیۃ قرائۃ فی سنن التغیر الاجتماعی ،الطیب برغوث ،الفعالیۃ الحضاریۃ والثقافۃ السنیۃ ،محمد ہیشور،سنن القرآن فی قیام الحضارات وسقوطہا،راشد سعید شہوال ،السنن الربانیہ فی التصور الاسلامی)۔

☆**انقلاب وتبدیلی کے قوانین:** یہ قوانین اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر وقت اور ہر آن تغیر کے قابل ہے اور یہ تبدیلی اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک افراد اور قوموں کے اندرونی وبنیادی نظام کو نہ جانا جائے گا جو افراد اور قومیں اس انقلاب کو چاہتی ہیں۔اور جب تک ان ظاہری اور مخفی شرطوں کو نہ جانا جائے گا جو واقعات کی بناو تشکیل میں اہم رول ادا کرتی ہیں اور جب تک ان کے اثرات ونتائج سے واقفیت نہ ہو (جن کو کہ سنن الٰہیہ کی شعوری قرأت کہا جاسکتا ہے)۔

**اس بارے میں اللہ کا یہ قول بنیاد ہے:** بے شک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اس کو نہ بدل ڈالیں جو ان کے جی میں ہے (الرعد:11) اور یہ تبدیلی اگر چہ فرد انسان کی ذمہ داری ہے جو نقطہ آغاز ہے لیکن سنت اجتماعیہ ہونے کے اعتبار سے اس کے ثمرات تبھی حاصل ہوں گے جب وہ پورے معاشرہ کو محیط ہو، اس کے تمام عناصر اور اس کی اجتماعی صورتِ حال تمام مشمولات اور زندگی کو حرکت دینے والے تمام وسائل سمیت اُس میں آجاتے ہوں ۔تو آیت تغییر کو قوم سے جوڑتی ہے فرد واحد سے نہیں (حتی یغیر واما بانفسہم صفحہ 33) اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انقلاب فرد کا کام نہیں وہ اجتماعی عمل ہے اور پوری قوم کے کرنے کا ہے۔اسی وقت قوم دنیا کو کچھ دے سکے گی ورنہ کچھ نہ کر سکے گی۔اللہ تعالی نے فرمایا: ڈرو اس فتنہ سے جو صرف خاص لوگوں کو ہی نہیں پہنچے گا جو تم میں سے ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں (الانفال:25) اسی کو نبی ﷺ نے بیان فرمایا جب ام المؤمنین زینب بنت جحشؓ نے پوچھا تھا یارسول اللہ کیا ہم اس وقت بھی ہلاک ہوجائیں گے جب ہمارے درمیان صالحین ہوں گے؟

فرمایا: ہاں جب شر وفساد زیادہ ہو جائے گا (اس کی تخریج امام مسلم نے اپنی صحیح میں کی ہے کتاب الفتن واشراط الساعۃ باب اقتراب الفتن 4/2207 حدیث نمبر: 2880) تغییر کا ارادہ حقیقی بوجھ بننے کی حالت سے نکلنے کا سامان ہے جو کہ تہذیبی نکمے پن کی حالت ہے اور تبدیلی ہی حالت عدل یا تہذیبی استقامت کی حالت میں لے جاتی ہے (دیکھیں جودت سعیدالانسان کلاوعدلا (دمشق: دارالفکرالمعاصر) جیسا کہ اللہ نے فرمایا: اور اگر وہ نکلنا چاہتے تو ضرور وہ اس کا کچھ سامان کر لیتے ،مگر اللہ نے ان کا اٹھنا پسند نہیں کیا اس لے انہیں جما رہنے دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو (التوبہ: 46) اسی قسم سے وہ دقیق اشارۂ نبوی ہے جب آپ ﷺ سے پوچھا گیا تھا کہ قیامت قریب ہے؟ تو آپ نے فرمایا تھا: تم اُس کی کیا تیاری کر لی ہے؟ (صحیح البخاری، کتاب فضائل الصحابۃ، باب مناقب عمر بن الخطاب 3/1349 حدیث نمبر: 3485)۔

تو تیاری اور سامان یہی دو چیزیں مستقبل کو ڈھالتی ہیں صرف آرزوؤں سے کچھ ہونے والا نہیں! لہٰذا جب ارادہ ہی نہیں پایا جائے گا تو مذکورہ حالت سے نکل بھی نہیں سکتے ۔ اور جو بھی اس کا سامان کریں گے وہ ضائع ورائگاں جائے گا۔ مگر جب ارادہ میں مضبوطی ہوگی تو وہ اس حالت سے نکلنے کی کلید ہوگی اور اس کی تیاری اور سامان کا بھی فائدہ ہوگا اس میں ہر طرح کے ظن اور وہم سے دور رہنا چاہیے جو بعض ذہنوں میں پیدا ہو سکتا ہے کہ امت آج جس تہذیبی پس ماندگی میں پڑی ہوئی ہے اُس سے تو کوئی خدائی چمتکار اور معجزہ ہی اُسے نکال سکتا ہے، دنیا والے کتنی ہی کوششیں کر لیں سب بے کار جائے گی۔ اور یہ کہ امر واقع میں تبدیلی محال ہے۔ یہ وہم عروج وانقلاب کے اسباب سے لوگوں کو دور کرتے ہیں۔ نیز یہ خلافتِ ارضی ،تزکیہ نفس اور زمین کی ایمانی تعمیر کے تقاضوں سے پہلو تہی کرنا اور خدا کی اس دقیق سنت سے غفلت میں ڈالنا ہے کہ اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود کو بدلنا نہ چاہے اور یہ تبدیلی قوم پر باہر سے نافذ نہیں کی جا سکتی ،یہ تو ان کے اندر سے اٹھنی چاہیے ۔ان کے اپنے عزم وارادہ اور اختیار سے ہونی چاہیے کہ اگر انسان اپنے آپ کو نہیں بدل سکتا تو باہر کو کیا خاک بدلے گا۔ یہ بات ہم یونہی ہوا میں نہیں کر رہے ہیں یا آیت کریمہ سے برکت لیتے ہوئے نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ یہ ایک سائنٹیفک بات ہے، جس کی سائنٹیفک صحت کو دقیق معیار پر

تولا جاسکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان ہو یا غیر مسلم وہ اپنے اطراف و ماحول کو بدل ہی نہیں سکتا اگر وہ پہلے اپنے آپ کو نہ بدل سکے۔

یہ ایک سائنٹیفک حقیقت ہے جس کو اللہ نے قرآن میں ایک قانونی کلیہ کے طور پر بیان فرمادیا ہے۔ یہ ان سنن الٰہیہ میں سے ہے جن پر حیات انسانی کی گاڑی چل رہی ہے (مالک بن نبی ،دور المسلم ورسالتہ فی الثلث الاخیر من القرن العشرین،طبع ثانی بیروت مؤسسۃ الرسالہ،1396ھ صفحہ 52)۔

☆ **عطاء الٰہی کی سنتیں:** یہ سنتیں تمام انسانوں کے لیے عام ہیں بحیثیت انسان ہر انسان ان سے مستفید ہوتا ہے۔

یہ مخلوقات میں اللہ تعالیٰ کا عادلانہ قانون ہے، جو کسی کی طرف داری نہیں کرتا۔تو جتنا انسان اللہ کی سنن کو نبیہ کو سمجھے گا ان کو برتے گا اوران کو کام میں لائے گا اور تمدن میں ان کے عناصر تکوین کو آگے بڑھائے گا اور جتنا ان کا اکتشاف کرے گا اوران کا التزام کرے گا اُسی قدر یہ سنتیں اس کو نتائج دیں گی جو اسکے تہذیبی کاموں سے متناسب ہوں گی،جس میں نہ اس کے رنگ کو نہ نسل کو اور یہاں تک کہ اُس کے کفر کو بھی نہیں دیکھا جائے گا۔ یہ تمدن کی ان سنتوں میں سے ہے جن میں نہ تخلف ہوتا ہے اور نہ تبدیلی۔ جیسا کہ فرمایا: ہم ہر ایک کو تیرے رب کی بخشش میں سے پہنچاتے ہیں،اِن کو بھی اوراُن کو بھی۔ اور تیرے رب کی بخشش کسی کے اوپر بند نہیں (الاسراء:20) اگرچہ قرآن عطاء کے لیے اللہ کی ایک جاری سنت کو بھی بتا تاہے اور وہ یہ ہے کہ ''تہذیبی دین'' اگر ایمان باللہ کے ساتھ ساتھ ہوتو زمان و مکان میں مدارج ترقی ، بناء اور تمدن میں اس سے برکت اور وسعت آتی ہے۔ چنانچہ فرمایا: اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور ڈرتے تو ہم ان پر آسمان وزمین کی برکتیں کھول دیتے،مگر انہوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کو پکڑ لیا ان کے اعمال کے بدلے (الاعراف:96) اور فرمایا: مجھے وحی کی گئی ہے کہ یہ لوگ اگر راستہ پر قائم ہوجاتے تو ہم ان کو خوب سیراب کرتے (الجن:16) لیکن اگر اس دین میں ایمان باللہ نہ ہوتو وہ آخر میں ''دنیا کی زیب وزینت'' بن کر رہجاتی ہے اور دیر سویر کہیں نہ کہیں اپنے مقاصد کے خلاف جا کر رہتی ہے۔

☆ابتلاء اوراس کے ساتھ کے اسلامی تصورات : جن میں فتنہ ہے جولوگوں کے ایمان اورصداقت کو پرکھتا ہے ۔مصیبت ہے جوان کوان کے گناہ یاددلاتی ہے۔اوران کےتہذیبی اختیار سے ان کی مسئولیت یاددلاتی ہے اورانذار ہے جولوگوں کوجلد ہی ملنے والی سزا سے یاذلیل کرنے والے حساب سے آگاہ کرنے کا نام ہے۔اورمثبت صبروتحمل ہے جولوگوں کواس پرابھارتا ہے کہ وہ مصائب پر قابو پائیں (یہ وہ تصورات ہیں جن میں وہ اصول پوشیدہ ہیں جوانسان کوخلافت صحیحہ کے منہج کی طرف بلاتے ہیں اوراس کی تہذیب میں جوبغاوت ہے اس کی حقیقت سے اسے آگاہ کرتے ہیں۔اسی وجہ سے ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں جوبحران ہے جوکہ مادیت پرمبنی ہے اوراقدار سے خالی ہونا ہے اس کی جگہ مذکورہ تصورات کولایا جائے)۔

اورصبرایسی چیز ہے جوزندگی بھرآدمی کے ساتھ رہتی ہے اس میں اس کا امتحان بھی ہوتا ہے اورتذکیربھی۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:وھــــو الــــذی :وہی ہے جس نے تمہیں ایک دوسرے کا جانشین بنایااورتم میں سے ایک رتبہ دوسرے پر بلند کیا،تا کہ وہ آزمائے تم کواپنے دیے ہوئے میں تمہارا رب جلدسزادینے والا ہے اور بے شک وہ بخشنے والامہربان ہے (الانعام:166) یعنی زندگی کوئی ہمیشہ رہنے والی چیزنہیں جیسے لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ وہ ایک جہد مسلسل کا نام ہے جس میں آدمی مبتلا ہوتا ہے اور یاتواس کوصبروشکراوراجرملتا ہے یااس کی رہنمائی،تربیت اورتقویم ہوتی ہے۔اوراس دائرہ میں ہوتی ہے جہاں امت فعال ہواوروہ غلبہ کے عناصرکوتلاش کرے۔اوراس دائرہ میں ہوتی ہے جہاں چیلنجوں کا اورتہذیبی دباؤ کا اس کوسامنا کرنا ہے ۔جوکہ امت کومختلف میدانوں میں درپیش ہیں یعنی بقاء ،تعمیراورترقی کے چیلنج۔اسی طرح وہ چیلنج جواس کوقوت،کمزوری،عزت اورذلت اورپس ماندگی اورغلبہ کے متضاد احوال میں درپیش ہیں۔اسی طرح وہ چیلنج ہیں جوفتنوں یاخواہشات کی راہ سے آتے ہیں۔جوایک مسلمان کےشعوربصیرت کوجگاتی رہتی ہیں جیسا کہ فرمایا: ونبلوکم :اورہم تم کواچھی حالت اوربری حالت سے آزماتے ہیں پرکھنے کے لیےاورتم سب ہماری طرف لوٹائے جاؤگے(الانبیاء:35)

**تدافع اورتداول کے قوانین:** تدافع ہوتا ہے حق کے اصولوں کے نظام اور باطل کے اصولوں کے نظام کے درمیان،اوران اقدار میں سے ہے جوتہذیبی حرکت کے لیے فعال اورمثبت ہیں

اوران سے کائنات میں تمدن بڑھتا ہے اور اس کی اصلاح ہوتی ہے۔اسی طرح ان سلبی اقدار میں سے ہے جو تہذیبی حرکت کو فاسد کرتی ہیں اور جن سے کائنات میں تخریب، سرکشی اور فساد انگیزی پیدا ہوتی ہے، صلاح اور فساد کی قوتوں کے مابین یہ تدافع اللہ کی مستقل سنتوں میں سے ہے جو قیامت تک قائم رہیں گی اور اگر یہ تدافع نہ ہوتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا اور تمدن برباد ہو جاتا۔اللہ نے فرمایا: اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا رہتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا مگر اللہ زمین والوں کے لیے فضل و کرم کرنے والا ہے (البقرۃ 251) اور فرمایا: اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے سب ڈھا دیے جاتے (الحج : 40) اسی تدافع میں تہذیبوں کے قیام کی اللہ کی سنت جاری رہتی ہے۔جیسا کہ فرمایا: اگر تم کو زخم پہنچے ہیں تو دوسروں کو بھی ہی جیسے زخم لگے ہیں (آل عمران:140) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی طور پر تہذیب ایک ایسے عمل کا نام ہے جس میں الٹ پھیر ہوتا رہتا ہے۔لیکن زندگی میں اس تدافع و تداول کے دائمی موازین میں سے یہ ہے کہ اگرچہ ایک بار باطل قوت غالب آجائے تو جیت بہرحال اہل حق کی ہی ہوگی۔جیسا کہ فرمایا: بے شک اللہ فساد کرنے والوں کے عمل کو درست نہیں کرتا (یونس:81) اور فرمایا: اور اسی طرح اللہ حق و باطل کی مثال بیان فرماتا ہے (الرعد:17) اسی لیے صبر کا حکم دیا گیا ہے کہ: پس آپ صبر و تحمل سے کام لیں بلاشبہ انجام انہیں کا بہتر ہوگا جو تقوی و صبر کرنے ہیں (ہود:49) اللہ کا قانون جاری ہے سنن الٰہیہ اپنا کام کر رہی ہیں جیسا کہ فرمایا: اللہ نے یہ لکھ دیا ہے کہ یقیناً میں اور میرے رسول غالب آ کر رہیں گے (المجادلہ:21) دنیا میں جو تصورات آج رائج ہو رہے ہیں مثال کے طور تہذیبوں کی کشمکش، تہذیبوں کا تصادم، کلچرل وار، تاریخ کا خاتمہ وغیرہ ان نظریات کی گونج مشرق و مغرب میں ہر جگہ ہے اور حالیہ دنوں میں اسلام اور مغرب کے درمیان کے تعلقات کو اِنہیں نظریات کی عینک سے دیکھا جا رہا ہے۔یہ نظریات جس اساس پر مبنی ہیں وہ اپنے اور دوسرے کے درمیان دشمنی اور عداوت کے رشتہ کی اساس ہے۔اور جو ان کا انکار کرے اور مادہ کے

غلبہ کو نہ مانے اور سرکشی اور عالم انسانیت پر ان کی اجارہ داری پر ایمان نہ لائے اس کو کاٹ ڈالا جاتا ہے ،اس کے بالمقابل اسلام جو متبادل دنیا کو دیتا ہے وہ تدافع اور تداول کے تہذیبی تصور ہے۔ یہ نظریات ایسے رویہ کو بتاتے ہیں جس میں اپنے آپ کو بڑا اور مرکز بنا لیا جاتا ہے اور ساری دنیا کو اپنے مصالح ومفادات کے مطابق چلانے کی کوشش ہوتی ہے۔اور دوسرے کے لیے صرف یہی چارہ کار رہجاتا ہے کہ وہ موجودہ تہذیبی قافلہ کے پیچھے چلے اور اس کا ساتھ دے، چاہے اس پر ظلم ہو رہا ہو مگر اُسے اپنے آپ کو اسی سے ایڈ جسٹ کرنا ہوگا۔اس کے برعکس تدافع اور تداول کا تصور ہے کیونکہ یہ اصلا تہذیبی عمل کو آگے بڑھانے کا نام ہے،اس کی بہت ساری قسمیں ہیں،اور جب غیر زیادتی کرے اپنے نظریہ کو تھوپنا چاہے، اپنے طریقہ پر چلائے، یا تخریب وفساد پھیلائے تو اس صورت میں جہادِ اسلامی بھی تدافع کی ایک شکل ہوجاتی ہے۔لیکن محض قوموں اور مذہبوں کے اختلاف سے ہی جہاد نہیں چھیڑ دیا جاتا، ساتھ ہی احسان ، تعارف ،تراحم اور تعاون بھی اس اسلامی تصور کی خصوصیات میں سے ہیں جیسا کہ فرمایا: اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہیں (فصلت :34) اور فرمایا: اے لوگو،ہم نے تم کو ایک مرد وعورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں بدل دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو! (الحجرات :13) معلوم ہوا کہ ’’تعارفوا‘‘ بھی اسلامی نقطہ نظر میں انسانی وجود کا ایک مقصد ہے جو کہ ’’کشاکش‘‘ کو اپنے ضوابط اور شرعی موازین کے ساتھ وجود شرعی کا ایک جز تو قرار دیتا ہے لیکن اس کا محور نہیں ،جیسا کہ اوپر کے تصورات قرار دیتے ہیں۔ان اشکال اور اسلامی مقاصد کے مطابق ’’تدافع‘‘ اور ’’تداول‘‘ کا مفہوم یہ نہیں کہ دوسرے کو دور کیا جائے یا اسے غلام بنالیا جائے یا اس کا خاتمہ کردیا جائے بلکہ وہ آفرینش عالم کے مقصد کو بتاتا ہے ،جس میں غیر کا بھی اہم مقام ہے اور ہمیشہ اُس کو ’’دشمن‘‘ کے دائرہ میں نہیں رکھا جائے گا جب تک وہ خود ہی اپنے آپ کو دشمن نہ سمجھ لے ،کیونکہ خلافتِ ارضی جس کا اسلام داعی ہے اُس کی بنیاد دوسرے کے حق کا پاس ولحاظ رکھنا ہے (سیف الدین عبدالفتاح،العولمۃ والاسلام صفحہ 132)۔

☆**سنن تحذیریہ:** (تہذیبی زوال کے قوانین) یہ قوانین ہم کوان کاموں اورصفات سے خبردار کرتے ہیں جن سے قوموں کو برحذر رہنا چاہیے، کیونکہ تہذیبی جدوجہد میں ان کے اثرات سلبی ہوتے ہیں اوران کو کمزوری اور عاجزی لاحق ہوجاتی ہے۔

یا یہ سب برے افعال وصفات مجموعی طور پر قوم کے تہذیبی وجود پر برااثر ڈالتے ہیں جو اس کی بربادی کا اعلان کرتے ہیں۔اسی وجہ سے یہ بھی اہم قوانین ہیں کہ یہ ایک ہی ساتھ ''تہذیبی تشویش'' اور' تہذیبی تحفظ' کو بتاتے ہیں، کیونکہ وہ بنیادی طور پر اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ سلبی فعل بالآخر کئی سلبی نتائج دیتا ہے (سیف الدین عبدالفتاح، مدخل القیم صفحہ 199)۔

اوراس سلبی فعل اوراس کے سلبی نتائج کے فہم سے لازمی ہے کہ کئی چیزیں پیدا ہوں گی مثلاعبرت کا حصول ،انجام پرغورکرنااورمثبت قدم اٹھانا۔ان میں بھی سب سے پہلے تفکر، نصیحت پذیری اورعبرت لینا آئے گا۔اور یوں تہذیبی تحفظ کا حصول ہوگا۔مثال کے طور پر قرآن میں اس آگاہ کیا گیا ہے کہ قوم کے بڑے لوگوں کے فساد سے ،عیاشی میں پڑنے سے اور سرکشی واستبدادواستکبار کی روش اورظلم اورظالموں کی طرف جھک پڑنے کے نتائج نہایت خراب ہوتے ہیں اورانجام کار ایسی قومیں برباد ہوکر رہ جاتی ہیں (ان تحذیری سنتوں کی اساسات کے لیے دیکھیں، محمد صادق عرجون، سنن اللہ فی المجتمع من خلال القرآن ،(الریاض الدار السعودیہ للنشر 1994 صفحہ 36-33) مثلا فرمایا: لیکن تو نے ان کو اوران کے آباء واجداد کو دنیا کا سامان دیا یہاں تک کہ وہ تیری یاد سے غافل ہوگئے اور برباد ہوکر رہ گئے (الفرقان:18) اور یہ خیال تمہارے دلوں کو بہت بھلا نظر آیا اورتم نے بہت برے گمان کیے اورتم برباد ہوکر رہ گئے (الفتح:12) کتب سنت وحدیث میں فتن اور پیشین گوئیوں کی قبیل سے جو چیزیں صحیح وارد ہوئی ہیں جو ظہوراسلام اورغربت اسلام ،مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب اوراجتماعی معاملات کے سلسلہ میں آئی ہیں وہ تحذیری سنتوں کو سمجھنے کی بہت بڑی کلید ہیں کہ ان کے موضوعات امت کے مستقبل سے تعلق رکھتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ امت میں بڑی بڑی تبدیلیاں آئیں گی اوراس سے آگاہ کرتی ہیں کہ تغیرات اورانقلاب حال کہیں ایسا نہ ہو کہ شریعتِ الٰہی اورمنہاج نبوی میں افراط وتفریط

تک لے جائیں۔مثال کے طور پر آپؐ نے فرمایا: قریب ہے کہ قومیں تم پر ٹوٹ پڑیں جیسے بھوکے کھانے پر ٹوٹ پڑتے ہیں ۔کہنے والے نے کہایاٰ رسول اللہ! کیا ہم اس وقت بہت کم ہوں گے ؟ فرمایا:نہیں،تم اس وقت بہت بڑی تعداد میں ہوگے مگرتم ایسے ہو چکے ہوگے جیسے سیلاب کا جھاگ ہوتا ہے ،اللہ تمہارے دشمنوں کے دل سے تمہارارعب نکال دے گا اورتمہارے دلوں میں وہن اور کمزوری ڈال دے گا۔ایک کہنے والے نے کہا:یاٰ رسول اللہ! یہ وہن کیا ہے ؟ فرمایا: دنیا کی محبت اور موت کا خوف (اس کی تخریج ابوداؤد نے اپنی سنن میں کی ہے 4/111 حدیث نمبر:4297اسی کے مثل امام احمد نے مسنداحمد میں روایت کی ہے 5/278حدیث نمبر:2245) اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم بیع عینہ (مشروط تبادلہ والی بیع ) کرنے لگو گے ،کھیتی پر راضی ہوجاؤ گے اور گایوں کی دموں کو پکڑلو گے اور جہادکو چھوڑ دو گے تو اللہ تم پر ذلت مسلط کردے گا، جو اس وقت تک دور نہیں ہوگی جب تک تم اپنے دین کی طرف نہ پلٹو گے (اس کی تخریج ابوداؤد نے اپنی سنن میں کی ہے 3/374 حدیث نمبر:3462اوربیہقی نے سنن کبریٰ میں 5/316 حدیث نمبر:10484 اوراسی کے مثل امام احمد نے اپنی مسند میں روایت کی ہے :2/28حدیث نمبر:4825)تو ان کواوران جیسی دوسری احادیث کواس روشنی میں دیکھا جانا چاہیے کہ یہ مسلمانوں کوایسے کاموں میں پڑنے سے روکنے کی تنبیہ ہیں جوفسادِ زمانہ پردال ہوں،اورفساد کی بجائے اصلاح حال کی کوشش کرنی چاہیے۔یعنی یہ منبہات اورتہذیبی محرکات ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ مستقبل میں اگرمسلمان ان ان کاموں اورمشغولیتوں میں پڑ جائیں گے ،اپنے مقصدوجود کوبھلابیٹھیں گے ،الوہی رہنمائی کوخیرباد کہہ دیں گےتو وہ فلاں فلاں برے انجام سے دوچار ہوں گے ۔یعنی یہ تنبیہات ہی نہیں بلکہ اس موقع پرخطرہ میں پڑنے سے روکنے کےمحرکات بھی ہیں جوان کو یہ استعداد دیں کہ وہ انذارنبوی سے کس طرح عبرت پذیر ہوں گے اور کیسے اس سے بچیں گے (یہ جتنی تنبیہات ہیں وہ نبوت کے وظائف اربعہ، شہادت،بشارت،انذاراوردعوت کے سیاق میں آتی ہیں۔ان وظائف کافہم صحیح اوراحادیث نبویہ کوان پرمحمول کرنے سے ہی خلل اورغلطیوں سے بچا جاسکے گا۔کیونکہ بشارت کا فرض انسان کومایوسی سے بچا کراُسے جدوجہد پرآمادہ کرتا ہے،انذار سے انسان کی غفلت وسستی سے حفاظت ہوتی ہے۔ اور دعوت انسان کے تمام رشتوں اورسرگرمیوں کومتحرک کرنے کا وسیلہ

ہے۔ملاحظہ ہو،سیف الدین عبدالفتاح،الدراسات المستقبلیہ فی عالم المسلمین صفحہ 443) اور کس طرح مسلمان کا عمل انحراف کی طرف مائل نہ ہوگا اور وہ راہ سے نہ بھٹکے گا۔اس لیے فتنوں سے واقفیت سے انسان کو فتنہ کی حالت پر قابو پانے اور اس کی شدت میں کمی لانے کی طاقت مل جاتی ہے۔یہ تقدیر کو تقدیر ہی کے ذریعہ زیر کرنا ہوا۔اور ایک تقدیر سے دوسری تقدیر کی طرف جانا ہوا۔دوسرے معنی میں یہ حدیثیں اگر ہم ان کو ٹھیک طرح سے پڑھیں اور صحیح منہج کے مطابق پڑھیں تو یہ ہم کو قوت دیں گی،تہذیبی امکانات ہمارے لیے روشن کریں گی اور فتنوں میں گرفتار ہونے سے بچائیں گی اور ان کا سامنا کرنے اور اصلاح احوال کی قوت دیں گی۔میں سمجھتا ہوں کہ یہی اصل میں ان کی اہم غرض ہے اور ''اگر لوگ فتنہ سے نکلنا چاہتے ہیں تو اس کی تیاری ضرور کرتے ہیں''۔

اس سیاق میں ایک باشعور اور صاحب عقل مسلمان فتن،اشراط ساعہ اور پیشین گوئیوں والی حدیثیں پڑھ کر ان سے ان بہت سے تہذیبی طور طریقوں اور کاموں کا استخراج کر سکتا ہے جو راست یا بالواسطہ قوت،کمزوری،نصرت اور شکست کے مختلف احوال پر دلالت کرتے ہیں۔اور ان سے تہذیبی چیلنجوں کا ایک نظام تشکیل دیا جا سکتا ہے جس سے ہمارے لیے یہ ممکن ہو جائے گا کہ مستقبل کا نقشہ رسول اکرم ﷺ کے اقوال کے مطابق ترتیب دے لیا جائے۔اس میں یاس و قنوطیت پاس نہ پھٹکے گی۔نہ ہی ان چیزوں کا مطالعہ یوں کیا جائے گا کہ:

جو کام سے روکے اور فعالیت کو ختم کر دے،جس میں ان احادیث کا مطالعہ اس طریقہ پر ہو کہ معنی ہی بدل کر رہ جائیں کہ ہم ان میں اس صورت حال کے نتیجوں سے آگاہی نہ پا سکیں گے جن کو چشم بصیرت سے دیکھ کر ہمیں نبرد آزما ہو جانا چاہیے۔اس کے برعکس ہم ان کو لامحالہ ہو کر رہنے والے حادثوں کی خبر کے طور پر لیں جو لازما ہوں گے اور ہم بس ان کا انتظار ہی کر سکتے ہیں۔اگر بات یوں ہوتی تو اس کا مطلب ہوتا کہ انسان مجبورِ محض ہے اُسے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔اسی معنی کو مدنظر رکھ کر حضرت علیؓ نے فرمایا: ''دھت تیرے کی،شائد تم نے اس کو تقدیر کا فیصلہ اور ہونی سمجھ لیا ہے،(ایسا نہیں ہے) کہ اگر ایسا ہوتا تو وعدہ،وعید،ثواب و عقاب کا کوئی مطلب ہی نہیں بنتا،تب

توکسی گنہ گارکواللہ کی طرف سے کوئی ملامت نہیں ہوتی نہ نیکی کرنے والے کی تعریف ہوتی اور نہ وہ گنہ گار کے مقابلہ میں ثواب کا مستحق ٹھیرتا یہ تو بت پرستوں، شیطانوں کے لشکروں اور اللہ کے دشمنوں کی بات ہے(کنزالعمال 1/180)۔

**سنن التلازم:** یہ وہ سنن الٰہیہ ہیں جو حرکتِ حیات میں عروج وزوال کے بارے میں متلازم قوانین کو بتاتے ہیں،مثال کے طور پر: (زیادہ کی گنجائش نہ ہونے کے باعث یہاں ہم ان متلازم قوانین کے بنیادی فکر اور نصوص کی ان پر دلالت پر اکتفاء کررہے ہیں،ان کی تفصیل نہیں دے رہے،آئندہ ایڈیشنوں میں اس کی تلافی کی جاسکتی ہے(ناشر)۔

☆طاعت ونصرت اور نافرمانی وہزیمت کے مابین تلازم: اس کے بارے میں ارشادربانی ہے: اے ایمان والو اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدمی سے نوازے گا (محمد:11-7)۔

☆مادی ومعنوی قوتوں کے اسباب اختیار کرنے نہ کرنے کے درمیان تلازم: ان میں یہ چیز ہے کہ مادی ومعنوی اسباب کی امت مالک ہوگی، ان کی تیاری کرے گی اور مقاصد کی تکمیل کے لیےان سے کام لے گی تو امت کا تہذیبی وجود محسوس کیا جائے گا جیسا کہ فرمایا:

اوران کے لیے جتنی قوت فراہم کرسکو ضرور کرو(الانفال:70)۔

☆اختلاف وانتشار اور قوموں کی ناکامی وشکست کے مابین تلازم: اللہ نے فرمایا: اور اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی اور آپس میں جھگڑو نہیں، کہ اس طرح تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی (الانفال:46) اس قانون کی عمومیت اور تلازم کو نبیؐ نے یوں بیان فرمایا: تم لوگ آپس میں اختلاف نہ کرو کہ تم سے پہلے کی قوموں نے اختلاف وانتشار کیا تو وہ ہلاک ہوگئیں (اس کی تخریج بخاری نے کی ہے: کتاب الاستقراض باب مایذکر فی الاشخاص والملازمۃ 2/849 حدیث نمبر:2279)۔

☆اسکتبار اور تمدنی چھین جھپٹ اور کمزوری واستخفاف کے مابین تلازم: اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو کم سمجھنے کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: پس اس نے اپنی قوم کو حقیر سمجھا پھر بھی

انہوں نے اس کی اطاعت کی بلاشبہ وہ لوگ فاسق تھے ۔ پھر جب انہوں نے ہم کو غصہ دلایا تو ہم ان سے بدلہ لے لیا پس ان سب کو غرق کر دیا، پھر ہم ان کو ماضی کی داستان بنا دیا اور دوسروں کے لیے ایک نمونۂ عبرت (الزخرف:56-54)۔

☆ظلم وسرکشی اور قوموں کی ہلاکت کے مابین تلازم: فرمایا: اور ہم نے کتنی ہی بستیاں ہلاک کر دیں جو اپنے سامانِ معیشت پر نازاں تھیں ، پس یہ ہیں ان کی بستیاں جو ان کے بعد آباد نہیں ہوئیں مگر بہت کم، اور ہم ہی ان کے وارث ہوئے اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک ان کی بڑی بستی میں کسی پیغمبر کو نہ بھیج لے جو ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ہم ہر گز بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں مگر جب کہ وہاں کے لوگ ہی ظالم ہوں (القصص:59-58)۔

## ☆قوموں کے تہذیبی زوال اور اخلاقی زوال کے مابین تلازم:

کیونکہ جس قدر قوموں میں اخلاق ہوتا ہے اسی قدر وہ تخلیق کرتی ہیں ان کو اور بقاء ملتی ہے، ان کی قوت اور مادی برتری کچھ بھی کیوں نہ ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش عیش لوگوں کو حکم دیتے ہیں پھر وہ اس میں نافرمانی کرتے ہیں، تب ان پر بات ثابت ہو جاتی ہے پھر ہم اس بستی کو تباہ برباد کر دیتے ہیں اور نوح کے بعد ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں، اور تیرا رب کافی ہے اپنے بندوں کے گناہوں کو جاننے کے لیے اور ان کو دیکھنے کے لیے (الاسراء:17-16)۔

☆میزان کے اختلال اور فسادِ اعمال اور تہذیبی اوہام کے مابین تلازم: اللہ نے فرمایا: کہو کیا میں تم کو بتا دوں کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ گھاٹے میں کون لوگ ہیں، وہ لوگ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں اکارت ہوگئی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں، یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا اور اس سے ملنے سے انکار کیا، پس ان کا کیا ہوا برباد ہو گیا، پھر قیامت کے دن ہم ان کو کوئی وزن نہ دیں گے (الکہف:105-103)۔

☆امت کوتنزل سے نکالنے ،فعال بنانے ،قوت کی بحالی اوراس کے اپنے پیغام کے ادراک ،اپنے راستہ کی معرفت اوراس راستہ کی ہرطرح حفاظت کے مابین تلازم: جیسا کہ فرمایا: اب تم بہترین گروہ ہوجس کولوگوں کے واسطے نکالا گیا ہے،تم بھلائی کا حکم دواور برائی سے روکواوراللہ پر ایمان لاؤاوراگراہل کتاب بھی ایمان لاتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا(آل عمران:11)تو یہ قوانین اوران کے حیوی تلازمات اوران سے جوفرعی قوانین نکلتے ہیں یہ اس کثیر کا تھوڑا سا حصہ ہیں جن سے ہم حرکتِ حیات کوسمجھ سکتے ہیں۔اورجن سے ہم زندگی کے طبائع وظواہراورعواملِ اختلال کوخوب سمجھ سکتے ہیں۔ اورجن کے ذریعہ سے امت جس صورتِ حال سے گزررہی ہے اس کے امکانات کی بحث وتشریح کی جاسکتی ہے۔اسی طرح ہوش منداور بیدارمسلمان زمین پرکس طرح ایمانی تمدن برپا کرسکتا اورزندگی کوتحریک دے سکتا ہے جس میں وہ اللہ کے امرونہی کی مطابقت کرلے۔اُس سے مطالبہ یہ ہے کہ وہ تدبروعبرت لینے میں ان ظواہرکوجانے ،چاہے یہ وہ ہوں جن کووحی یعنی قرآن وسنت نے بیان کیا ہے یا سلف صالح نے ان کودریافت کیا ہو یاوہ ہوں جن کوہم دریافت کرسکتے ہوں۔یاغیروں کی ہی تحقیق ہومگر ہوزندگی کے وجوداورکارواں سے میل کھاتی ہوئی،تاکہ اس کی کوشش حرکتِ حیات کے ساتھ ہم آہنگ ہوجائے۔اس میں کوئی زیادتی یا کمی نہ کی گئی ہو یادوسرے پر بات کونہ ڈال دیا گیا ہو۔جیسا کہ قرآن نے کہا کہ’’وہ تمہارے اپنے ہی پاس سے ہے،یہ سنن اورمتلازمات دراصل زمین میں اللہ کی میزان ہیں اوریہ میزان ایسی ہے جواپنا راستہ بدل نہیں سکتی اورنہ اس کی منزل میں کوئی غلطی ہوسکتی ہے۔یہ دراصل عواقب ونتائج کی میزان ہے جس کوہرآنکھ دیکھتی ہے:اوراللہ اپنے معاملہ پرغالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے(یوسف:21)اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں تہذیبی قدروں کا کام کیا ہے اوراس میں مذکورہ سنن کونیہ صرف یہی نہیں کرتیں کہ حال کی تصحیح اوردین کے حوالہ سے اس کی اصلاح کریں بلکہ وہ ماضی کا مطالعہ کرتی اورحال کی حفاظت کی خاطر ماضی کومعیار بنانے اوراس سے عبرت لینے کا کام کرتی ہیں اوریوں مستقبل کی بہترتقویم وتکوین کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔

**ثانیا:** زمین کی ایمانی تعمیر میں سنن کونیہ والے پہلو پر جو دوثمرے مرتب ہوتے ہیں ان میں سے دوسرا ہے **مستقبل کی امانت والی قدر کو گہرائی عطا کرنا** (اس بارے میں جدید عربی مطالعات میں مستقبل کی فکر کے متعلق اصطلاح استشراف المستقبل (مستقبل کے بارے میں غور وفکر کرنا) کا خوب استعمال ہوتا ہے، جس کا مطلب مستقبل کا لحاظ ورعایت، نتائج پر نظر اور پھر مستقبل کی منصوبہ بندی ہے۔ ہم نے اس کی جگہ مستقبل کو امانت بنانا کی (ائتمان) کی اصطلاح کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ اس میں جو معانی مضمر ہیں ان کا احاطہ استشراف نہیں کرتا، کہ استشراف کا لغوی معنی ہوا: کسی چیز کو دیکھنا، اُسے جاننا اس کی طرف جھانکنا، اس کی توقع رکھنا اور اُس سے قریب ہوجانا (ملاحظہ ہو: تاج العروس، 22/505 اور اس کے مابعد) جہاں تک کلمہ ائتمان کی بات ہے تو وہ امانت سے ماخوذ ہے، یعنی جس کا انسان کو حامل بنایا جائے اور اس کی امانت جس کی حفاظت کا اور حق کی ادا ئیگی کا اُس سے مطالبہ کرتی ہے جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا: اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مستحقین کو پہنچادو، (النساء :58) اور فرمایا: اے ایمان والو! اللہ ورسول سے خیانت نہ کرو نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو جانتے بوجھتے۔ (انفال :27) تو استشراف کے جو معنی ہیں یعنی مستقبل کے بارے میں غور وفکر وہ تو ائتمان میں بھی شامل ہیں ساتھ ہی اس میں فعالیت، مسئولیت اور محاسبہ جیسے تقاضے بھی شامل ہوجاتے ہیں۔ اس طرح مستقبل ایک امانت ہوجاتا ہے اور یہ اس میں خلافت ارضی، تزکیہ اور زمین کی ایمانی تعمیر کے مفاہیم بھی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے مستقبل کی امانت استشراف المستقبل کی اصطلاح کے مقابلہ میں اسلامی نظام تصورات سے زیادہ مربوط ہوگا کہ اس میں فعالیت، مسئولیت اور جواب دہی کے معنی نہیں پائے جاتے۔ یوں مستقبل کی امانت ایک اسلامی تصور بن جائے گا جس کی ہمیں حرکتِ حیات اور زندگی کی جدوجہد میں ضرورت پڑے گی کیونکہ ایسی آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ دنیا میں زندگی کی توانائیاں اِس طرح ختم ہو رہی ہیں جن میں ہوسکتا ہے کہ مستقبل کے لیے کچھ نہ بچے)۔

چنانچہ مسلمان ان سنن کونیہ کے مطالعہ، شعور اور ان کی ایمانی تحلیل کے ذریعہ زندگی کی حرکت کے قوانین کو صحیح طور پر سمجھے گا اور عروج وزوال کے قوانین کو جانے گا اور پھر اپنے مستقبل کو بنانے اور اس کے اثرات کو پھیلانے پر قادر ہوگا (یہ اس مغربی استشراقی نظریہ کے برخلاف ہے جو خالص مادی ہے جس میں ایمان کا اور ایام سے عبرت لینے کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کے ہاں مستقبل کے جو مطالعات کیے جاتے ہیں وہ نقص، سرکشی اور جانب داری لیے ہوتے ہیں خاص اس کے اس پہلو میں جو داخل وخارج اور اپنے اور غیر کے رشتہ سے بحث کرتا ہے) اس لیے کہ تدبر اور عبرت پذیری کا اس سننی پہلو میں کام صرف اتنا ہی نہیں ہوتا کہ وہ حاضر کو ماضی کی سنن الٰہیہ سے جانچیں، پرکھیں اور ان کی تحلیل، تقویم اور تشریح کریں بلکہ ان کا مطالبہ یہ بھی ہے کہ مستقبل

کے ادراک کی سمت درست رکھیں اوراس کی غایتوں اورنتائج کا شعور بھی حاصل کیا جائے یعنی کام کواس دائرہ سے آگے لے جائیں جس میں زیادہ فہم ،شعوراورزیادہ سعی کا حصول ہوسکے یوں نتائج اورعواقب کے لحاظ سے مسلمان سنن الٰہیہ کے عناصراوران سے مربوط نظام عمل کودیکھے گا۔ یہ سب مستقبل کے بارے میں اصول تفکیر کے واسطہ سے مسلمان عوامل فساداورقوموں کوکمزورکرنے والی چیزوں اورزوال تک لیجانے والے عوامل یااس کے برعکس عوامل اصلاح اورعوامل قوت اور جواس کی بقاء اورتوسیع کے ضامن ہوں پرغورکرے گا۔ساتھ ہی ان پرعمل درامدبھی کرے گااورتہذیبی سطح پرفعال اورتعمیری کام انجام دے گا۔ جوخلافت ارضی ،تزکیہ اورزمین کی ایمانی تعمیر کے اصولوں کے مطابق ہوگا۔اس طرح سنن کونیہ پرتدبر مستقبل کا کام ہوگا جس میں کام کے عواقب کودیکھا جائے گااورشعوروعمل میں اُس کی فعال سنن کی تلاش ہوگی۔اگرکوشش اورتعمیری تعامل نہ ہوتوسنن الٰہیہ پرغوروفکرکوبے قیمت اورلاحاصل سمجھا جائے گا کیونکہ ان سنن حاکمہ پرٹھیرجانااوراس میں انہیں پرنظرمحدودکرلیناطریقہ کارکی ایسی غلطی ہے جوان سے غفلت برتنے اوراعراض کرنے سے کم خطرناک نہیں ہے۔

قوانین الٰہیہ پر اِس طرح غورکرکے ،ان سے عبرت پذیری اوران کے مقتضیات پرعمل درامدکے ذریعہ اسلام مسلمان کومستقبل کوجاننے کا ایک اچھااورسچا،ترقی یافتہ ،فعال اور کارآمدمنہج دیتاہے۔اُسے شعوردیتاہے کہ اس سے تحریک پائے اوراس کوبنانے میں خودشریک ہو۔وہ اسے مستقبل کے ایسے نظریہ سے آشناکرتاہے جوگہرااورفعال ہے جس میں یہ قدرت ہے کہ وہ مستقبل کوجان سکے، نتائج کافہم وشعورحاصل کرے اوراپنی تقدیرآپ لکھے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے تہذیبی نقطۂ نظرمیں مسلمان سےصرف یہی مطلوب نہیں ہے کہ وہ نظریہ ومنصوبہ میں مستقبل کی پیش بینی کرے بلکہ اس بات کا بھی اس کوامین بنایا گیاہے!! جیسا کہ فرمایا: اے ایمان والواللہ کاتقوی اختیارکرواور ہرنفس یہ دیکھے کہ اس نےکل کے لیے کیاعمل پیش کیاہے(الحشر:18) تواللہ کےفرمان کہ 'ہرنفس یہ دیکھ لے کہ کل کے لیےاس نے کیاپیش کیاہے'۔میں جوبات کہی گئی ہےوہ یہی ہے کہ انسان کواپنے مستقبل کی تعمیر کے

لیےغور وفکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس کا یہ 'کل' قریب میں بھی ہوسکتا ہے اور قیامت تک آنے والا زمانہ بھی اس میں شامل ہوسکتا ہے (سیف الدین عبدالفتاح، الدراسات المستقبلیۃ فی عالم المسلمین ص448)۔

اور حدیث نبوی جس میں کہا گیا ہے کہ '' اگر قیامت آجائے اور تم میں کسی کے ہاتھ میں پودہ ہوتو جلد سے جلد اس کو لگادے (اس کی تخریج گزر چکی ہے) اس بات کی بہترین دلیل ہے کہ کائنات کے مستقبل کی باگیں انسان کے ہاتھ میں دی دی گئی ہیں۔امام مناوی اس حدیث کی شرح میں یہ ذکر کرنے کے بعد کہ بعض بڑے ائمہ پر اس کی حکمت مخفی رہ گئی لکھتے ہیں: '' حاصل اس کا یہ ہے کہ اس بڑی شدت وتاکید سے شجر کاری اور نہریں کھودنے پر ابھارا گیا ہے۔تاکہ زمین اپنی اس آخری مدت تک شادوآباد رہے جو خالق ارض وسما کو معلوم ہے۔مطلب یہ ہے کہ جس طرح تم نے اپنے سے پہلوں کے بونے سے فائدہ اٹھایا تم بھی اپنے سے بعد والوں کے لیے بوکر جاؤ اگر دنیا میں بہت معمولی چیز رہ جائے تب بھی (صابہ، بقیۃ لا قیمۃ لہا فیض القدیر 3/30) اسی طرح اس کی طرف رسول اللہؐ نے دقیق اشارہ کیا ہے جب ایک آدمی آپ کے پاس یہ پوچھنے کے لیے آیا کہ '' قیامت کب آئے گی؟ تو آپ نے فرمایا: تم نے اس کے لیے کیا تیاری کرلی ہے (متفق علیہ، بخاری کتاب فضائل الصحابہؓ باب مناقب عمر بن الخطابؓ 3/1349 حدیث نمبر:3485 مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب باب المرء مع من احب 4/3032 حدیث نمبر:2639)۔

تو اس میں بھی یہ اشارہ ہے کہ مستقبل سے اعتناء اُس کے لیے تیاری کرنے وراس کا ساز وسامان بہم پہنچا کر ہی ہوسکتا ہے اور مسلمان کو اس چیز کی امانت دی گئی ہے!!اوپر ہم نے جو آیات قرآنی اور احادیث نبوی بیان کی ہیں وہ اسلامی نقطہ نظر سے مستقبل کے بارے میں ہمارے فرض کے احساس کو اور مضبوط کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ کائنات میں زندگی اور ذی وجود کے ساتھ ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے۔اور بتاتی ہیں کہ کائنات میں اسراف وفساد نہ کریں بلکہ ان کا بہتر اور مناسب استعمال کریں۔یعنی مومن کو دنیا کے حال و مستقبل کا مالک اور آنے والی نسلوں کے لیے' زہد اور کائناتی ایثار' پر مامور بنایا گیا ہے۔بلکہ حدیث نبوی تو یہ بھی کہتی ہے کہ مسلمان اپنا مستقبل بھی بنا سکتا ہے بلکہ موت کے

بعد بھی اس کے اثرات کو باقی رکھ سکتا ہے بایں طور کہ اس کی اولاد صالح ہو۔ یہ نئی پوداور صدقۂ جاریہ اور علم جودائمی طور پر فائدہ دیتا ہے ،انسان کو موت کے بعد بھی زندہ رکھتااوراس کے اثر کو باقی رکھتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ: جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا عمل اس سے منقطع ہوجاتا ہے

مگر تین چیزوں کا اثر باقی رہتا ہے،صدقۂ جاریہ ،مفید علم اور صالح اولاد جواس کے لیے دعا کرے (مسلم کتاب الوصیۃ 3/1255 حدیث نمبر:163)۔

مستقبل کے بارے میں غور کرنے اور امانت کے طور پر برتنے کی مسلمان کی ذمہ داری کوئی ہوائی بات نہیں ہے ، نہ اس میں تقدیر کی مخالفت کا کوئی عنصر ہے اور نہ زمانہ اور حالتِ موجودہ کا خرق اس سے لازم آتا ہے ،جیسا کہ گمان کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ یہ تو ایک ایسا فرض ہے جو جوہری طور پر ایک فکری وعملی کاوش ہے جس کا نقطۂ آغاز دنیا میں زندگی اور زندوں کے اعمال وافعال پر حکمراں سنن کونیہ کے شعور سے ہوتا ہے ۔جس کا مقصد تدبر اور عبرت پذیری ہے اور جس میں اسلام کے ورلڈ ویو کے مطابق اور تعمیرِ جہاں کے اس کے مقصد سے ہم آہنگ اور خلافتِ ارضی کے سیاق میں حرکتِ حیات میں اس کے اصولوں کے مطابق مستقبل کی صورت گری کی کوشش کی جاتی ہے ۔ کہ خلافت اس تحریک کی راہ متعین کرتی ،تزکیہ اس کے وسائل کو گورن کرتا اور زمین کی ایمانی تعمیر زمان ومکان میں مسلمانوں کی اس کوشش کا مقصدِ اساسی بنتی ہے ۔ یوں زمین کی ایمانی تعمیر اس کے ابعاد اربعہ کے واسطہ سے مسلمان اس استقامت کو حاصل کرتا ہے جس کا اللہ کے نبی ﷺ نے حکم دیا جب آپؐ سے اسلام کے بارے میں کسی قولِ جامع کے سلسلہ میں دریافت کیا گیا تھا تو آپؐ نے فرمایا: تم اللہ پر ایمان لانے کا اقرار کرو پھر اس پر جم جاؤ (اس کی تخریج امام مسلم نے کی ہے باب جامع اوصاف الاسلام بروایت سفیان بن عبداللہ الثقفی، کہتے ہیں میں نے کہایا رسول اللہ اسلام کے بارے میں مجھ سے ایسی بات بتایئے کہ آپؐ کے بعد کسی سے نہ پوچھوں۔ ابواسامہ کی حدیث میں ہے آپ کے علاوہ کسی سے نہ پوچھوں ،فرمایا: تم کہو میں ایمان لایا اللہ پر پھر اس پر جم جاؤ، اس کی تخریج ترمذی نے بھی کی ہے باب ماجاء فی حفظ اللسان ان کے الفاظ یہ ہیں پس کہو میرا رب اللہ ہے پھر اس پر پختہ ہو جاؤ، اس کے بعد انہوں نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے اور سفیان بن عبداللہ الدمشقی سے دوسرے واسطوں سے بھی مروی ہے )۔

اورعبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ معاذ بن جبلؓ نے کسی سفر کا ارادہ کیا اور انہوں نے کہا: اے اللہ کے نبی ﷺ مجھے نصیحت فرمائیے، فرمایا: اللہ کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، کہنے لگے یا رسول اللہ اور بتائیے، فرمایا: جب تم سے کسی پر زیادتی ہو جائے تو پھر اس پر احسان کردو، کہا: یا رسول اللہ اور بتائیں، فرمایا: استقامت اختیار کرو اور تمہارے اخلاق بھی اچھے ہونے چاہئیں (صحیح ابن حبان 2/283 باب ذکر الاخبار بان علی المرء تعقیب الاسائۃ بالاحسان ماقدر 1/121 شیخ شعیب الارناؤط نے کہا کہ اس کی سند صحیح اور شیخین کی شرط پر ہے۔ مستدرک نے اس کی تخریج کی ہے، 1/112 اور اس کے بعد حاکم نے اس کی صحیح الاسناد اور بصریوں کی روایت قرار دیا ہے جس کی تخریج شیخین نے نہیں کی) سبھی اقوال وافعال، احوال اور نیتیں سب اللہ کے لیے ہوں، اس کے ساتھ ہوں اور اس کے حکم کے مطابق ہوں (مدارج السالکین 2/105) اور اسی کے ذریعہ یہ ہو سکے گا کہ اسلام ہر چیز کو اللہ سے جوڑ کر اور اپنے اس نظریہ کے ساتھ کہ ہر چیز خدا کے ذریعہ ہی قائم ہے، مسلمان کے لیے ان تمام عبودیتوں اور غلامیوں کے خلاف ایک جنگ اور آزادی کا علامیہ بن جائے جو انسان پر باطل نظریات نے مسلط کر رکھی ہیں اور اس کو اس کے مرکز اور اس کی اصل سے دور کر دیتی ہیں (روجر غارودی، الاسلام دین المستقبل، ترجمہ عبدالمجید بارودی، (بیروت، دارالایمان ص 69)۔

☆☆☆

## خاتمہ

# اسلام میں تہذیبی قدریں-نظریہ کو عمل میں کس طرح لائیں

### قدریں اور صورت موجودہ: مطالعہ کی غلطی اور عمل میں لانے کی ناکامی

اگر میں یہ کہوں کہ یہ کتاب دراصل ایک سوال کا جواب ہے کہ ہم زندگی کو کس طرح برتیں کہ اس سے فائدہ ہو اور ترقی حاصل ہو تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔سوال یہ ہے کہ زندگی کو یہ تحریک اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق کیسے دی جائے ؟اس سوال کا جواب دو چیزوں کا متقاضی ہے جن سے دراصل امت مسلمہ کے موجودہ بحران پر روشنی پڑتی ہے۔

**پہلا:** زندگی کی تحریک کا مطالعہ رفتار اور بناؤ دونوں میں اسلامی اصولوں کے مطابق کیا جائے ۔جو اس پر قادر ہو کہ عروج وزوال کے عوامل کی تحدید کرے اور وحی کی روشنی میں انحراف وزوال کی جگہوں اور ان کے اسباب کی نشان دہی بھی کر سکے۔کیونکہ ہماری تہذیبی بے چارگی ، یا تہذیبی نکما پن یا سمٹاؤ اور سکڑاؤ کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ موجودہ تہذیبی ترقی کی چمک دمک کے درمیان اس سلسلہ کے بہت سے مطالعات وحیٔ الٰہی کے اصولوں سے دور انجام پذیر ہوئے ہیں۔یا تو ان کے بارے میں معلوم ہی نہیں یا ان سے تعامل میں غلط فہمیاں در آئیں یا ہم ان کو برتنا ہی نہیں چاہتے ۔لہٰذا مغربی تہذیب کے اصولوں،کلیات،جدیدیت اور اصطلاحوں کو ہی ہم مطالبہ وتحقیق کا معیار مان کر چلتے ہیں، اُسے ہی تقلید و پیروی کا پیمانہ بنا لیتے ہیں چنانچہ تبعیت وطریقہ میں ہم اُسی کے اسیر ہو گئے اور اپنے اصول چھوڑ بیٹھے نتیجہ میں بربادی اور کفنیوژن ہی ہاتھ آیا۔اور سوال مزید پیچیدہ ہوتا گیا۔چونکہ جب ہم یہ قرار دیں گے کہ امت اپنے بحران سے دوسروں کے اصولوں پر چل ہی نکل سکتی ہے اور جب مسائل

کا حل دوسروں کے فکری وعلمیاتی نظاموں میں ڈھونڈیں گے اور یہ دلیل دیں گے کہ موجودہ صورت ِحال میں اسلامی اصول کام نہیں کر رہے یا یہ دلیل کہ مغربی جدیدیت میں کچھ چیزوں کا کا اضافہ کرلیا جائے تو وہی عین اسلامی جدیدیت بن جائے گی (اسی کو مالک بن نبیؒ نے ''افکار قاتلہ'' کہا ہے، کیونکہ یہ امت کے تہذیبی وجود کو فنا کے گھاٹ اتار دینا ہے۔ مالک بن نبی نے نظریات کو کئی خانوں میں بانٹا ہے، بعض کو قاتل، بعض کو مردار اور متروکہ کہا ہے، دیکھیں مالک بن نبی فی مہب المعرکہ طبع ثالث، دمشق دار الفکر 8119 صفحہ 124 اور اس کے مابعد) تو امت کو اور زیادہ بے چارگی اور پس ماندگی ہی ملے گی۔ اس کی توانائیاں رائگاں جائیں گی وہ اپنے امکانات کو اور اپنے عناصرِ قوت کو کام میں نہ لا سکے گی اور یوں وہ نہ تو معیارِ اسلام پر پوری اترے گی نہ زمانہ کے معیار کا ساتھ دے سکے گی۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ اپنے مطالعہ اور امت کی تہذیبی تشکیل سے اسلامی قدروں کو خارج کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف امت کا وجود حاشیہ پر چلا گیا ہے بلکہ اس نے اس کو توڑ کر رکھ دیا ہے!!

### ثانیا: مسلمان کی زندگی میں اصولوں کو روبہ عمل لانا:

بایں طور کہ مسلمان کی زندگی میں ایمان زندہ ہو جائے۔ جس میں نظریہ کو عمل میں، فکر کو فعل میں اور اصولوں کو عملی اسکیموں میں ڈھالا جا سکے۔ یہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اہل علم ونظر بہتر توضیحی اور رہنمایانہ اور معلوماتی اسکیمیں اور لائحہ عمل وضع کر سکیں۔ جن کے ذریعہ وہ عملی وسائل، آلات اور ذرائع تیار کیے جا سکیں جو مسلمانوں میں انفرادی واجتماعی طور پر اسلامی قدروں کا شعور پھونک دیں، اس عمل میں تحقیق و ریسرچ کے مراکز اپنا رول ادا کریں گے کہ وہ مذکورہ اسکیموں کو لازمی معلومات اور جائزوں سے غذا پہنچائیں گے اور ایسے لائحہ عمل بنائیں گے جن سے مسلمان حکمرانوں اور مسلمان رعایا دونوں کی تربیت ہو۔

قدروں کے معانی ان کی زندگیوں میں راسخ ہو جائیں اور زندگی کو وہ ایک دائمی، کثیر الابعاد، فعال اور مؤثر حرکت میں رکھیں اور یہ قدریں نظریہ کی حد سے نکل کر عمل کے میدان میں داخل ہو جائیں۔

ان پروگراموں کے وضع کرنے میں دین کے مطابق عملی اصولوں کی رعایت کرنی ہوگی ۔تو وحی کے اصولوں پر زندہ ایمان ہوگا جسے عمل کی تائیدحاصل ہوگی ایسا قول ہوگا جس کی پشت پر فعل ہوگا۔مختصراً نظریہ کوعمل میں تبھی لایا جائے گا جب مسلمان کا ہر کام دین کے تقاضوں کے مطابق ہوجائے گا اور جب وہ زندگی اورزندگی والوں سے معاملہ کرنے میں دین کا پابند ہوگا کیونکہ دینی قدریں ہی دراصل مرکزی فریم ہیں جن کی رو سے امت کے افکاراوروحی کی عطائیں ایسی روح بن جائیں گی جوامت کے افکاروخیالات میں دوڑے گی ۔ بات چاہے اصول کی ہو یا پھرکوشش ہو یا حرکت وتحریک ہواس سے اثر پذیری یا اس پر اثر انداز ہونا۔ یہ نظریہ کوعمل میں لاناوہی چیز ہے جس کو ابن خلدون نے تکلیفِ نفس سے تعبیر کیا ہے جہاں انہوں نے حقیقتِ توحید کو یوں بیان کیا ہے ''اس توحید میں فقط ایمان بمعنی تصدیق حکمی کا اعتبار نہیں ہے کہ وہ دل کی بات ہوئی ،کمال تواس میں تب ہے جب وہ صفت حاصل ہوجائے جس سے نفس انسانی ہم آہنگ ہو(مقدمہ ابن خلدون صفحہ 460) تونفس کوتوحید سے ہم آہنگ کرنے کا مطلب یہی ہوا کہ نفس توحیدی اصولوں کو بروئے کار لائے اورحرکتِ حیات میں اس کے تقاضوں کے مطابق ہی سفر کا آغاز کرے ۔یعنی زمین پر خلافت کی تکمیل ،نفس کا تزکیہ اورتعمیرِ جہاں اورخلق پرحق کی شہادت دینا۔

اصول اوران کوروبہ عمل لانے کے وسائل: بلاشبہ آج امت مسلمہ کی زندگی میں جس حالت کو ہم دیکھ رہے ہیں وہ ایسی حالت ہے جو بتاتی ہے کہ حرکتِ حیات کے حامل اصولوں کو برتنے میں اس نے اپنے پڑھنے کے لحاظ سے بھی بے سمتی کا ثبوت دیا ہے کہ اس کے پڑھنے کی بنیادیں سراسر غیراسلامی ہیں اورمسلمان کے زندگی سے معاملہ کرنے کے لیے اسلام جو اصولی رہنمائی دیتا ہے اس سے یکسر عاری ہیں۔اسی طرح مسلمان کی صورت حال میں یہ بھی مشاہدہ ہے کہ وحی کے جن اصولوں پر وہ ایمان رکھتا ہے،عملی لحاظ سے زندگی کو برتنے میں انہیں حاشیہ پرڈال دیتا ہے۔

اس بے سمتی اوردورنگی نے یہاں تک پہنچادیا ہے کہ امت مسلمہ کے کلچر میں بہت سی

آفتوں نے گویا گھر کرلیا ہے جن سے استاذ مالک بن نبی نے مشکلاتِ تہذیب پر اپنے مقالات میں بحث کی ہے۔اوران کواسلامی معاشرہ میں چھپی ہوئی خطرناک رکاوٹوں سے تعبیر کیا ہے، جو مسلسل اس معاشرہ کو ماضی کا امن واطمینان اورعظمتِ رفتہ کے حصول سے اوردوبارہ اپنا کرداراداکرنے سے روک رہی ہیں۔استاذ مالک بن نبی نے ان آفتوں کا تحلیلی تجزیہ کرکے ان کواسلامی معاشروں کے کلچر میں مردہ اورمردارافکارقراردیاہے ۔اس بارے میں ان کی بنیاددراصل ان کا وہ بڑانظریہ Grand theory ہے جس کوانہوں نے القابلیۃ للاستعمار( سامراج کی قبولیت ) سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ امت دین کے مبادی سے دور ہوگئی ہے جن کے ذریعہ وہ زندگی کوحرکت دیتی اوراپنا تہذیبی وجودمنواسکتی تھی ۔اسی طرح وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اگرزندگی کوتحریک دینے میں اسلام کے اصولوں کوبرتناواجب ہےتواسی طرح یہ واجب بھی یونہی پورانہیں ہوجائے گا بلکہ اس کے لیے تمہید کے طور پر بہت سے اقدامات کرنے ہوں گے ۔اوران اصولوں اوران کے فائدوں اوران کے نفاذ کے وجوب پر گفتگو کافی نہ ہوگی کہ آج کے زمانہ میں جب کہ زندگی پیچیدہ تر ہوگئی ہے اس کے تخصصات دقیق اوراس کے وظائف بے شمار ہوگئے ہیں اور یہ ساری سرگرمیاں ایک دوسرے سے بہت زیادہ مربوط اورمشابہ ہوگئی ہیں تومحض اصولی گفتگوکرکے اسلام کے تجربہ کوآج دہرانااورکامیاب بنانا ممکن نہ ہوسکے گا۔اسی وجہ سے اسلامی قدروں کا اعتبارلوٹانے کے لیے ہم ایک زبردست فکری واجتماعی جدوجہدکرنے کی ضرورت ہے جوامت کومتحرک کرسکےاورامت کی بےسمتی اورعلیحدگی کی صورت حال پر غلبہ پاسکے اورجس سے امت کی تہذیبی شناخت واپس آسکے۔ظاہر ہے کہ اس کے لیے امت کی حرکتِ حیات کی ہرکوشش میں تمام وسعتوں میں استخلاف،تزکیہ اوراستقامہ فی العمران کے اصولوں کو جاری وساری کرنا ہوگا اورمسلمان اورکائنات کے مابین ہونے والے ہرتہذیبی تبادلہ اورکام کے اندر ایسا ہونا چاہیے۔ اس عمل کے تین پہلو ہیں جن کے ذریعہ اسلامی قدروں کوزندگی میں قائم کیا جاتا ہے۔ان کوروبہ عمل لاتے ہیں ان کا تحفظ ہوتا ہے اوران کوترقی دیجاتی ہے۔اور یہ درج ذیل

طریقہ پر ہوگا۔

**اولا: مسلمان کی زندگی میں قدروں کو اتارنا:** (اس کو امام شاطبی نے انزال العلم علی مجاری العادات سے تعبیر کیا ہے۔الموافقات 1/99 اور ایک جگہ ظہور الفعل علی مصداق القول کہا ہے 4/254)

اس کے معنی یہ ہیں کہ قدروں کو حقیقی زندگی سے جوڑنا، زندگی کے واقعات میں تحقیق مناط (تعیین علت) کی غرض سے ۔ یہ اس بات کا متقاضی ہے کہ مسلمان کے زندگی کے ہر پہلو میں قدروں کی اصول سازی کی جائے ،اوراس بات کی کوشش ہو کہ مسلمان اصولوں کو مجرد نظر سے نہ دیکھیں بلکہ ان پر عمل کریں۔اپنی زندگی کے ہر ہر شعبہ میں پوری پابندی کے ساتھ ان کو اتار لیں تا کہ ان کا حال بدلے اور اچھا نتیجہ حاصل ہو (کیونکہ ہمارے ہاں اصول فقہ میں یہ مسلم ہے کہ اشیاء پر اصول کی بہتر تطبیق انجام کا اعتبار کیے بنا اور عواقب پر نظر کیے بنا نہیں ہوسکتی۔الموافقات 4/195)۔اور یہ اس طور پر ہو کہ زندگی کا کوئی حال، کوئی کام اور سرگرمی اس سے خالی نہ رہے اور یہ اصول ہی بناء وتمدن میں اس کی جدو جہد کو گورن کریں اور اس کا کوئی عمل ،کوئی قول ،اشارہ یا حال اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہ بچے جس میں اسلامی قدروں کی کارفرمائی نہ ہو۔یہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اہل علم ونظر بہتر توضیحی اور رہنمایانہ اور معلوماتی اسکیمیں اور لائحہ عمل وضع کرسکیں۔جن کے ذریعہ وہ عملی وسائل ،آلات اور ذرائع تیار کیے جاسکیں جو مسلمانوں میں انفرادی واجتماعی طور پر اسلامی قدروں کا شعور پھونک دیں، اس عمل میں تحقیق و ریسرچ کے مراکز اپنا رول ادا کریں گے کہ وہ مذکورہ اسکیموں کو لازمی معلومات اور جائزوں سے غذا پہنچائیں گے اور ایسے لائحہ عمل بنائیں گے جن سے مسلمان حکمرانوں اور مسلمان رعایا دونوں کی تربیت ہو۔قدروں کے معانی ان کی زندگیوں میں راسخ ہوجائیں اور زندگی کو وہ ایک دائمی ،کثیر الابعاد، فعال اور مؤثر حرکت میں رکھیں اور یہ قدریں نظریہ کی حد سے نکل کر عمل کے میدان میں داخل ہوجائیں۔ان پروگراموں کے وضع کرنے میں درج ذیل امور کی رعایت کرنی ہوگی۔

۱۔عقیدہ کے ڈسکورس (کلام) کی تجدید کی ضرورت (یہاں تجدید سے ہماری مراد یہ نہ سمجھی جائے

جوحالیہ دنوں میں اورخاص کر ۱۱ ستمبر کے بعدایک اصطلاح مسلمانوں میں رائج ہورہی ہے کہ مسلمانوں کے لیے دینی فکر میں ازسرنوغور کی ضرورت ہے اوراس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کے لحاظ سے اسلام کو پیش کیا جائے خوداسلام کی منطق اوراس کے حقائق کیا کہتے ہیں ان سے صرف نظر کیا جائے !! نہیں، بلکہ ہم یہیں تجدیداس معنی میں استعمال کررہے ہیں کہ جس سے مراد ہوتی ہے کہ امت دوبارہ اصل دین کی طرف لوٹے اوراس کی قدروں اوراصولوں کے مطابق ہی زندگی کوحرکت دے، علوم دین اور کتاب وسنت کے نصوص میں کوئی دوری نہ رہے اوردوسری طرف بناء وتمدن میں ان کے اندر دوری نہ رہے۔ اس مفہوم میں تجدیداسلام کی سائنٹیفک اساس میں داخل ہے، کہ اس کے بغیراسلام کے ثوابت، اصول اور قدروں کو ہرزمان ومکان کے مطابق کیسے بنایا جاسکے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہرسوسال پراس امت کے لیے ایک مجدد بھیجے گا جواس کے لیے دین کی تجدید کرتا رہے گا، اس حدیث کی تخریج ابوداؤدنے اپنی سنن میں کی ہے4/109 حدیث نمبر: 4291 حاکم نے مستدرک میں کی ہے4/568 حدیث نمبر: 8593)۔

حقیقت میں عقیدہ ہی وہ اہم محرک تہذیبی ہے جوامت کی تشکیل میں محوری کردارادا کرتا ہے اوراس غرض سے کہ مسلمان تہذیبی شکست سے نکلیں گے اسلام کے اصولوں کوزندگی میں دوبارہ برتیں عقیدہ کے مفہوم میں تجدیدلازمی ہے، اورمسلمانوں کو یہ بتاناضروری ہے کہ صدیوں سے ان کے ذہن میں عقیدہ کا جوناقص سامفہوم بیٹھ گیا ہے کہ اللہ، اس کی صفات، نبوت، وحی، اصول ایمان، ارکان دین اورغیبیات کی باتیں ہی عقیدہ ہیں، وہ غلط ہے عقیدہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ترمفہوم رکھتا ہے۔ ایمان باللہ کے جتنے تقاضے ہوسکتے ہیں اسلام کانظریۂ زندگی، دنیااورکائنات سے مسلمان کس طرح تعامل کریں اورزندگی کے تمام ترمیدانوں میں خالق ومخلوق میں کیا تعلق ہو یہ سب عقیدہ کا جزء ہے۔ اسی کے ذریعہ عقیدہ زندگی کی ہرتگ ودواورہرمیدان کی سرگرمی کا مرجع بن جائے گااورزندگی کے ہرہرقدم پراس کے اثرات ظاہرہوں گے۔ مسلمان اوراسی امت مسلمہ کی ساری کوششیں عقیدہ کے ماتحت ہوں گی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ دوکہ میری نماز، میری قربانی اورمیرا مرنااور جیناسب اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اورمیں سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے ہوں (الانعام: 163-162) مطلب یہ ہے کہ زندگی کے ہرہررنگ میں عقیدہ کا پہلودکھائی دے گا۔ وہ مجرداورٹھنڈاٹھنڈاایمان نہ ہوگا صرف زبان سے دہرا لیے جانے کے کچھ کلمے یامحض کچھ ذہنی اور

مجرد چیزوں کی تصدیق کا نام نہ ہوگا جو زندگی میں حرکتِ حیات سے، حدودِ حرکت سے اوراس کے وظیفۂ زندگی کے عناصر سے خالی ہوں۔اس سیاق میں جب ہم مسلمان کی زندگی میں عقیدہ کو مرجع بنانے کی بات کرتے ہیں،تو زندگی کو حرکت دینے والی قدروں یعنی خلافت فی الارض،تزکیہ اور ایمانی تعمیرِ ارض، فقہِ سنن الٰہیہ اور امت کا فعال تہذیبی کردار وغیرہ ان سب سے متعلق گفتگو خالص عقیدہ کی بحث ہوگی اور یہ وہ اجزاء ہوں گے جن کو عقیدہ کے ڈسکورس میں داخل کرنا ضروری ہوگا (ہماری یہ کتاب اپنی تینوں فصلوں کے ساتھ اسی چیز کی شرعی اصول سازی پر مبنی ہے) تاکہ مسلمان کو یہ احساس ہو کہ جب وہ زندگی میں ان اصولوں کو برتنے میں کوئی کمی کرے گا، چاہے انجانے میں یا غفلت میں تو وہ عقیدہ کے واجبات ومقتضیات میں کمی کر رہا ہے اور اس کے ضروری جز کو چھوڑ رہا ہے۔

اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ زندگی کو حرکت دینے والے اصولوں کو مسلمان کے خالص عقیدہ میں اور عقائدی کلام کا جزء سمجھنا چاہیے۔اور اس چیز کو مسلمان کے شعور میں گہرائی تک اتارنا چاہیے، اگر ایسا ہوگا تو کائنات اور انسان کے حالات کے مابین وصل کے عناصر کی تکمیل ہوگی اور ہر مسلمان کو اس کی تحریک ملے گی کہ وہ اسلامی اصولوں کو زندگی میں اتارنے کی کوشش کرے گا کہ یہ سب اس کے عقیدہ کا جزء ہے چنانچہ وہ اس کا دفاع کرے گا اور حرکتِ حیات میں اس کے تقاضوں پر عمل کرے گا۔اسی طرح مسلمان کو دورِ زوال کے متوارث غلط تصورات سے آزاد کرنے میں اس کا بڑا اثر ہوگا۔جو نفس کو سستی وکاہلی پر ابھارتے اور تعمیرِ حیات سے روگردانی اور زمین میں خلافت کے فرض اور شہادت علی الخلق کی ذمہ داری ادا کرنے سے روکتے ہیں۔اور جن کی وجہ سے وہ مسکنت وذلت میں پڑتا اور خواہشات کی پیروی کرنے لگتا ہے۔اسی طرح عقیدہ کا یہ تصور آدمی کو ان تصورات سے بھی آزاد کرے گا جو اس پر تھوپے جاتے ہیں اور جو غالب تہذیب کے سانچے میں اُسے ڈھال دینا چاہتے ہیں۔ یہ بتا کر کہ مغربی تہذیبی اصول گلوبلائزڈ ہوگئے ہیں اور یہ سب سے بہتر اصول ہیں اور مغرب کی مادیت اور اس کا سیکولر فلسفہ کا کوئی جواب نہیں ہے۔حالانکہ اس فلسفہ کا کہنا ہے کہ ''خدا مر چکا ہے'' اور جواب انسان کو مارنے اور ''فطرت کو قتل کرنے'' کی طرف مائل

ہے۔اورجواب اپنا تابع بنا کر،اپنا طریقہ جاری کرکے،یا تخریب وتدلیس کے ذریعہ دوسری قدروں کو بھی حاشیہ پر لگانا چاہتی ہے۔

**۲۔فقہی ڈسکورس میں تجدید کی ضرورت:** اسی طرح ایسا فقہی ڈسکورس پیدا کرنا بھی لازمی ہے جس کا ضروری جزء یہ ہو کہ وہ ایسی فقہ کی بنیاد رکھے جو امت کے مسائل سے اعتناء کرے،اس کے وجود،اس کی تشکیل ،اوراس کی بقاء کے بارے میں سوچے اوراس کے حال و مستقبل پر غور کرے اورامت کو یوں فعال بنائے کہ وہ اپنا اصل کام کر سکے اوراپنے خیر ہونے کو ثابت کر سکے۔ساتھ ہی یہ فقہ ایسے شرعی وسائل ایجاد کرے جن سے امت کی حرکیت لوٹے اوروہ اپنے مسائل حل کرے اوراپنے اداروں کو بنانے کے لیے ضوابط اختیار کرے ۔ایسی فقہ جو زندگی سے مربوط ہو جو انسان کو فعال بنائے۔جو تمدن کی ساخت پر توجہ دے ایسی فقہ جس میں عوامل بناء اورتہذیبوں کے عروج وزوال سے، زمانہ کی الٹ پھیر سے اورایک تہذیب کے دوسری جدیدیت کے جگہ لینے سے بحث ہوتی ہو۔جس میں تدافع وتوازن اورعالمی انصاف سے بحث ہوتی ہو۔ایسی فقہ جو زمین کی تعمیر میں مسلمان کے تہذیبی رویہ سے،زمین میں چلنے پھرنے اوراس کی بناء میں اللہ کی سنتوں کو ملحوظ رکھنے سے اور مستقبل بینی سے بحث ہوتی ہو۔ایسی فقہ جس کے لوازم میں یہ چیز داخل ہو کہ انسان کے مقامی مسائل ومشکلات پر بصیرت کے ساتھ غور وفکر کیا جائے (مثال کے طور مسلمان آج کل جس کمزوری ،بربادی اورلوٹ کھسوٹ سے دوچار ہیں اس سے ) یا عالمی سطح پر گلوبلائزیشن ،جدیدیت،حقوق انسانی،ماحولیاتی مسائل، عالمی امن ،عالمی نظام نو،مغربی انسان کی مرکزیت اوراس کی قدروں کو عالمی سمجھنا،تاریخ کا خاتمہ،تہذیبوں کے تصادم اورکلچروں کی باہمی آویزش جیسے تصورات سے۔تولازمی ہے کہ یہ ساری بحثیں ہمارے نئے فقہی ڈسکورس کا حصہ بنیں تاکہ ہم پہلے ان سب کی حقیقت کو جانیں اورپھر ان کے سلسلہ میں اجتہاد سے کام لیں۔تاکہ خلافتِ ارضی اورتعمیرِ جہاں کی بنیاد پر ہم ان مسائل کا حل نکال سکیں اورکائنات کی اشیاء کی حفاظت،ان سے استفادہ اوران کی ترقی کی بنیاد پر یہ کام کریں۔بہتر اسلامی تصورات اورمقاصد شرع کی روشنی میں ہم ایسے کام انجام دیں جو حرکتِ حیات میں اہم ہیں اور جو

عبارت ہیں حفظ دین، حفظ نسل اور حفظ نسل، عقل اور مال اور اصلاح ارض اور اس کی تعمیر اور اس میں لوگوں کی معاش کا نظم کرنے سے۔ اور اس پر غلبہ پانے سے اور تمام انسانی کاموں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے تابع بنا دینے سے۔ اور یوں یہ پوری کائنات خدارخی ہو جائے، اس کے مقاصد درست ہو جائیں اور اس کے وسائل میں سلامتی آئے اور اس کے نتائج کی بصیرت حاصل ہو۔

جیسا کہ ایسا فقہی ڈسکورس پیدا کرنے کی بھی ضرورت ہے جو ہماری اسلامی تہذیب کی روح کی ترجمان قدروں کو بھی دین قرار دے۔ اور یہ بھی بتائے کہ ان کی ترجمانی اور ان عملی زندگی میں اتارنا اور ان کے مطابق عمل کرنا شریعت کو مطلوب ہے اور حرکتِ حیات کو ان کے مطابق ڈھالنے اور ان کا التزام کرنے اور ان کو اسکیموں اور پروجیکٹوں میں بدلنا اور ان کو زندگی میں اتارنے کا میکانزم وضع کرنا اور ان پر عمل درامد کے نتائج کو دیکھنا اور ان کو زندگی کا منہج بنانا امت پر فرض وواجب میں سے ہے۔ اور یہ کہ ان میں کوئی کمی کرنا حرام ہے اور ان کا دفاع کرنا جہاد ہے۔ اور ان کی نگرانی اس کی ذمہ داری ہے، چنانچہ امام قرافی کہتے ہیں: امت کے احوال اور ملت کے مصالح پر غور وفکر کرنا یہ فروض کفایت میں سے ہے۔ (الفروق اور اس کے حواشی 2/276 اور دیکھیں: قواعد الاحکام فی مصالح الانام 1/43) زندگی کو تحریک دینے اصولوں کو بروئے کار لانے اور عمل اتارنے کو فرض کفایہ قرار دینے کا مطلب ہے کہ ان اصولوں کو زیادہ فعال اور زیادہ کارگر اور محفوظ بنایا جائے۔ کیونکہ فرض کفایہ کی اصطلاح فقہی معنوں یہ مفہوم دیتی ہے کہ امت کے سب لوگ متحد ویک جہت ہیں اور اس کام کو بجالانے کے لیے سب کو ایک دوسرے کی مدد وتعاون کرنا چاہیے۔ اور اس فرض سے شارع کا جو مقصود ہے اس کی تکمیل کے لیے جو قادر ہے وہ غیر قادر کی مدد کرے اگر ایسا نہ ہوگا تو ساری امت گنہ گار ہوگی کہ فرض کفایہ اسی کو کہتے ہیں کہ جو سب پر واجب ہو مگر جب کچھ لوگ اُسے بجالائیں تو باقیوں پر سے وہ ساقط ہو جائے!!اسی لیے دوسرے فرائض کے معاملہ میں فرض کفایہ کی ادائیگی میں زیادہ ثواب ملتا ہے۔ جیسا کہ امام جوینی کہتے ہیں! فروض کفایہ کو ادا کرنے سے زیادہ درجہ ملتا ہے اور یہ فرض عین کے مقابلہ میں زیادہ ثواب والے ہوتے ہیں کیونکہ اگر مکلّف بندے نے فرض عین کو چھوڑ دیا اور شارع کے حکم کو بجا نہیں لایا تو وہ

گنہ گار ہوگا اوراس کو بجالا یا تو اُسے ثواب ملے گا۔ جہاں تک فروض کفایہ کی بات ہے تو اگراس کی ادا ئیگی نہیں ہوئی تو درجوں کے اختلاف کے ساتھ سب گنہ گار ہوتے ہیں۔اوران پر عمل کرے گاتو اپنے ساتھ دوسروں سے بھی حرج اور سزا کو دور کردے گا اور افضل ثواب کا امیدوار ہوگا۔تو جو شخص کے کسی اہم کام کوانجام دینے میں سارے مسلمانوں کی نیابت کردے اس فرضیت کے احساس سے اس کا رتبہ گھٹا یا نہیں جاسکتا (الامام الجوینی غیاث الامم والتیاث الظلم ،تحقیق : د،فؤادعبدالمنعم اورد، مصطفیٰ حلمی ،طبع الاسکندریہ ،دارالدعوۃ: 1979 صفحہ 26) جس سے انسان کی زندگی میں تازگی آتی ہے اور وہ ایک نئی فعال قوت میں بدل جاتی ہے جوتمام اقدامات میں اسلام کے اصول کو برتے ،یوں فروض کفائیہ اجتماعی محرکات اورنفسیاتی عوامل میں بدل جاتے ہیں جواسلامی قدروں کے مطابق پیغام پہنچانے اور عمل میں خلافت ارضی ،تزکیہ اورزمین کی تعمیر کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

**۳۔قدروں کے ڈسکورس کی تجدید:** ہمارے اصولوں اورقدروں پر جو کچھ لکھا گیا ہے اگراس میں غور کیا جائے تومعلوم ہوگا کہ اس کے اندر واضح طور پرایک بڑا نقص پایا جاتا ہے۔یہ ایسا لٹریچر ہے جس کا بڑا حصہ آخرت سے تعلق رکھتا ہے،اس میں دنیا میں انسان کس طرح زندگی گزارر ہا ہے اس سے زیادہ تر صرف نظر کیا گیا ہے۔چنانچہ دنیا میں جو کچھ ہورہا ہے اُس کی اصلاح سے اوراس کواسلامی قدروں کی کسوٹی پر جانچنے سے پوری طرح پہلوتہی برتی جاتی ہے: وہ قدریں جوانسان ،زندگی اورکائنات کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر سے عبارت ہیں۔اسی وجہ سے ہمیں ضرورت ہے اسلام کے تہذیبی اصولوں کوعملی زندگی میں برتنے اوران قدروں کے ڈسکورس میں تجدید کی۔ اور یہ تین وسیلوں سے ہوگا:

**پہلا:** اپنے قدروں کے ڈسکورس میں ان اجزاء کواعتبار دینے سے جوزندگی کوحرکت دینے والے اصولوں کی ترجمانی کرتے ہیں یعنی خلافت ارضی ،تزکیہ اورزمین کی ایمانی تعمیر کی اوراشیاء کائنات کے ساتھ تعامل کرنے میں صحیح طرز عمل کی ،جس میں ان کی حفاظت ،ان سے نفع اٹھانا اوران میں اوران میں افزائش بھی شامل ہے۔

اس میں یہ بیان بھی ضروری ہوگا کہ مذکورہ اصول مسلمان کو حرکتِ حیات کا ایک رویہ دیتے ہیں جو اللہ کے احکامات سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور جس کا دنیا و آخرت کو مربوط کرنے کے لیے لحاظ رکھنا ناگزیر ہے۔ جس میں کہ مسلمان کائنات کو اپنا میدان عمل بنائے گا اور جہاں وہ فریضۂ خلافت، تعمیر ارضی اور آخرت کے لیے دنیا کی تعمیر کے کام انجام دے گا، اسی چیز کی طرف اللہ کا یہ قول اشارہ کرتا ہے: اے انسان تو خوب مشقت کرنے والا ہے اور اپنے رب کی طرف جانے والا اور اس سے ملاقات کرنے والا ہے (الانشقاق:6) یہی عملی مشقت جو اللہ تک پہنچائے ہمارے اس ڈسکورس کا مرکز ہونی چاہیے۔

ثانیا: مغربی جدیدیت کے نظام اصول کا تحلیل وتجزیہ اور تفصیلی طور پر اس پر نقد، اس میں جو اچھے عناصر ہیں ان کو ضلالت انگیز عناصر سے الگ چھانٹنا، اور جدیدیت کے مبادی کو مبنی بروحی اصولوں کی کسوٹی پر پرکھنا اور حرکتِ حیات میں ان کے جو عواقب اور انجام ہوتے ہیں ان پر غور کرنا۔ اسی طرح اس کے فلسفیانہ مفاسد کو بیان کرنا جن میں نمو پذیری ہے اور جو اس کو سہارا دیتے ہیں۔ ان میں دو آفتیں خاص کر اہم ہیں ایک یہ کہ یہ جدیدیت غیب کی منکر ہے دوسرے وحی کے اصولوں سے بے نیاز ہے اور صرف انسان کو اصل مرکز اور معیار مانتی ہے۔

اس نقد وتجزیہ میں ان مطالعات سے فائدہ اٹھایا جائے جو خود مغرب میں ہوئے ہیں اور جن کی تعداد کم نہیں ہے۔ یہ مطالعات جدیدیت کے خاتمہ، اس کی قدروں کی ناکامی، ان کے ممکنہ زوال پر بات کرتے ہیں، اور ان کو غیر انسانی قرار دیتے ہیں۔ اور یہ لازم کرتے ہیں کہ اب انسان کو جدیدیت کے نظام فکر سے آگے بڑھنا ہی ہوگا۔ اسی طرح وہ علوم طبیعیہ میں برپا سائنسی بحران کے بارے میں بھی بتاتے ہیں کہ وہ کس طرح اشیاء کائنات سے تعامل کرنے میں غلط ثابت ہوا ہے۔ اس میں یہ اضافہ اور کرلیں کہ علم النفس اور علم االلغہ میں نئی تحقیقات مغربی جدیدیت کے پیدا کردہ بہت سے سائنسی نظریات میں درآئے سائنسی خلل کو آشکارا کررہی ہیں۔ جن کا مطالعہ اور جن کا جائزہ لینا ایک صحیح اور جاندار نقد کے لیے نہایت ضروری ہے (اسی سیاق میں مفکر عبدالوہاب المسیر ی نے ایک علم کی بنیاد رکھنے کی تجویز

دی ہے جس کو وہ علم الازمہ (بحران کا علم) کہتے ہیں۔جس میں جدید تہذیب کے بحران کا مطالعہ تمام پہلوؤں سے اور خاص کر اس کی قدروں کے پہلو سے کیا جائے۔تا کہ مغربی تہذیب کے اصولوں میں اور سائنٹفک نظریات میں اور حرکتِ حیات میں اس کی ناکامی سے واقف ہوا جائے۔ملاحظہ کریں: حوارات مع الدکتور عبدالوہاب المسیر ی، الثقافة والمنہج صفحہ 331)۔

تو یہ نقد وتجزیہ ہمارے قدروں والے اور اسلامی قدروں کے ڈسکورس میں لازما ہونا چاہیے۔ پھر اس ڈسکورس کا آغاز مغربی جدیدیت کے اصولوں کے مابین فرق بیان کرنے سے ہو جو مبنی ہے اس مادیت پر جس میں کسی انسانی قدر کی کوئی اہمیت نہیں اور جہاں اپنے آپ کو ترجیح دینا اور زندگی کو پھاڑ ڈالنا ہے۔اب رہیں اسلامی قدریں جو دنیا میں انسان کی کوششوں کو گورن کرتی ہیں تو وہ خلافت ارضی ،تزکیہ اور زمین کی تعمیرنو اور اشیاء کائنات سے صحیح طرزعمل کے مطابق وجود پذیر ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ مغربی جدیدیت اور اس کی قدروں پر یہ نقد اور اس کے بحران کی وضاحت اور اسلامی قدروں سے ان کی مغایرت کی توضیح مسلمان کو جدید تہذیب کے کنویں میں گرنے سے روکنے میں اہم رول ادا کرے گی اس کے گڈھے میں گرنے سے روکے گی اُسے مغرب کے مرکزی ہونے کے احساس سے بچائے گی جو اُس کا سب کچھ چھین سکتا ہے اور اس مطالعہ کے بعد وہ مغربی تہذیب کے اصولوں کے ساتھ تعامل میں آزاد ہوگا چاہے وہ اس کو خود فائدہ پہنچائے یا اس کے بارے میں عبرت پذیری اور غور وتامل کی راہ اختیار کرے اور اس کے ضرر وفساد سے بچ جائے۔

یہ تو ایک وجہ ہوئی۔دوسری جہت سے مغربی تہذیب کو اسلامی اصولوں پر جانچنے سے مسلمان کے دل میں فخر، روح عزت اور قوت پیدا ہوگی اور یہ احساس پیدا ہوگا کہ ہمارے پاس جو بلند قدریں ہیں جن سے انسان کا تزکیہ ہوتا ہے اور تمدن کو ترقی ملتی ہے اور زندگی میں وحی پر مبنی تصورات پھیلتے ہیں اور انسانی، عالمی اور باہمی رحم کا شعور پیدا ہوتا ہے۔تو اس سے مسلمان اپنے دل میں تہذیبی انقلاب اور دوبارہ دنیا کو کچھ دینے کی قوت محسوس کرے گا۔زندگی کے تزکیہ ،احوال امت کو بہتر بنانے اور لوگوں کے راستہ کو ٹھیک کرنے میں مسلمان دوبارہ اپنا کردار ادا کرنے لگے گا جس پر نیا عالمی نظام چل رہا ہے اور وہن کی ذہنیت اور نفسیاتی شکست سے چھٹکارا ملے گا جس میں آج ہماری امت

مبتلا ہے۔

**ثالثاً:** عالمی تبدیلیوں اور مشکلات کو درست کرنا اور ان کا اسلام کے اصولوں اور مقاصد کے مطابق محاکمہ کرنا، جن میں خاص طور پر ماحول کا مسئلہ، انسان کے زمین سے تعلق کا مسئلہ ہے جس کے کمزور ہونے سے آج زمین میں آلودگی، تخریب، فساد اور توازن کے فقدان، جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے چلن اور مادیت کی حرص جو اشیاء کائنات سے تعامل میں اپنا کام کر رہی ہے، جیسے مفاسد پھیل چکے ہیں۔ مثال کے طور پر مغربی انسان کی خاطر ایک سامراج کائنات پر حملہ آور ہے جبکہ اس سے متاثر پوری دنیا ہو رہی ہے!! طاقت کی یہی منطق آج جنگلوں، سمندروں، اوزون، میٹھے پانیوں، ہوا اور بارش اور خود زندگی کے تنوع سب پر مسلط کر دی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج دنیا کی تباہی و بربادی کے سارے عناصر انسانیت نے یوں جمع کر لیے ہیں جو کہ پوری تاریخ میں کبھی بھی جمع نہیں ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ زمین مر رہی ہے!! اس کے علاوہ یہ ہے کہ آج دنیا میں جو تصورات حکمراں ہیں یعنی 'تاریخ کا خاتمہ'، 'تہذیبوں کا تصادم' اور 'نیا عالمی نظام'، یہ وہ تصورات ہیں جن کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ''دشمنی'' پیدا کرتے ہیں اور تہذیبی سرکشی سے عبارت ہیں۔ جن کے تحت دوسروں سے ان کی شناخت اور قدروں کو چھینا جاتا ہے۔ ان کو اپنا پیرو بنایا جاتا ہے ان پر اپنا طریقہ مسلط کیا جاتا ہے یا تخریب و تدلیس سے کام لیا جاتا ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی نظامِ اقدار ایک مکمل اصلاحی اسکیم رکھتا ہے اور معاصر انسانی تہذیب کی مشکلات کے حل میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہے۔ جدید تہذیب وحی کا انکار کرتی ہے اور اپنی ذات کے حصار میں بند ہے اور اپنے آپ اور اپنے اطراف کے انسانوں اور فطرت کو تباہ کر رہی ہے۔ اسلام اس پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ انسانی تہذیب کے قافلہ کی صحیح رہنمائی کرے اور اسے سرکشی سے بچائے اور انسانیت کو اس سے زیادہ آج کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے!! اور یہ کام وہ اپنے اصولوں کے ذریعہ سے کرے گا جو توازن، بے لوثی، اداء حقوق، حرمتوں کے پاس ولحاظ، بلند ارادوں، سخاوت وایثار کی اخلاقیات، بھلائی اور نیکی، روزی کی تلاش، تعارف، باہمی رحم جیسے اخلاق کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تہذیبی سرکشی اور تمدنی اغراض پرستی سے مقابلہ کرے گا۔ اس امانتِ کائنات کے

جومعانی ومفاہیم ہیں جوقرآن وسنت سے مستفاد ہیں ان کے ذریعہ کرے گا، جن کا التزام مادی واخلاقی طور پرانسان کوکرنا ہوتا ہے۔ کائنات کی تمام موجودات اوراشیاء کے تئیں جن میں کچھ کے لیے انسان بنا ہے اور کچھ اس کے لیے بنی ہیں۔ نیز تہذیبی شعور کا یہ مفہوم زندگی کو یوں حرکت دیتا ہے جواشیاء کائنات کے ساتھ تعامل میں اعتدال اورکم خرچ یعنی زہدوایثارِ کائناتی پرمبنی ہے۔ انسان کا ان کے ساتھ معاملہ اس نگراں اورنگہ بان کا سا ہوگا جس پر مقاصد شرع کی حکمرانی ہوتی ہے۔ یہ معاملہ خواہش سے مغلوب اور بداخلاق کا سا نہ ہوگا۔

یوں یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ اپنے ڈسکورس میں مذکورہ اصولوں کوشامل کرنے اورجدید دنیا کے مسائل کا جواب دینے کے لیے ان کوروبہ عمل لانے سے اورمغربی جدیدیت سے انسان کوجن بحرانوں کا سامنا ہے ان کے مقابلہ کے لیے انہیں فعال بنانے سے نہ صرف یہ امکان روشن ہوتا ہے کہ حرکتِ حیات کے دوسروں کے نظریات پر نقد کیا جاسکے گا اس حوالہ سے کہ جدیدیت نے انسان کوکائنات اوراس کے مستقبل کے بارہ میں بحران میں ڈال دیا ہے، بلکہ خودمسلمانوں کی موجودہ حالت پربھی نقد کیا جاسکے گا کہ انہوں نے اسلام کے اصولوں اورقدروں کواپنے ڈسکورس سے غائب کردیا ہے اورجانے انجانے میں شدید غفلت کربیٹھے ہیں حالانکہ یہ اصول حرکتِ حیات کے لیے ایک بہتر اورجامع سائنٹیفک رویہ تشکیل دیتے ہیں۔ تو یہ تینوں وسائل یعنی اسلام میں حرکتِ حیات کے مبادی کوان کا اعتبار دینا، مغربی جدیدیت پرنقد اورعالمی واقعات کواسلامی نظریات کی کسوٹی پر پرکھنا اوران کا محاکمہ کرنا یہ ایسی چیزیں ہیں جن پر توجہ کی اورجن کواپنے اخلاقی ڈسکورس کے اجزاء میں شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ایسے وسائل ہیں جوہمیں خودکوسمجھنے اورتحریکِ حیات پراچھے طریقہ پر قادراصولوں کاشعور دیتے ہیں اورساتھ ہی غیر کی تفہیم بھی کراتے ہیں اور غیر سے ہمارے رشتہ کی تربیت کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ غیر کے زندگی کوچلانے کے طریقہ میں بہت سے انحرافات موجود ہیں اورمسلمان کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ان اصولوں کواپنی زندگی میں اتارے بلکہ اسلام کے اصولوں کے حق میں عالمی سطح پر رائے عامہ ہموار کرے۔ یوں انسانوں کی جو قدریں

فسادآلودہ ہوگئی ہیں امید ہے کہ ہم ایک دن ان کو درست کردیں گے۔

**ثانیا: اصولوں کی حفاظت:** اسلامی اصولوں اور قدروں کو روبہ عمل لانے کے سلسلہ میں یہ بھی بہت اہم ہے کہ ان کی حفاظت کی جائے کیونکہ صرف یہی کافی نہیں کہ مسلمان کی زندگی میں ان اصولوں کو اتارا جائے بلکہ نفاذ کے اس عمل کی حفاظت اور اسے پیش آمدہ آفتوں سے بچانا بھی بہت ضروری ہے جو یہ ہیں:

☆**جمود سے:** کہ ایسا ہوسکتا ہے کہ امت ان قدروں کے خالی نفاذ پر اکتفا کرلے وسائل نفاذ کی تجدید نہ کرے اور نہ نئے حالات کے لحاظ سے ان کو update کرے اور نہ ان کے عواقب ونتائج میں غور کرے اوراس کے لیے نئے پروگراموں کو develope کرنے اوران کی تطبیق میں اجتہاد سے کام لینے سے عاجز رہ جائے، کہ اس طرح ان قدروں میں جمود آجائے گا ان کی فعالیت کم ہوجائے گی اور نمو واستمرار نہ ہوسکے گا۔

☆**علیحدگی سے:** اس کا مطلب یہ ہے کہ جب امت جمود پذیر ہوجائے گی تو اس کا بڑا حصہ اپنی زندگی سے، اپنی حالت موجودہ سے اور معاصر دنیا سے بالکل کٹ کر رہ جائے گا۔ یہ آفت اس سے قبل پیش آچکی ہے جب امت گردوپیش سے بے خبر ہوگئی، اُس نے نہ اپنی قدروں کو ترقی دی اور نہ ان کے وسائل تنفیذ کی تجدید کی یہاں تک کہ اس کا وہ حال ہوگیا جو ہم سب کے سامنے ہے کہ قدروں کا پتہ ہے اور نہ عمل میں انحراف کا احساس!! اور جمود وعلیحدگی دونوں ایسی آفتیں ہیں جو قدروں سے حرکیت چھین لیتی ہیں اور قلب وروح وعمل ہر اعتبار سے ان کی فعالیت کو ختم کرتی اوران کے وسائل کو معطل کرڈالتی ہیں۔اس چیز سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک بابصیرت اقدام کیا جائے اور تفقہ اور نگرانی کا اہتمام ہو اور اس منہاج کے مطابق ہو جس کی بنیاد دو باتوں پر ہو:

**ا۔تہذیبی حالت موجودہ کی فقہ پر:** جو امت کے دنیوی وجود مع تمام سوالوں، شناخت اور تمام تاریخی اور مستقبل کی توسیعات اور سارے تنوعات کو شامل ہوں اس میں چاہے جتنی پیچیدگی اور تشابہ

ہو۔اس فقہ میں وہ اجتہاد ہوجوان وسائل کوترقی دے جن سے اس صورت حال کی تقویم واصلاح کے لیے اسلامی قدروں کوعمل میں لایاجاسکے ۔اوراس خوشگورزندگی کی طرف لے جائے اوران قدروں کوبروئے کارلانے کے لیے مقاصدی روح کے ساتھ اجتہادکرے جوافعال کے مابین موازنہ اورمصالح ومفاسد کے درمیان ترجیح قائم کرے جس میں واقع کے اعتبارکرنے کا شدید شعورتو ہومگراس کوحکمراں نہ بنائے۔اوراسلامی قدروں کی طرف خوبصورت انداز میں اُسے لوٹائے (ہمارے ثقافتی ڈسکورس میں واقعیت پسندی کا جومفہوم آج کل چل رہاہے وہ ہماری مرادنہیں ہے، کیونکہ وہ مفہوم توتغیر وانقلاب سے یکسر مغایر ہے اوراس سے زیادہ کسی چیز سے امت کونقصان نہیں پہنچ سکتا کہ وہ status que کو برقرار رکھنا سکھا تا ہے چاہے حالات موجودہ میں کتنے ہی انحرافات ہوں۔ہمارے فقہی وشرعی ڈسکورس میں فقہ الواقع سے مراد ہے کہ حالتِ موجودہ کو بیان کریں،اس پر نقد کریں،اس کے ساتھ تعامل کریں اوراس کو بدلنے کی مسلسل کوشش کریں کہ دیرسویراُسے بدلا جائے اور یہ اجتہاد کیا جائے کہ حالتِ موجودہ میں جب جب بھی معیار سے انحراف پیداہوتو اسلام کی قدروں کوحکم بنایاجائے ۔اس کے لیے حال ومآل کی بصیرت ،شعوراورحالتِ موجود سے مستقل مربوط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔نہ اس سے غفلت ہواور نہ اس کی ضرورتوں اور مجبوریوں سے صرف نظر کیا جائے۔(دیکھیں اعلام الموقعین 891/88-اور 4/220)۔

اوراصولوں کوبرتنے کے معاملہ میں ترجیحات کا اعتبارضروری ہوگااوران اصولوں اوران کے عواقب کوبروئے کارلانے کے نتائج کا اعتبار بھی واجب ہوگا تا کہ ایسانہ ہوکہ مصلحت مقصودہ کے بجائے کوئی مفسدہ اپنارنگ نہ دکھادے۔یاکسی مصلحت ادنی کی وجہ سے مصلحت کبری فوت نہ ہوجائے !!ہم یقین کے ساتھ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ ایسی حالت جس میں اصولوں کونافذ نہ کیا جائے ،اس کے کئی نتائج پیداہوں گے، یاتو اُس سے امرواقع کوتھوپ دیاجائے گااوروہ چاہے جتنا ظالمانہ ہواس کو ماننے پرابھاراجائے گایا یہ دعوی کیاجائے گا کہ یہ قدریں آج کے زمانہ کے لائق نہیں ہیں۔ان کی جگہ دوسری قدریں لائی جائیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کوزندگی میں ان قدروں کے نفاذ کے لیے بیداررہناہوگااورحال میں یا مستقبل میں نئی ضرورتوں کے پیش نظراجتہادکرنا ہوگا۔اس لیے کہ اس قسم کے اجتہادکی ضرورت قیامت تک رہے گی وہ کبھی ختم نہیں ہوگی ۔جیسا کہ حالت موجودہ میں قدروں کے نفاذ کے لیے نئے نئے وسائل اورمیکانزم بنانے کے لیے یہ چیز بحث وگفتگواورمشاورت

اورتعاون کا موضوع ہے۔جس میں امت کے مختلف طبقات شریک ہوں گے،اصحاب رائے ،اہل حل وعقد وغیرہ۔اور یہ لوگ نظریہ وعمل، پیشوں وصنعتوں اورسروسز اوردوسری تمام سرگرمیوں کے سلسلہ میں گفتگو کریں گے۔

**2۔امت کے لیے تہذیبی طریقہ کی فقہ:** یہ فقہ امت کی نگرانی کرے گی اوراس کے انحرافات کودرست کرے گی ،اس کومعیار پرلوٹائے گی اوراس رخ پر اُسے برابر رواں دواں رکھے گی ۔ بلاشبہ اس امت کا تنزل سے نکالنا،اس کی فعالیت کو بحال کرنا اوراس کی تہذیبی موجودگی اس کے اپنے راستہ پرآنے ،اس کی نگرانی اوردین کے اصولوں پراُسے پرکھنے سے مربوط ہے۔اس کا یہ بھی تقاضا ہے کہ امت ہمیشہ اپنی ذات ،اپنی حرکات وسکنات کا احتساب کرتی رہے ۔اس عمل کے دومتوازی رخ ہوں گے جوایک دوسرے کی تکمیل کریں گے ۔ایک طرف توامت کمال،تطہیروترقی اورخیر کے مراتب پانے کے لیے اپنے داخل کی اصلاح کرے گی دوسری طرف وہ کائنات کی حرکت اس کی اشیاء اوراس کی دَین اوراس سے استفادہ وغیرہ کی طرف توجہ کرے گی،اس کا مطلب ہے کہ:

☆**مسئولیت کا گہرا احساس ہو:** یعنی اس بات کا احساس کہ مسلمان اپنی امت بلکہ پوری انسانیت کے بارے میں جواب دہ ہے،اسی طرح امت کی ذمہ داری فرداور پوری انسانیت کے بارے میں ہے۔اور یہ بھی ذمہ داری ہے کہ زندگی میں اپنی قدروں کوروبہ عمل لانا ہے۔اس کے لیے انفرادی اورادارہ جاتی وسائل اورمیکانزم بنانے ہوں گے جن کے واسطہ سے ان قدروں کوفرداورامت کی زندگی میں اتاراجائے گا۔اسی طرح وسائل کی ایجاداورعام نگرانی کے وسائل اورشرعی وسائل اوراسالیب کوترقی دینے میں اجتہاد کرنا ہوگا۔جوسمت کودرست کریں اورقدروں کوزندگی میں اتارنے کے عمل کوغلطی سے بچائیں۔اسی وجہ سے نفس ہمیشہ بیدار،مضطرب اورکوشش کرنے والوں کے ساتھ کوشاں ہوگااوران اصول کے دفاع کے لیے کمربستہ اورتیاری کی حالت میں رہے گااوردائما یہ شعور رہے گا کہ ان عملی وسائل ومیکانزم کی تجدید کی ضرورت ہے ۔جس سے اس کا وجود محفوظ رہے اوراسے بقاء ملتی رہے۔

☆ باہمی نصیحت اور نظر ثانی کی ضرورت: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے اور غلطی وکمی کے مقامات کی نشان دہی کے لیے اور حرکتِ حیات میں امت سے جو انحرافات سرزد ہوں ان کو جاننے کے لیے باہمی نصیحت اور نظر ثانی کی ضرورت ہے۔اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ مل کر کام کریں، کھلی گفتگو ہو اور برابر نشاندہی ہوتی رہے جس سے غلطی کی بنیادوں کی نفی ہوگی اور قدروں کو ان کی فعالیت اور دَین لوٹائے گا۔اور جب بھی باہمی نصیحت کا ماحول ختم ہوا ہم تہذیبی سطح پر بے کار ہوئے ۔جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (اس کی تخریج ترمذی نے سنن میں کی ہے 4/468 حدیث نمبر:2169 اور کہا کہ یہ حدیث حسن ہے اسی کے مثل مسند احمد میں بھی اس کی روایت کی گئی ہے :5/388 حدیث نمبر:23375 اور مسند کی روایت میں ہے: ورنہ اللہ تم دوسروں کو مسلط کر دے گا، پھر تم دعا کروگے مگر تمہاری دعا قبول نہیں کی جائے گی )۔

خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تمہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہنا ہے ورنہ عن قریب اللہ تعالی تمہارے اوپر اپنی طرف سے سزا بھیجے گا پھر تم دعا کروگے مگر تمہاری دعا قبول نہ ہوگی یہ معلوم ہے کہ اس طرز پر اپنے عمل کا جائزہ لینے رہنے سے امت حرکتِ حیات میں خلافت ارضی ،تزکیہ اور زمین کی ایمانی تعمیر کے مطابق متحرک وفعال رہے گی ،اس میں کمزوری ،فتور یا جمود وعلیحدگی پسندی نہیں آئے گی۔

**ثالثا:** اصولوں کو پروان چڑھانا: قدروں کو مسلمان کی زندگی میں اتارنے اور ان کی نگہ بانی سب سے زیادہ یوں ہوسکے گی کہ ان کو زندگی سے جوڑ کر ان میں نیا پن اور تخلیقیت لائی جائے۔یہ جانا جائے کہ موجودہ صورت حال کن نئی قدروں کی طالب ہے اور ہم ان کی تخلیق پر کتنے قادر ہیں اور مستقبل کی مصیبتوں کا جن اصولوں کے ذریعہ ہم سامنا کر سکتے ہیں ان کا استنباط کرنے پر اور ان کی انجام دہی کے لیے محنت کرنے پر ہم قادر ہیں کہ نہیں۔اسی چیز میں ہمیں دو باتوں کی ضرورت ہے۔

(الف) یہ کہنا اب چھوڑ دینا چاہیے کہ مغربی قدروں کو درامد کیا جائے ،ہمارے بعض مفکرین اور علماء جو یہ کہتے ہیں کہ مغربی جدیدیت میں بعض قدروں کا اضافہ کر لیا جائے تو وہ اسلامی جدیدیت بن جائے گی تو یہ کہنا درست نہیں ۔اصل میں ان لوگوں کو یہ وہم ہوگیا کہ مغربی جدیدیت ہمیشہ رہے گی

اور یہ کہ وہ نفع دینے والی والی ہے نقصان دہ نہیں۔اُس کو کمال ہے جس میں کوئی نقص نہیں''۔اسی طرح ہمیں اس چیز سے بھی رک جانا چاہیے کہ دوسروں کی قدریں اور نظریات تو اسلام میں اور ہماری قدروں میں بھی موجود ہیں، اتنا ہی نہیں بلکہ وہ تو اسلام میں پہلے سے ہیں دوسروں نے تو ان کو بعد میں اپنایا ہے، اور گویا کارزار زندگی میں وہی معیار ہیں، گویا کہ ہم اسی میں اپنی تصویر دیکھ سکتے ہیں!! مغربی جدیدیت کے انحراف کے بعد اب اس سب کو چھوڑ کر ہمارے مفکرین اور علماء پر یہ واجب ہے کہ وہ اسلام کے جامع تصور کے مطابق اپنا جدیدیت والا نمونہ سامنے لے کر آئیں، اور جوان مقاصد کے مطابق ہو جو کہ انسان کو ایک طرف اسکے خالق سے جوڑتے ہوں اور دوسری طرف انسان کو خود انسان سے جوڑیں۔یہیں سے پیداوار اور تخلیق کے بارے میں گفتگو ہونی چاہیے نہ کہ بس دوسروں سے لیتے رہنے اور تقلید کے بارے میں۔کیونکہ اگر کوئی ہمارا کوئی امتیاز نہ ہو تو کوئی ترقی بھی نہ ہوگی اور اسی طرح بغیر کسی خصوصیت کے تخلیقیت ممکن نہیں۔

**(ب)شعور وبصیرت:** شعور وبصیرت کے ساتھ امت بلکہ انسانیت کے مسائل سے دل چسپی لینا اور ایسی نئی قدریں بنانا جو ان مسائل کو اسلام کے نقطہ نظر کے مطابق اور اس کے مقاصد کے موافق حل کرسکیں۔بلکہ ہمیں ایسے اصول کا اعادہ کرنا چاہیے جن کو بھلا دیا گیا ہے مثال کے طور پر زہد اور ایثار کائناتی، سب پر رحم اور سب سے تعارف اور مستقبل کا اپنے آپ کو امین سمجھنا وغیرہ۔اور اس پر زور دینا چاہیے کہ قرآن وسنت یعنی وحی پر مبنی نظریاتی تصورات کی تشکیل کریں اور اسلامی نظام زندگی کو ہی نئے تصورات کی تشکیل میں اصل اور مرکز قرار دیں۔حالانکہ بہت سے لوگ ان کو حاشیہ پر پہنچانے کی کوشش کر چکے ہیں۔اسی مرکز کی طرف ہم رجوع کریں، کیونکہ وحی ایسے تصورات کا عظیم ذخیرہ ہے جو معیاری نمونے تشکیل دے سکتے ہیں اور ان کو اور نمونوں پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔وہ ایسا نظام فکر ہے جو اشیاء، وقائع اور مستقبل کے مطابق حکم لگانے میں کامل ہے، مثال کے طور پر آج کارگاہِ حیات میں پوری انسانیت کی سطح پر ہمیں درج ذیل اصول اور قدریں بنانی چاہییں: کائناتی

تسخیر، تکریم انسانی، زندہ کوشش، ذمہ دارانہ عمل، تزکیہ، حق نفس کا لحاظ، کامل اخلاق، کمال عقل، اور کمال عبادت، حقِ غیر کا پاس ولحاظ، عدل واحسان اور رحم اور مجاہدہ، علم نافع وعمل صالح، روزی کی تلاش، کائنات کی اشیاء کے ساتھ تعامل میں صحیح طرز عمل، یعنی ان کی حفاظت، ان سے استفادہ اور ان کی افزائش اور کائنات کی درستی اور ایثار، مستقبل کی امانت کا شعور، رشد، بغاوت وکمزوری کا انجام، تدبر وعبرت پذیری، تہذیبی آزمائش، تدافع اور ایام اللہ سے تذکیر وغیرہ۔ تو یہ اور ان جیسی دوسری قدریں، جن کی مزعومہ کائناتی قدروں میں کوئی نظیر نہیں، ان کو انسانیت کے بلند اور بڑے مقاصد قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان سے اس دنیا کو زندگی کو آگے بڑھانے میں رہنمائی لینی چاہیے۔ اور جن کو اگر روبہ عمل لایا گیا تو ایک طرف تو تہذیب پر طاری ساری آفتیں ختم ہوجائیں اور دوسری طرف دنیا میں زندگی کا سارا نقشہ ہی بدل کر رہ جائے۔ اور اس کا حال اچھا ہو اس کا مستقبل کامیاب ہو۔ اس سے ہمیں یہ تحریک بھی ملتی ہے کہ ہم وہ تہذیبی تصورات بنائیں جن کو مغربی تہذیب نہیں بنا سکتی۔ ان کو ہم اپنی اسلامی ثقافت سے ماخوذ صحیح دلائل سے تقویت دیں اور ان کو اپنی سطح پر رواج دیں، ان کو فعال بنا کر تخلیقیت سے مالا مال کریں، اور ان کے حوالہ سے انسانی زندگی کا محاکمہ کریں، ان سے مفید نتائج اخذ کریں اور زندگی کے عمل میں ان سے فائدہ حاصل کریں۔

**خاتمہ:** اب وقت آگیا ہے کہ ہم اسلام کے اصولوں اور قدروں کو دوبارہ ان کا اعتبار دیں، ان کو اپنی زندگیوں میں اتاریں، ان کی نگہ داشت کریں اور ان کو ترقی دیں اور یہ کہ ان قدروں کی روشنی میں ہم ایسا اسلامی ڈسکورس ڈھالیں جو معاصر انسان کے سوالوں کا جواب دے سکے اور تہذیبی تصورات کی تشکیل کے معرکہ میں ہم کارزار زندگی میں اپنے دین کے نقطہ نظر کے لحاظ سے داخل ہوں جس کا راستہ خلافت ارضی، تزکیہ اور کائنات اور اشیاءِ کائنات کے ساتھ تعامل میں صحیح طرز عمل سے ہوکر گزرتا ہے۔ اس کے بعد ہم ان قدروں کو اسلامی احکام میں بدل دیں جو انسانی زندگی کو گوَرن کریں، انفرادی ہو یا اجتماعی یہی وہ نئی اسلامی جدیدیت ہے جسے اسلام دنیا کے سامنے پیش

کرسکتا ہے۔ وہ جدیدیت جو وجود کو ترقی دے گی، جس کی غایت یہ ہوگی کہ وہ عبادت، عقل اور اخلاق کے پہلوؤں میں انسان کو اللہ سے اور تعارف وتراحم اور احسان میں دوسرے انسانوں سے جوڑے۔ جیسا کہ وہ انسان کو اشیاء کائنات سے تعامل میں استفادہ، افزائش اور امانت کا سبق دیں گی۔ کہ وہ کائنات اور اس کی اشیاء سے متصادم نہ ہوگا نہ اُس پر مسلط ہوگا بلکہ وہ اس کو اپنا مخاطب بنائے گا اس کے ساتھ مہربانی ورحمت سے پیش آئے گا اور اُس سے اپنے دل کی بات کہے گا!!

جب ایسا ہوجائے گا تبھی امت اپنا تہذیبی وجود منوا سکے گی۔ یوں نہیں کہ پہلے تو ہم اپنی قدروں کو یونہی چھوڑ دیں کہ زمان ومکان میں اجنبی بن کر رہ جائیں پھر ہم ان پر اشکال کھڑے کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اشکال اگر کچھ ہوسکتا ہے تو وہ مسلمان پر ہوسکتا ہے اس کی قدروں پر نہیں۔ جس کا حال اس قدیم عربی مثل جیسا ہوگیا ہے کہ ''جو کسی چیز سے بچنا چاہتا ہے وہ اس کی طرف التفات نہیں کرتا ہے، ادھر ادھر بھٹکتا رہتا ہے اور ہر طرف اُسکے سامنے رکاوٹیں دکھائی دیتی ہیں''!! اللہ تعالیٰ نے صحیح فرمایا: اے ایمان والو، اللہ اور رسول کی بات سنو اور مانو جب وہ تم کو زندگی بخش چیز کی طر ف بلائیں۔ اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ انسان اور اس کے دل کے بیچ میں حائل ہوجاتا ہے اور یہ کہ تم سب اُس کی طرف دوبارہ لائے جاؤ گے (انفال:24)۔

☆☆☆